کلیاتِ عزیز حامد مدنی
ظفر سعید سیفی

کُلّیاتِ عزیز حامد مدنی | ظفر سعید سیفی

کُلّیاتِ عزیز حامد مدنی

ترتیب

ظفر سعید سیفی

اکادمی بازیافت

پہلی اشاعت : نومبر ۲۰۱۳ء
کمپوزنگ : لیزر پلس، فون: 32751324
قیمت : ۱۵۰۰ روپے

Kulliyat-e-Aziz Hamid Madni
(Poetry)
Compiled by Zafar Saeed Saifi

کلیاتِ عزیز حامد مدنی آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب کی اشاعت میرے، بلکہ آرٹس کونسل کراچی کے ایک اور وعدے کی تکمیل ہے۔ ذاتی طور پر میرے لیے یہ ایک خواب کی تعبیر ہے۔ اس لیے کہ مدنی صاحب میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ان کے بیسیوں اشعار میرے حافظے میں تازہ ہیں۔ تاہم بات صرف میری ذاتی پسندیدگی کی بھی نہیں، اس عہد کے ممتاز اہلِ نظر کی رائے ہے کہ مدنی صاحب اس صدی کے اُن اہم ترین تخلیق کاروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جنھوں نے اپنے عہد اور اپنے معاشرے کی دھڑکتی ہوئی نبض پر ہاتھ رکھا اور اُس کے گہرے اور سچے احساسات کو زبان عطا کی۔ وہ بلاشبہ اُن معدودے چند فن کاروں میں تھے جنھیں اپنے عہد کا ضمیر کہا جاسکتا ہے۔ اُن کا کلام ایک طویل عرصے سے اُن کے قارئین اور محبتوں کرنے والوں کی رسائی میں نہ تھا۔ اس کلیات میں اُن کی تینوں کتابوں ''چشمِ نگراں''، ''دشتِ امکاں'' اور ''نخلِ گماں'' کے ساتھ آخری مجموعہ ''گلِ آدم'' بھی شامل ہے۔ یہ مجموعہ اپنے انتقال سے قبل انھوں نے مرتب کردیا تھا۔

آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی اس سے قبل قمر جمیل، رسا چغتائی، ابوالفضل صدیقی، خالد علیگ، انور شعور کے علاوہ کچھ اور ادبا و شعرا کی کتابیں بھی شائع کرچکی ہے۔ اشاعت کا یہ سفر جاری ہے اور مستقبل قریب میں ہم کچھ اور ایسے شاعروں اور ادیبوں کی کتابیں شائع کریں گے جو ہمارے شعروادب کی تاریخ کا اہم حوالہ ہیں لیکن اُن کی نگارشات بہت سے قارئین خصوصاً نئی نسل کے لوگوں کو دستیاب نہیں۔ آرٹس کونسل کراچی نے کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ شروع ہی اس خیال سے کیا تھا کہ اس عہد کا زندہ ادبی اثاثہ نئی نسلوں کو منتقل کیا جائے تاکہ روشنی کے سفر کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ اس لیے کہ ہم سمجھتے ہیں، ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کی ترویج اور ترقی کے لیے صرف تقاریب کا اہتمام ہی آرٹس کونسل کی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ اپنے زندہ ادبی اثاثے کو محفوظ کرنے اور نئی نسل تک پہنچانے میں بھی اسے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

کتابوں کی اشاعت ہی نہیں، میں نے اور میرے ساتھیوں نے تو ہر اُس کام کرنے کا بیڑا اٹھایا جو آرٹس کونسل کو ایک تہذیبی اور ثقافتی مرکز بنادے۔ اللہ رب العزت کا فضل و کرم ہے کہ اُس نے ہمیں ہر مرحلے پر سرخ رُو رکھا۔ ان کاموں کی انجام دہی میں آپ سب اراکین کی طرف سے حوصلہ افزائی اور تعاون نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح آپ کا تعاون ہمیں حاصل رہے گا۔

محمد احمد شاہ

صدر، پاکستان آرٹس کونسل، کراچی

ترتیب

اب ہم ہیں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو

گفتگو کی گُل افشانی اور جستجو کی جاں فشانی، اس سرائے فانی میں ایک آئینہ خانۂ تمنا کی حیثیت رکھتی ہے۔ تمہید تو مدنی چچا کے نئے مجموعۂ کلام ''گُلِ آدم'' کی تھی، مگر بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔ مرزا غالبؔ کے آفاقی کلام نے دو سلطنتوں کے عروج و زوال کی ایسی نقاشی کی ہے کہ وہ جاہ و جلال اور واہ وا سے ہوتا ہوا ہائے ہائے تک پہنچ گیا۔ ان کی آئینہ سازی و آئینہ داری اور آبِ گم کی آبیاری نے جو پھول کھلائے، اور سادگی و پرکاری نے گردشِ رنگِ چمن کے جو منظر دکھائے، ان کی خوشبو اور آبرو آج تیسری صدی تک آ پہنچی ہے۔ کیا کہا جائے کہ مرزا غالب اردو شاعری میں وہ برمودا ٹرائینگل (Bermuda Triangle) بن گئے ہیں کہ جو قریب گیا، غرقاب ہوگیا۔

مدنی چچا کے پہلے مجموعۂ کلام کا نام مرزا غالب کے ایک شعر کا مرہونِ منت ہے:

رخ کشودند و لبِ ہرزہ سرائیم بستند
دل ربودند و چشم نگرانم دادند

اُس مجموعے میں:

''دانشِ حاضر کے سواد میں''

کے عنوان کے تحت انھوں نے جو کچھ لکھا، وہ علی گڑھ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب مرحوم کو بہت پسند آیا۔ اور تبصرہ یوں کیا کہ:

''جب نثر اتنی خوب صورت لکھ سکتے ہو تو شاعری کی کیا ضرورت ہے۔'' اگر آج مرحوم حیات ہوتے اور مجموعۂ کلام کا مطالعہ کرتے تو وہ اپنے بیان پر نظرِ ثانی ضرور کرتے۔

پریدہ رنگ رُخوں سے شکستِ مینا تک
وہ آئنے ہیں کہ لرزاں غمِ بہار سے ہیں
(مدنی)

ہر مصنف، معمار اور مصور کی تحریر، تعمیر اور تصویر کے آئینے میں اس کے مطالعے، محنت اور مشاہدے کی جلوہ گری اور صناعی نمایاں ہوتی ہے۔

لکھنے کو تو نہ مضامین کی کمی ہے، نہ فرامین کا قحط۔ اس بازارِ زرگری میں روزانہ لاکھوں الفاظ کی کھپت ہوتی ہے۔ جن کا اتار چڑھاؤ، شہرِ نگاراں کے جادوگروں کے برتاؤ پر ہوتا ہے۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ لفظوں کے ہیر پھیر سے جیبیں بھرتی بھی ہیں اور دامن خالی بھی ہوتے ہیں۔

گفتگو کا عنوان تو آئینے سے متعلق ہے۔ اور مرزا غالبؔ کے اس شعر کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس میں ایک شہرِ آرزو کے ماتم کا ذکر ہے۔

ایسے ماتم تو نہ جانے کب سے آئینۂ خانۂ تمنا میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔

لیکن ایک جی جمائی تہذیب کے خدوخال اس طرح تبدیل ہونے لگیں کہ آئینے میں اپنی صورت ہی غیر کی شکل نظر آنے لگے تو پھر وہی کچھ ہوتا ہے جس کا ذکر یا ماتم مرزا غالبؔ اپنی ہر غزل اور قصائد میں کسی نہ کسی بہانے کرتے رہے۔

صاحب آئینہ بھی کیا شے ہیں۔ خود روشن نہیں لیکن روشنی کی کرن کا اس پر پڑنا ایک غضب ہو جاتا ہے، کہیں انعطاف، کہیں انعکاس، کہیں انحراف اور کہیں قوسِ قزح کے رنگ بکھر جاتے ہیں۔

جب خادمہ نے شہزادی سے کہا:

از قضا آئینۂ چینی شکست

شہزادی نے فی البدیہہ جواب دیا:

خوب شد اسباب خود بینی شکست

یہ زمانہ بھی اس تہذیب نے دیکھا تھا، جس کے نوحہ گر، مرزا غالب تھے۔ آئینہ ٹوٹے تو سو آئینے بن جاتے ہیں، لیکن دل کا ٹوٹنا شاعر کو کہنے پر مجبور کر دیتا ہے:

ٹوٹا ہوا دل جادۂ دریافت پہ رکھنا
بنیادِ تغیر مری جاں ہے کہ نہیں ہے
(مدنی)

اب تو دل کی رفوگری کے بھی سو طریقے نکل آئے ہیں۔

آج سے ہزاروں برس قبل ایک یونانی دانشور نے کیا خوب کہا تھا:

The same leters variously selected and combined signify Heaven, Earth, Sea, River and Sun. Most having some letters in common. But the different subjects are distinguished by the arrangements of letters to form the words. So likewise in the things themselves when the intervels, passages, connections, weights, impulses, collisions, movements, orders and the position of atoms interchange so also must the things format form the change.

ایک ہی قسم کے حروف آئینہ دار ہیں۔ جنت، سمندر، دریا اور سورج کے
جس میں کچھ حرف ایک ہی قسم کے ہیں۔
لیکن کچھ مضامین میں امتیاز کیا گیا ہے۔ حروف کی ترتیب سے جو
لفظ بناتے ہیں اور ایسی ہی ترتیب چیزوں میں بھی موجود ہے۔ جب
وقفے، ٹکڑے، تعلق، اوزان، تحریک، ٹکراؤ، حرکات، ترتیب اور
جوہروں کی جگہ تبدیل ہوتی ہے۔
اسی طرح چیزیں بھی تبدیل ہوتی ہیں۔
ذہن بھی بدل جاتے ہیں۔
انسان اور آدمیت کے معنی بدل جاتے ہیں۔
لہٰذا آئینے یہاں بھی ٹوٹتے ہیں۔

لکریشس (Lucretius) اپنے عہد کا نمائندہ شاعر تھا۔ اس زمانے میں بھی اس کے زرّیں خیالات زمان و مکاں کی قیود میں ہوتے ہوئے بھی روشنی کی رفتار سے ہم آہنگ ہونے کی سعی کر رہے تھے۔

جب فکر و خیال کی رفتار بڑھ جاتی ہے تو ذہن بہت دُور کی خبر لے آتا ہے۔ یہی لکریشس کے ساتھ ہوا۔ لکریشس نے آج سے صدیوں قبل ان بدلتے ہوئے رجحانات، ان تغیر پذیر اقدار اور تہذیب و ثقافت کے تنوع کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس کے خیالات خالص سائنسی تھے۔ اس کے سوچنے کا اندازہ جداگانہ تھا۔ وہ قدیم عہد کا سفیر ہوتے ہوئے بھی افق کے اُس پار دیکھ رہا تھا۔ جہاں سے تہذیب و تمدن نے اپنا لامتناہی سفر شروع کیا تھا۔ یہ سفر بذاتِ خود انسانی ارتقا، اس کے ذہنی نشوونما اور انسانی تہذیب و معاشرت کی تاریخ کے ایسے لاتعداد سنگِ میل سے منور ہے جسے انسانی شعور و وجدان نے منزل بہ منزل پروان چڑھایا۔

لکریشس کا عہد اس زمانے کی عکاسی کرتا ہے جب قدیم یونان کے دانشور علم وفن کے مخزن ہوا کرتے تھے۔ جن کے خیالات کائنات کا حسن تھے۔ اور جن کے عظیم نظریات افق تا افق سحر کا نور پھیلاتے تھے۔ جن کے لہجے کی گمبھیرتا، اور جن کی آواز کا آہنگ آج بھی ہمارے ذہنوں میں گونج رہا ہے کہ سچائی سب سے عظیم آفاقی عطیہ ہے جو ہمیں بخشا گیا ہے اور ضمیر کی آواز سب سے بڑی توانائی ہے جسے نفس کی قبر میں دفن کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

یہ وہی سچائی تھی جس کی خاطر سقراط نے زہر کے جام میں اپنی مسکراہٹیں گھول دیں اور عیسیٰ نے صلیب کو گلے سے لگا لیا۔

باور اک زہر کا جام ایک صلیب اور سہی
آج سقراط و مسیحا کا نصیب اور سہی

(''صلیبوں کی اوٹ میں سویرا''، عزیز حامد مدنی)

تقریباً انھی خیالات کا اظہار ایک چینی دانش ور لاؤتزو Laotzu نے بھی ان الفاظ میں کیا تھا، جس کا انگریزی میں ترجمہ Wittmar Bynner نے کیا:

Existence is beyond the power of words
To define:
Terms may be used
But are none of them absolute.
In the beginning of heaven and earth there were no words,
Words came out of womb of matter;
And whether a man dispassionately
Sees to the core of life
Or passionately
Sees the surface
The core and the surface
Are essentially the same,
Words making them seem different
Only to express appearance,
If name be needed, wonder names them both:
From wonder into wonder
Existence opens.

تہذیب و تمدن اور سائنس و ثقافت کا یہ طویل سفر ایسے ہی ناموں سے عبارت ہے جو انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے علم بردار اور شرافت اور سچائی کے مجسمے تھے۔ اس طویل سفر میں چند لمحے ایسے بھی آگئے جہاں انسان نے خون کے آنسو بہائے۔ جب روم جل رہا تھا، اور اس کا بادشاہ بانسری کی دھن میں مگن تھا۔ جب چند خودسر حکمرانوں نے چند مظلوم علم و ادب کے دانش وروں پر بھوکے شیر چھوڑ دیے۔ کتب خانوں کو آگ لگا دی گئی اور ہیروشیما، ناگاساکی پر جوہری بم نے سائنس کی ایک اہم ایجاد کا دہشت ناک منظر دکھایا۔

سرخ اور سیاہ صدیوں میں گھرے ہوئے انسان پر کیا کچھ بیت چکی ہے، اور کیا کچھ بیتنے والی ہے۔ اس لہو سے نہائی ہوئی زمین نے کتنے گلاب کھلائے اور کتنے چراغ بجھائے۔ مگر انسان کا کارواں اپنی راہ پر گامزن ہے اور کائنات کے ان انجانے ستاروں کی طرف دیکھ رہا ہے جن کی جھلملاہٹ اور جگمگاہٹ، اس کی طفل تسلیوں کا باعث بنی ہوئی

ہے۔ آج زندگی، مذہب اور سائنس ایک ایسا تثلیثی کلیہ بن گئے ہیں کہ ایک دوسرے کے بغیر مکمل ہوتا ہی نہیں ہے۔ عہدِ حاضر کے ایک عظیم دانشور Fraser نے اپنی کتاب The Golden Bough میں کیا خوب لکھا ہے کہ:

انسانی زندگی اپنے ارتقا کے لیے نرم و نازک دھاگوں کی ایک مضبوط ڈور بُنا کرتی ہے۔ ابتدا میں یہ ڈور سیاہ تھی۔ سیاہ ڈور تاریکی، طلسمی اور اساطیری عہد کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس کے بعد سرخ ڈور کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ ڈور، مذاہبِ عالم اور انسانی کش مکش کی غماز ہے۔ اس کے بعد سفید دودھیائی ڈور کا جوڑ لگا جو سائنسی عہد کی عکاسی کرتا ہے۔ ہم ابھی تک سفید ڈور کے دور میں جی رہے ہیں۔ یہ معلومات خبر اور ترسیل کے دائرے میں مابعد الطبیعیاتی زمانے کی خبر دے رہا ہے۔ ڈور کا بذاتِ خود مسلسل ہونا زندگی کی ایک اچھوتی داستان ہے جو ارتقا پسند بھی ہے اور زوال پذیر بھی۔

زندگی کی یہ داستان ایک ایسے آئینے کے سامنے ہے جہاں سے آسمان کی نیلگوں رعنائیاں نظر آتی ہیں اور ساتھ ہی تباہی کی ایک گہری خندق بھی۔

جوہری عہد نے جہاں انسان کو ادراک و آگہی کی آفاقی قدریں بخشی ہیں، وہیں اس نے راتوں کی نیندوں کو بھی حرام کردیا ہے۔ کیوں کہ ہر ذرّہ بذاتِ خود ایک سورج ہے اور اس زمین میں ہی کروڑوں سورج موجود ہیں۔ ان لاکھوں سورج کی توانائی اور حدت اگر تخریبی کاموں کی نذر ہوگئی تو راتوں کی نیند اچاٹ نہ ہوگی تو کیا ہوگا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح لکریشس کے قول کے مطابق جوہروں کی ترتیب سے چیزوں کی ماہیت میں فرق آجاتا ہے۔ کیونکر اس عہد میں صحیح ثابت ہوئے۔ کیا اس نے بھی جوہری جامِ جم کا کلیہ دریافت کرلیا تھا یا اس کی فکر کے دائرے آنے والی صدیوں کے آئینے میں تغیراتی علامات کے عکس کو دیکھ رہے تھے۔ کیوں کہ محسوس ہوتا ہے کہ:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اس صدی کی پہلی دہائی ختم ہوئی۔ مدنی چچا کی وصیت کے مطابق ان کے دو مجموعے لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ ایک ''گِلِ آدم'' جو کلّیات کا ایک حصہ ہے، دوسرا ''جدید فرانسیسی شاعری۔''

سائنس کا ایک ادنیٰ طالبِ علم ہونے کے ناتے نہ تو مدنی چچا کی شاعری پر تبصرہ کر سکتا ہوں، نہ تنقید۔ حالانکہ سائنس کی طرف طلبِ علم کی جستجو اور گفتگو کا مرکز مدنی چچا کی ذات تھی۔

میرے دادا صاحب مرحوم محمد حامد ساقی خود بھی شاعر اور صاحبِ کتاب تھے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی میں علامہ شبلی نعمانی کے شاگرد ہونے کے ناتے ادب، تاریخ اور شاعری سے شغف لازم تھا۔ مگر وہ خود مدنی چچا کو شعر و شاعری اور مشاعروں میں جانے سے منع کرتے۔ علی گڑھ خود ایک ایسا مرکز بنا کہ کوئی علیگ مشاعروں میں شرکت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں کیوں نہ ہو۔ مولانا محمد علی جوہر کے ساتھی ہونے کی بنا پر آخر عمر میں غیروں نے جو ستم ڈھائے، اس صدمے نے ان کے دل کی دھڑکن ہی بند کر دی۔

دادا صاحب کے منع کرنے کے باوجود مدنی چچا نے جم کے شاعری کی اور نہ صرف شاعری بلکہ تنقید، تبصرے اور تقاریر میں ان روایات کی پاس داری کی جو عہدِ جدید میں آئینے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تمثال دار فکر و فن غالب کے انداز کا تھا۔ مگر رنگ میرؔ کا بھی آ گیا۔ انھوں نے دردِ دل، میر دردؔ کے لہجے میں، کیفیتِ آتشؔ بجاں آتشؔ کے رنگ میں، اور عہد سازی اور جلوہ آرائی کا جشن علامہ اقبال کے ساتھ منایا۔ اور ان تمام رنگوں کی قوسِ قزح سے جو ایک سفید، روشن لکیر نمایاں ہوئی، وہ معلومات و انکشافات اور مرزا سوداؔ پر بیتی ہوئی کیفیت چشم کی یاد رکھتے ہوئے ایک تجلی بن کر نگاہوں کو خیرہ کر گئی، بلکہ ان کا اپنا رنگ بن گئی۔

''چشمِ نگراں'' کے لیے چشمِ بینا درکار ہے اور ''دشتِ امکاں'' کے لیے صحرا نوردی۔ مگر وہ کیفیت کہ:

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

''نخلِ گماں'' میں ابھر کر سامنے آ گئی۔ اس پر میں کہہ سکتا ہوں کہ مدنی چچا نے میرے والدِ مرحوم کی جگہ ایک روشن چراغ کی مانند طوفانوں کی زد میں ہوتے ہوئے ہمیں روشنی فراہم کی۔ وہ ایک ایسا سائبان تھے جو وقت کی شدید تمازت اور دھوپ خود برداشت کرتے رہے اور سایہ ہمیں فراہم کیا۔ کربِ آگہی کے جاں گسل لمحات ایک ایسے شخص کے لیے خود قربِ مرگ بن جاتے ہیں، جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ ان مصیبتوں اور تکالیف کو جھیل رہا ہے جو اس کا مقدر نہیں تھیں، لیکن ہنستے ہوئے ایک خندۂ زیرِ لب کے ساتھ ان کا سامنا کرنا اور ایک ایسے معاشرے میں اپنے آپ کو یوں رکھنا کہ:

درد کو چاہا کہ نہ چمکے تو چمکتا یوں ہے
اک چراغِ تہِ داماں جو بجھائے نہ بنے

جو جی سے گزر کر سحر کرنا اور شبِ غم کو مختصر کرنا جانتے ہیں، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مرنے کے بعد کیسے جیا جاتا ہے۔ وہ شخص جسے نہ محرومی کا گلہ تھا، نہ مجبوری کا شکوہ۔

اس کھنکھناتی ہوئی مٹی کی قسمت اور قیمت کا راز اور قامت سے قیامت تک کی پرواز ان کے نئے مجموعۂ کلام ''گِلِ آدم'' میں نہاں بھی ہے اور عیاں بھی۔

دوش دیدم کہ ملائک درِ میخانہ زدند
گِلِ آدم بہ سرشتند و بہ پیمانہ زدند

ڈاکٹر ظفر سعید سیفی
سابق وائس چانسلر، کراچی یونی ورسٹی

اظہارِ سپاس

تمام نعمتوں کا شکر اس ربِ ذوالجلال کے لیے ہے جس نے تعلیم اور زبان کو وسیلۂ اظہار بنایا اور سرکارِ عالی مرتبت، رسولِ اکرم ﷺ کے ذریعے انسانیت کا درس دیا۔

اللہ تعالیٰ کے بندوں کا شکریہ ادا کرنا بھی اس ذاتِ بابرکت کا سپاس گزار بناتا ہے، سپاس گزار ہوں ان تمام صاحبان فضل وکمال کا جنھوں نے اس کتاب کی تکمیل میں دامے درمے قدمے سخنے تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔

حبیب تنویر جو مدنی چچا کے اسکول کے ساتھی ہیں اور بھارت میں فنِ ڈراما نگاری اور تھیٹر میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، مدنی چچا کے اِس دور کے ساتھی ہیں جب دونوں جوانی کی حدود میں قدم رکھ رہے تھے۔ اس کے ساتھ علیم غزنوی جو اس وقت ٹورنٹو (کینیڈا) میں رہائش پذیر ہیں، مدنی چچا اُن کی یادوں میں زندہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ن م راشد، فیض احمد فیض، مجتبیٰ حسین، ممتاز حسین، الیاس عشقی، ابوسعید قریشی، ذوالفقار علی بخاری، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، آنند نرائن مُلّا، احمد ندیم قاسمی، ظفر اقبال، اطہر نفیس، شفیع عقیل، سلیم احمد، شمیم احمد، سحر انصاری، جاذب قریشی، آغا ناصر، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر جمیل الدین عالی، ڈاکٹر انور سدید، افتخار عارف، قریش پور، عبید اللہ بیگ، کشور ناہید، محمد سہیل عمر، ساغر نظامی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھ پوری، جگر مراد آبادی، نور الحسن جعفری، ادا جعفری، جمیل اختر، پروفیسر ڈاکٹر انیس

خورشید، ڈاکٹر آصف فرخی، جمیل اختر، ڈاکٹر فیاض وید، ساقی فاروقی، مجروح سلطان پوری، عنبریں حسیب عنبر، اجمل سراج، اظہر عباس ہاشمی (جنھوں نے مدنی چچا سے اظہارِ محبت کیا اور فیض صاحب کی ایک نادر تصویر ان کی کتاب ''آج بازار میں پا بجولاں چلو'' کے لیے نذر کی) اور زیلن کافی ہاؤس کے تمام دانش وران میں شامل ہیں۔ ممکن ہے ان میں کچھ نام ور شعرا اور ادیبوں کے نام نہ آسکیں، اس کے لیے معذرت خواہ ہوں کہ مدنی چچا کا حلقۂ احباب وسیع تھا اور ریڈیو پاکستان میں ان کا کمرہ ایک سہ پہرِ دانش وراں ہوا کرتا تھا۔

سپاس گزار ہوں جناب محمد احمد شاہ صاحب، صدر آرٹس کونسل آف پاکستان (کراچی) کا کہ کلیات کے شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ شاہد رسام کا شکریہ کہ ٹائٹل کے لیے ان کی کاوشوں کی بدولت مدنی چچا کا کُلّیات آراستہ ہوا اور آپ کے ہاتھوں تک پہنچا۔

اور آخر میں مبین مرزا صاحب کا شکریہ کہ اکادمی بازیافت کی بدولت ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں، اور جن کی شخصیت بذاتِ خود ایک ادارے کی حیثیت رکھتی ہے:

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں ہے

انھیں وقت بے وقت زحمت دیتا رہا اور وہ ہمیشہ مہربان رہے۔

بِنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ظفر سعید سیفی

پہلی اشاعت: مارچ ۱۹۶۲ء

فہرست

○○○

آزادی کا اُفق

انسانی زندگی کا خاموش المیہ ادب کی صورت میں وقت سے ایک داد لیتا رہتا ہے۔ اس کے مسخرے ایک دور سے دوسرے دور میں ایسی نادیدہ سواریوں میں بیٹھ کر نکل جاتے ہیں کہ کانوں میں آہٹ تک نہیں آتی۔ زندگی کی ہزاروں ضدیں، ذہن اور اس کا تخلیقی عمل، تہذیب اور اس کے نقش و نگار اپنی پیدائی کے لیے ہمیشہ ایک تازہ اسلوبِ بیان، ہمیشہ ایک تازہ فکری اُفق کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ اس لیے ادب کے ہزار شیوہ، ہزار رخی چہرے کی پہچان کسی ایک آدمی تک محدود نہیں ہوتی۔ ہر دور میں افراد کی پسند اور معاشرے کے تجربات کے مطابق ادب لکھا، پڑھا، بولا اور برتا جاتا ہے۔ دو چار بڑی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو یک ہی پرتو میں اس ہزار رخی چہرے کے صلح و پیکار کی ساری کیفیتیں سمیٹ لیتی ہیں۔ ہمارے ادب میں بھی اس کی اچھی مثالیں موجود ہیں۔ ایسی کتابوں کو آدمی اپنی تہذیب کا سرمایہ سمجھنے لگتا ہے، بعض دفعہ یہ کتابیں بیوقوفی میں ایک بوجھ کی حیثیت سے اٹھا لی جاتی ہیں۔ اس بوجھ کے اٹھانے والوں کا نقصان کم، کتابوں کا زیادہ ہوتا ہے، مگر جب یہ کتابیں خیال و فکر کے سفر میں ساتھ ہو جاتی ہیں تو آدمی کے لیے راہِ فرار بند ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ وہ زندگی کا مہلک ترین لمحہ ہوتا ہے، جب آدمی ایسی

کتابوں کو اپنی تہذیب کا سرمایہ کہنے لگتا ہے۔ اس نقد کا سود، خود اسے اپنی گرہ سے دینا پڑتا ہے۔ خسرو، غالب، اقبال، جوش — ان ناموں کی وراثت کو زندگی کے بے شمار دکھوں میں ایک خلعتِ بے بدل سمجھنا، اپنے آپ کو سخت آزمائش میں مبتلا کر لینا ہے۔ طالب علموں کے گروہ تازہ دمی کے دور میں نادانستہ اس تمثیل کے کردار بن جاتے ہیں۔ اور آخرِ کار ایک بے رنگ محرّری ان کی تقدیر بن جاتی ہے۔ ادب کا دورِ جدید ہو یا فصلِ قدیم ہو، ایسے کرداروں کا ایک میلہ لگا ہوا ہے۔ اور یہ میلہ ہے بھی دیدنی! ہمارے دور میں اظہار و ابلاغ، نشر و اشاعت، پبلسٹی اور پبلشنگ کے ذرائع اور ان کی سہولتیں بہت ہیں۔ کروڑوں الفاظ کی روزانہ کھپت ہوتی ہے۔ مزدوری خواہ کسی پیمانے کی ہو، کچھ نہ کچھ مل جاتی ہے۔ ایسے وقت میں ادب کوئی بہت کام کی چیز نہیں ہوتا، اس کے تفریحی مقاصد سے الگ جستجو کے وہ عناصر جو اس میں شامل ہوتے ہیں، اسے اس میلے سے الگ کر دیتے ہیں۔ اسی لیے ادب کے عام قاری کو چھوٹے بڑے پیمانے پر ایک اپنی لذتِ کام و دہن پیدا کرنی پڑتی ہے۔ سوچیے تو اسی لذتِ کام و دہن کے عدم و وجود پر جدید و قدیم کی حدیں قائم ہو جاتی ہیں۔ حریفین کی مجروح سپاہ، اندھیرے میں شب خون کی تیاریاں کرتی ہے۔ جدید ادب نے مشرقی روایات کے خلاف کمندِ سارق پھینک کر روایات کو لوٹا نہیں ہے۔ وہ اُن کو مجرم کہتا ہے جو تازہ ہوا کے خلاف ہیں۔ نافہمی جہالت کا الٹا پیرہن ہے۔ اس تازہ ہوا کے خلاف سن یات سن، زاغلول پاشا گوکھلے، سرسیّد — یہ لوگ نہیں تھے۔ علیل زندگی اپنے حجرے کا ایک روزن بھی کھلا چھوڑنا برداشت نہیں کر سکتی۔ ہوسکتا ہے کہ ذہنیت کا یہ حبس محکومی کی فضا سے پیدا ہوا ہو مگر ادب کا کوئی دور جو فکر کے نئے موڑ کا مظہر ہے، سرتابی کی صدا سے خالی نہیں ہے۔ غالب کی شخصیت ہی میں ایسے عناصر موجود تھے جو رسم و رواج کے بند بقچے میں نہیں آ سکتے تھے۔ اقبال کی آواز کتنی کھلی ہوئی آواز ہے۔ دورِ جدید نے سرتابی کی تو کیا برا کیا۔ اس کی یہ سرکشی بھی کارآمد نہ ہوئی، تو اس نے زندگی کی قدروں کو ازسرِنو پرکھنا شروع کیا۔ جدید تہذیب جسے میں بغیر سائنس اور ٹیکنولوجی کے سوچ ہی نہیں سکتا، ایک نئے آدمی کا تصور پیش کرتی ہے۔ اس تہذیب نے نقد و نظر کی جو منزلیں طے کی

ہیں، وہ کسی تہذیب نے تاریخ میں اتنے کم عرصے میں اتنی تیز رفتار سے طے کی نہیں تھیں۔ رفتار، عمل، تلاش، توازن کے اس دور میں لکھنے والا ایک ایسے کاغذ پر لکھا رہا ہے جو شش جہت کی ہواؤں کی زد میں ہر نفس بیچ سے مڑ جاتا ہے۔ لکھنے کی اتنی تیز رفتار، سمجھ کی اتنی وسعتیں آدمی کہاں سے لائے۔ بہر کیف ہم لوگوں نے جب لکھنا شروع کیا تو فضا بزرگوں کے روایتی ماحول سے الگ تھی۔ مجھے یاد ہے، جب میں نے زبان کھولی تو ایک طرف مہیب تاریکیوں کا دور تھا۔ دوسری طرف منتظر روشنی کے آثار ہویدا ہو رہے تھے۔ ایک طرف خندقوں میں سڑتی ہوئی لاشیں تھیں۔ آدمی کا لہولہان پیکر تھا۔ ساری انسانی فکر اک گہن میں تھی، دوسری طرف صدیوں کے مقفل زنداں کھل رہے تھے۔ چہروں کی گرد وقت کے آبِ تازہ سے دُھل رہی تھی۔ نوزائیدہ آزادی کی کوششِ گفتار نے دلوں کو جگا دیا تھا۔ وہ دور، ہزار ضدوں کا ایک افسانہ ہے، دو ضدوں کی ایک بے قرار روح پیدا و پنہاں، فضائے عالم پر محیط تھی۔ وہ دو رنگ جو نیک و بد میں ہوتے ہیں، وہ دو جذبے جو اسیری و آزادی میں ہوتے ہیں، وہ دو طاقتیں جو دل و ماغ میں ہوتی ہیں، یک دگر ہوکر ایک ہی قالب میں سما رہی تھیں۔ ان کو اس اشتراک سے روکنا، نور کو نور، ظلمت کو ظلمت کہنا کتنا مشکل تھا۔ ان کو ایک ہی قالب سے الگ الگ سموچا توڑ لینا، ہاتھوں کی بہت بڑی طاقت چاہتا تھا۔ خیر، ہم لوگ، آپ اسے برصغیر کے نوعمر طلبہ کے گروہ کی ایک علامت سمجھیے، پہلی جنگِ عظیم کی مٹتی ہوئی یادوں سے دور، آزادی کی بڑھتی ہوئی رَو کے ساتھ، جہاں دوسری جنگِ عظیم کی ہول ناک تباہیوں کا حلقۂ ناز تھا، وارد ہوئے تھے۔ میٹرک کا سرٹیفکیٹ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آلاتِ حرب کی پیچیدہ ٹیکنیک کے زرِ کامل عیار کا سیونگ سرٹیفکیٹ ہو۔ اسکول کے کمرے میں ہٹلر، ابی سینا، انگریزی راج، گورے کالے مہرے، سیاست کی بساط — روز نیا ہنگامہ تھا۔ ریڈیو، اخبار، افواہیں ابھی دم نہ لینے پائی تھیں کہ دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی تھی۔ مغربی تہذیب جس نے وراثت میں یونان و رومی اثرات اور عیسوی اخلاق کو سمیٹ کر کچھ بنایا تھا، ردّی کاغذ کے ڈھیر کی طرح جل رہی تھی۔ ہماری نوجوانی کا دور اور اس برصغیر کی آزادی ایک ہی افق سے جڑواں طلوع ہوئے تھے۔ نئی نئی طبیعتیں، نئی نئی اذیتیں

تھی۔ اس وقت بھی جب محبت کا غرور بے کلف روشنی کی رو میں بوسۂ جبیں لیتا تھا، فردا کا نادیدہ افق ایک ہیبت ناک دُھویں کے اژدر سے دبا ہوا تھا، مگر نہ جوانی دیکھتی ہے کہ بیچ میں سانپ ہے اور نہ آزادی—

مانا کہ ہر دو کا انجام اچھا نہیں ہوا۔ مانا کہ ہر دور کے دورِ اوّل میں شگفتِ گل ہی سے بہار کا لہو ٹپک رہا تھا، مگر جی کی لگن گئی تو نہیں۔ ارتقا کے شعور کو ایک طرزِ خرام تو ملا۔ بہرکیف ذہنی فضا کی تعمیر فکرِ جدید کی خشت اندر خشت، پیچیدگیوں سے ہوتی رہی۔ بڑی بڑی آوازیں تھیں— سیاسی، ادبی، مغربی، ایشیائی جوانانِ تند گام کی، پیرانِ جہاں دیدہ کی۔ اس برصغیر کے ادب کو ٹیگور، اقبال، سرت چندر چٹرجی، پریم چند، حسرت موہانی، جوش، فراق ایک موڑ تک پہنچا چکے تھے۔ تازہ کلام شعرا کا ایک گروہ سامنے آچکا تھا۔ یہ گروہ، جدت طراز، معتبر ادب کی ساری روایات سے آگاہ تھا۔ انگریزی اخبار معیاری، صحافی پڑھے لکھے، روشن قیاس، ایک سماجی اور سیاسی بصیرت رکھنے والے تھے۔ فلسفی، سائنس دان، معلم سب کا ایک قابلِ احترام گروہ سامنے سامنے چل رہا تھا۔ جنگ سے دوچار سال پہلے غالباً ہٹلر کے ارادوں کا رُخ دیکھ کر— پیرس میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی— شاید یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہوگی۔ دریائے سین نے جس کے راج ہنس، بے منتِ ہوا بادبانوں کا سفینہ ہیں— شاید ایسی آشفتہ مُو، دل زدہ پرچھائیاں، کبھی نہ دیکھی ہوں گی— بزم تک آنے والوں میں رومن رولاں، گورکی، کچھ ایشیائی ادیب جن میں غالباً ایک جاپانی شاعر— ہندوستان کے مُلک راج آنند، کچھ انگریز ادیب، کچھ فرانسیسی صاحبان جمع ہوئے تھے۔ ان ادیبوں کے سامنے بہت اہم اور پیچیدہ مسائل تھے— امنِ عالم، آزادی، فسطائیت، فرد: معاشرہ، نئے تقاضے، نئی اُمیدیں۔ اس کانفرنس کی ایک رپورتاژ کسی انگریزی رسالے میں نظر سے گزری تھی۔ اسکول کی اناپ شناپ باتوں کے ساتھ یہ چیزیں بھی ہمارا موضوعِ سخن ہونے لگی تھیں— جو جی میں آئے، ان کے متعلق سوچا کرتے تھے۔ باہر کی فضا میں، سیاسی جلسوں اور ادبی محفلوں میں، خود گھر میں ہمارے ذہنی معیار سے نسبتاً اونچی باتیں ان دنوں ہوا کرتی تھیں۔ سنا تھا انھی دنوں ٹامس مان نے فسطائیت کے خلاف

کچھ لکھا تھا — ٹامس مان کی بات تو ہماری سمجھ میں خاک آتی مگر اس کی ایک اخباری تصویر ہمیں دکھائی گئی تھی۔ شریفانہ خدوخال تھے، سن رسیدہ آدمی کی تصویر تھی — باکسر کی توانائی تھی، نہ ہٹلر کا رعب تھا — کس قدر ملال کی بات ہے کہ پڑھے لکھے آدمیوں کی صورت ایسی شریفانہ ہوتی ہے اور یہ صورت بھی ایک دنیا کا ملال اوڑھے لپیٹے نکلتی ہے۔ انھی دنوں ہٹلر کی تصویر بھی روز اخباروں میں چھپا کرتی تھی — کارٹون بنانے والے اس کے چہرے کی ساخت میں نئے نئے زاویے نکال کر پیش کیا کرتے تھے — ایک تصویر دوسری تصویر کی ضد تھی۔ — ہم کچھ جانتے تھے تو یہ جانتے تھے کہ ٹامس مان وہ آدمی ہے جو ہٹلر کو اچھا نہیں سمجھتا۔ ہم لوگ بھی بہت سی باتوں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، مثلاً جو لڑکا کرکٹ کھیلتے ہوئے لیگ گارڈ پہنے ہوئے اپنے پاؤں کی اوٹ میں وکٹ چھپا لیتا تھا، وہ ہماری نظر سے گر جاتا تھا۔ اس وقت امنِ عالم شاخ سے گرنے والی پتّی کی طرح ایک نادیدہ دُھویں میں لرز رہا تھا، اسی زمانے میں لندن میں اس برصغیر کے چند طلبہ اپنے ادب کے جدید رجحانات کے مطابق کچھ سوچ رہے تھے — اور یہ اُسی عالمی فکر کی، ایک شاخ تھی جو مختلف الخیال مفکرین میں بٹ کر آدمی کے لیے سکون کا معیار تلاش کر رہی تھی۔ اسی ۱۹۳۵ء میں فرمانِ شاہی کے مطابق، ۱۹۳۵ء کا انڈیا ایکٹ نافذ ہوا تھا — جس کی رُو سے صوبائی خود مختاریاں حاصل ہوگئی تھیں — کبھی وزیروں کی موٹریں، کبھی مجلسِ استقبالیہ کے نہایت بدنما منتظمین، کبھی سیاسی نمائشوں میں اوتاروں کے نزول سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ دولتِ انگلشیہ کا غروب ہونے والا جاہ و جلال بغیر خون کی بھینٹ لیے ڈوب جائے گا۔ معاشرہ ایک نئے موڑ پر آ گیا تھا — پرانی کتابوں کا اسلوب نئی کتابوں سے نہیں ملتا تھا — ایک ہی در و دیوار میں رہتے ہوئے لوگ ایک دوسرے کی بات آسانی سے نہیں سمجھتے تھے — لڑکیاں گھروں سے باہر نکل پڑی تھیں — نہایت آہستہ روی سے ایک بند معاشرہ کھلی ہوا میں آ رہا تھا — بازار دوسرا تھا، بازار کی اشیا دوسری تھیں — موضوعِ گفتگو دوسرا تھا — کبھی کبھی پہاڑ کے دامن میں تیز خرام ندی کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ روایت اور تغیر میں چٹان اور موج کا فرق ہے — موج چٹان کو کاٹ کر بہتی رہتی ہے، برصغیر کا نیا ذہن کچھ روایات سے منحرف نہیں

تھا — مگر سرکش تھا۔ یہ سرکشی — سیاسی، ذہنی، تہذیبی اور اخلاقی تھی — صدیوں کی بے عمل زندگی نئے محرکات میں ایک آبرو پا رہی تھی — مگر اس نہایت سرد و خنک ماحول میں بھی — اتنا کام ہو چکا تھا کہ جب ہم نے آنکھیں کھولیں — تو ایشیا کی بیداری کا وقت تھا، اس برصغیر میں آزادی کی بڑھتی ہوئی رو کے ساتھ نئے لوگ یہ جانتے تھے کہ اس سواد میں تین ہزار سال کے نقش و رنگ ہیں — گوتم، صوفیائے چشت، اشوک، اکبر، تاج محل، وید، گیتا، کالی داس، خسرو، عرفی، نظیری، فیضی، غالب، ہندوؤں کا قدیم فلسفہ، مسلمانوں کی معاشرت کا تازہ رُخ۔ اس برصغیر کا شعور اپنی نیم غشی کی حالت سے نکل رہا تھا۔ صدیوں کی بے عمل زندگی نے ہمیں صنعت و حرفت سے محروم رکھا تھا — نئے علوم کی آگاہی کم تھی — سائنس اور ٹیکنولوجی میں ہمارے قدم سست رفتار تھے۔ ابتدا میں ریل کا مذاق ہم نے اڑایا تھا، مشینوں کو جن ہم نے کہا تھا۔ معاشرے کے نئے نامیاتی اور سیاسی اصولوں کے خلاف ضد ہم نے کی تھی۔ عوام جو ہر نئی چیز کو ایک اپنی اندر چھپی ہوئی سمجھ سے کام لے کر زمانے کے تغیرات کے مطابق سمجھتے ہیں، ان کی راہ میں سدِ باب ہم ہوئے تھے۔ بہرکیف اس بدلے ہوئے ماحول میں جب ہم لوگ آئے تو پہننے کو کپڑے تھے، رہنے کو گھر میسر تھے، بورژوائی مزاج کی تمام آسائشیں اور تکلفات موجود تھے۔ کھلی ہوا میں آتے ہی معلوم ہوا کہ مشرقی تہذیب، کولھو کے بیل کی طرح، ناسمجھ گردشوں میں مبتلا ہے۔ باہر جنگِ آزادی جاری تھی، گھر سے دور جنگِ عظیم کی زہریلی ہوا آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ اس کج مج گرگ و میش فضا میں ایک دن ہم آزاد ہوگئے۔ زمانۂ حاضر کی نصف صدی تک ہماری فکر کی واحد منزل آزادی تھی۔ اس کا واحد راستہ سیاسی تھا۔ اس کا مرکزِ ثقل سیاست تھی۔ غیروں کے فکری دباؤ نے ہماری تہذیب کو شدید نقصان پہنچایا تھا مگر یہاں سوال یہ ہے کہ ہماری تہذیبی روایات کیا تھیں، آریوں کے عہد میں جس میں یونانی اور رومی غیر مربوط ٹکڑے آکر مل جاتے ہیں — ایک ہندوستان کی آریائی قدیم تہذیب تھی، رگ وید، گیتا، مہا بھارت، رامائن کی تہذیب، برہمن کے حرفِ آگہی کی تہذیب، یہ ہندی جغرافیہ میں آریاؤں کی نئی اور پرانی بستیوں میں اُجاگر ہوئی تھی۔ اس معاشرے میں اوّل اوّل بڑی

آزادی تھی مگر جب یہ مملکت اور حد بندیوں کی طرف بڑھ گیا تو اس کے قوانین، بت پرستی کی نرم فضا میں رہ کر بھی انسان پر سخت ہوگئے۔ ہندی ذہن و ادراک طہارت و رفعت کی جو منزلیں طے کر چکا تھا، ان سے نسبتاً پستی کی طرف لوٹ گیا۔ اس وقت گوتم نے ایک بار پھر تاریکیوں میں شمع روشن کی — گوتم کی فکری زندگی اور تاثرات کے علاوہ اس کی تعلیم کا عظیم ترین عنصر، فکری آزادی بھی تھی۔ اس کا آزاد ذہن قدیم ہندو فلسفے کی روایات سے الگ ہٹ کر سوچ رہا تھا۔ بہرکیف، اس برصغیر کی تہذیب کا دورِ اوّل، راوی کے کنارے مرتب کیے ہوئے ''رگ وید'' سے گوتم تک، بھرت سے اشوک تک، ایک نہایت تاب ناک دور ہے۔ اس دور کے کم ضو عہد میں بھی بڑی ثباتی کیفیات تھیں۔ اس وقت کا ادب سنسکرت زبان میں ہے جو بدقسمتی سے عام آدمیوں تک صرف ترجموں کی صورت میں پہنچا ہے۔ مگر میگھ دوت اور شکنتلا مشرقی ادب میں درجہ رکھتی ہیں۔ اس برصغیر میں دسویں صدی عیسوی سے مسلمانوں نے آنا شروع کیا — عربی، افغانی، ایرانی، تورانی، ترک، مغل — ایک بت شکن گروہ جو بت کدے کا ہو کر رہ گیا — حملہ آوروں کا وطن بھی وہی تھا جو آریوں کا تھا۔ یہاں کی آب و ہوا نے ان کی مٹی کو، ایک نرم جان قالب میں سمونا شروع کیا — ان کا دور صوفیوں، درویشوں، دانش وروں، علم و حکمت کے ہزاروں فن کاروں کا دور ہے۔ آنے والوں کے پاس ایک دوسری وضع کا فنِ عمارت گری، ادب، علمِ جنگ اور قانون تھا۔ دو تہذیبوں کا عملِ اشتراک — وقت کا محتاج ہوتا ہے — مگر عہدِ غلاماں ہی میں خسرو کے کلام سے ہندوستان کی خاکِ زرفشاں چمکنے لگی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ فرماں رواؤں نے سلطنت کی مہر کو ایمان و آشتی کے محضر پر سفاکی سے ثبت کیا ہو۔ فرماں رواؤں کی نیت ہنگامی ہوتی ہے — مگر اسی دور میں ہندوستان میں ایک اتصالِ فکر کی مثال ملتی ہے۔ یہ ہندی، ایرانی، مغل تہذیب ہماری وراثت ہے — عہدِ غلاماں سے عہدِ مغول تک جو ادب و روایاتِ رزم و بزم — لباس، فکری اور روحانی زندگی نظر آتی ہے، وہی کچھ ہمارا سرمایہ ہے۔ ایک لکھنے والے کے تسلسلِ فکر میں آریوں کی پرانی درس گاہیں — صوفیوں کی روشن خانقاہیں، سب ہی آتی ہیں — مغل تہذیب کا آخری دور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ترازو

کا پاسنگ ہوکر رہ گیا تھا۔ مغلوں کے بعد انگریز آئے، لال کُرتی والے انگریز، تعزیراتِ ہند والے انگریز — کلائیو، وارن ہیسٹنگز، میکالے، صاحب، میم صاحب اور بابا لوگ، جن کو ہمارے رنگ سے نفرت تھی — جو ہمارے خزانے کی چوری کو ٹیکس کہتے تھے — جو کلرکوں کی تہذیب بنانے بیٹھے تو اُنھی کے علم نے اُن سے انتقام لیا۔ انھوں نے ہمیں بودا سمجھ کر پڑھانا لکھانا شروع کیا — علومِ صفاتی نصاب میں داخل کیے۔ ادب، تاریخ، فلسفہ اور اُن کی تفسیر و تشریح اپنے مطالب کے مطابق کی — مطلب یہ تھا کہ اُن کی قید میں رہ کر ہم اچھے آدمی بن جائیں۔ خدا اس اچھا آدمی بنانے کی نیکی کو دلوں سے غارت کردے۔ اُن کی تہذیب نے ہمیں تین چیزیں دی تھیں — علومِ صفاتی اور اُن کی انسان دوست چھاؤں، ایک مشاورتی نظامِ سیاست، اور کھلا ہوا معاشرہ جہاں عورت اپنی ذاتی اور انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ بہرکیف، یہ دورِ فرنگ بھی ختم ہوگیا ہے۔ آریائی تہذیب سے لے کر دورِ فرنگ تک، مشترک درد بٹ گئے ہیں۔ ہم جس دور میں ہیں، وہ بہت سے نئے تجربات کی بنا پر معاشرے کی ازسرِ نو تنظیم میں منہمک ہے، جو کچھ ہمیں لکھنا تھا، وہ اپنے معاشرے کے متعلق تھا، جو کچھ اب لکھنا ہے، وہ بھی معاشرے کے مطابق ہی ہوگا۔ ہماری تہذیب کو زمانے کے متعلقات سے پیوستہ ہونا پڑے گا۔ بہت سے نئے اثرات ذہن کی فضا میں گھر بنا چکے ہیں۔ بہت سے ابھی قبولیت کی منزل سے گزر رہے ہیں۔ ساری دنیا میں بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ ان تبدیلیوں کی رو میں ایک نیا ذہن بھی پیدا ہوا ہے۔ یہ نیا ذہن کیا چاہتا ہے، کس راستے سے جا رہا ہے، اس کے رد و قبول کی صلاحیتیں کیا ہیں — یہ ساری چیزیں سمجھنے کی ہیں اور انھیں سمجھے بغیر لکھنے کی دشواریاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ شعر و ادب میں جو لوگ آتے ہیں، وہ زندگی کے متعلقات کو ڈھونڈتے ہوئے نکل آتے ہیں۔ یہ تلاش کبھی انتہائی ذاتی مسائل سے شروع ہوتی ہے، کبھی ایک تہذیبی غم خواری سے شروع ہوتی ہے — سامنے سامنے کی چیزوں کو چھوڑ کر، جب زندگی کی ساری ضدیں اپنا خراج، تحریر سے لینا چاہتی ہیں تو وہ مصنف کی سخت ترین آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ چند الفاظ، چند محاوروں، چند استعاروں کے ذریعے آدمی آگے بڑھتا ہے — وہ اس کی جستجو میں انکشاف کی پہلی

منزل ہوتی ہے۔ میرے لیے پہلی منزل یوں آئی تھی کہ میں شبلی کی کتاب ''شعر العجم'' پڑھ رہا تھا۔ اس کا ایک باب ہمارے نصاب میں تھا۔ پڑھانے والے نے کہا کہ یہ کتاب میرے استاد نے لکھی ہے۔ ان کی تحریر و تقریر میں کوئی فرق نہیں تھا۔ مجھے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ وہ یہیں کہیں موجود ہیں۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ کتاب لکھنے والے کا ایسا وجود ہوتا ہے جو ہمیشہ حاضر رہتا ہے۔ وہ تہذیب کے ایک مرکز سے چل کر ہمیشہ — نئے نئے لوگوں میں پہنچ سکتا ہے۔ مجھے تحریر کی یہ مسافری بہت پسند آئی۔ طالب علمی کا وہ زمانہ اب بھی یاد آتا ہے جب آدمی زندگی کو ایک فرصتِ تمام سمجھ کر بادلوں کا سفر دیکھا کرتا تھا۔ ہماری خطہ مون سون کے دوراہے پر تھا — ایسی کالی گھٹائیں اُٹھتی تھیں کہ ہڈیاں دُکھنے لگتی تھیں — دو سو میل دور، ایک تحقیق کے مطابق، امر کنٹک پر چھائی گھٹاؤں کو دیکھ کر کالی داس نے ''میگھ دوت'' لکھا تھا۔ لوگ کہتے تھے، یہ بادل وہی ہیں جو اُس کے پیامی تھے۔ یہ ساری باتیں — قدم کو کسی اور طرف کھینچ رہی تھیں۔ کل تحریر کی ابتدا تھی مگر آج اس کا دورِ اوّل دُور چلا گیا ہے۔ میں نے جب لکھنا شروع کیا تو ذاتی، نجی زندگی کے متعلقات بھی انسان کو فکر پر مجبور کرتے تھے۔ ایک سرکشی کی رو تھی، ایک تہذیبی غم خواری تھی جو دوسروں کی غلامی کے احساس سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ ان چند نظموں کو — جو میرے نئے سامانِ سفر کی حیثیت رکھتی ہیں، راہ میں اُتار کر — میں ان کے اور قارئین کے درمیان نہیں رہنا چاہتا ہوں۔ ان کی خامیاں بھی پڑھنے والے کے سپرد ہیں، ان کی اصل بھی، ان کی شائستگی بھی۔ میں خود جب انھیں دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی ذہنی تعلیم و تربیت کے وہ باب ملتے ہیں جو میرے لیے ضروری تھے۔ اس کتاب میں ایک رہ نورد کی جستجو ہے۔ نوجوانی کے دورِ طالب علمی کی ساعتیں، ہوا کے تعاقب کا دور ہوتا ہے — ریل کی پٹریوں، وحشت اثر ٹرک کی قطاروں، فیکٹری کے دُھویں، اسپتال — کوڑھی خانوں کا سواد کاٹ کر، اس ہوا کے تعاقب میں اسکول سے یونی ورسٹی کے دروازے تک پہنچے تھے۔ زندگی ادب کے پاؤں سے یہاں تک پہنچی تھی۔ نیا سبق شروع ہوا، کتابیں کھلیں — دانش مند معلموں نے — آتشیں حلقوں سے خنک دائروں سے کبھی خود رہبری کی، کبھی ہم کو اکیلے گزرنے دیا — بتایا

کہ حرف زندہ ہوتا ہے، مگر موجِ نفس کی تازگی چاہتا ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ منطق و فلسفے کا دائرہ ہے، اس میں ارسطو، بوعلی سینا، چانکیہ، ہیگل، کانٹ ہیں۔ مجالِ خرام بھی ہو تو راہ گزر کو پامال سمجھ کر نہ چلنا۔ یہ شعر و ادب کا دائرہ ہے— یہ سہراب کی بے کفن لاش پر اُس کی ماں نوحہ کناں ہے— یہ پرنس ہیملٹ کی خود کلامی کی ساعتیں ہیں— یہاں میکبتھ کی شمشیر بے نیام ہو رہی ہے— یہ تمثال دار آئینہ— غالبؔ کی غزل ہے— کسی نے کہا، یہ ایجاد و انکشاف کا دائرہ ہے— یہ ارشمیدش ہے، یہ خوارزمی ہے، یہ گیلیلیو ہے، یہ برونو ہے، یہ کوپرنیکس ہے، یہ آئزک نیوٹن ہے اور یہ آئن اسٹائن ہے— آخر ایک دن دیوارِ دبستاں کو الوادعی بوسہ دیا— باہر نکلے تو وہی ریل کی پٹریوں کا جال، اسٹاک ایکسچنج، ایئرپورٹ ٹارمیک، طیاروں کی آمدورفت، نیم رُخ چہرے— نصف ضروریات کے گہن میں، نصف زندگی کی لگن میں، دلال، انشورنس ایجنٹ، غذا کی کمی، خوب صورت کپڑے، نحیف بدن تھے— آغازِ سفر میں شہر ایک سیر تھا، انجامِ سفر میں ٹریفک سگنل کی آنکھ محتاج ہوگئی۔ معلوم ہوا ہے کہ ادب کے جدید رجحانات کا برگ و ساز، یہ چیزیں ہیں، یہ زندگی کی علامتیں ہیں۔ نہ یہ منظر ہیں، نہ پس منظر ہیں، یہ رفتار آشنا قیام پذیر— ساعتوں کی ریل پر— بولنے والی تصویریں ہیں جو شعور و ادراک ادب میں منتقل کرتا رہتا ہے۔ میری نظموں میں بڑے شہر کی زندگی ہے۔ اس کا تضاد ہے، اس کی بے روح و سفاک، تند و تیز میلانات کی علامتیں ہیں۔ یہ اندازِ تحریر اُس وقت شروع ہوا تھا جب میں پندرہ سولہ سال کا تھا۔ اس سفر میں، گلے کی ساخت جدید زندگی کی مجروح آواز کو اپنا سمجھ کر، آپ کی سماعت تک پہنچا رہی ہے— ابتدا ہی سے مجھے اس کا شدت سے احساس تھا کہ جدید معاشرے کا محاورہ بدلا ہوا ہوگا۔ اس کی ثقافتی، تہذیبی زندگی ایک مختلف نہج کی ہے۔ اس میں آپریشن تھیٹر ہیں، اس میں پیٹرول پمپ کے بے خواب اسٹیشن ہیں، ریلوے ورک شاپ ہے، درس گاہوں کے اندھیرے ہیں، ستونوں کی کڑی بانہوں میں آدمی پچک گیا ہے۔ یہ ماحول کیونکر روایاتِ ادب سے ملحق ہوسکتا ہے۔ اس کی کڑیاں ڈھونڈنی پڑیں۔ وہ نئے امیج، استعارے، علامتیں جن کے ذریعے تجربات کو محسوسات میں منتقل کرنا تھا— ایک پرانا رشتہ

چاہتی تھیں۔ ان کے علائق اور ان کی محرمانہ باتیں بھی اور ہوں گی مگر میں نے سعی کی ہے کہ ان کو اپنے ادب کے بہاؤ کا ایک جُز بنا کر لکھ سکوں — ۴۲ سے ۴۸ کی نظمیں اس وقت کے احساس و فکر کی یادیں ہیں جب ذہن کچی مٹی کی ٹکیہ کی طرح پرت پر پرت رکھ کر آس پاس کی فضا کو قید کر لیتا تھا۔ دوستوں کی ملاقاتیں، بے پروائی اور بے نیازی کے ہنگامے ہیں، تہذیبی سرکشی ہے، دینِ بزرگاں سے اختلاف ہے، چمگادڑیں ہیں، مخلوق نگوں سار و دریدہ دامن ہے، اُدھڑی ہوئی کھالوں کے فرش پر ناسوروں کا ناچ ہے۔ میں اس وقت کچھ زیادہ لکھنا نہیں چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک مختلف اصنافِ سخن میں کوئی بیر نہیں ہوتا۔ میں ساری فکر کو ایک ہی بہاؤ کی صورت میں دیکھتا ہوں۔ وہ علامتیں جو جدید شعر میں آتی ہیں، یونانی بھی ہو سکتی ہیں، ہندی بھی ہو سکتی ہیں۔ میں ان کو اس جدید معاشرے کی ترجمانی کے لیے استعمال کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔ بہرکیف وہ سارے طریقے جو ادب کے کام آ سکتے ہیں، آدمی برتنے کی کوشش کرتا ہے۔ کتاب میں ہوتا کیا ہے، معاشرے کے دُکھوں کا، ذاتی وابستگیوں کا — ایک ادراک۔ اس زمانے میں پیدا ہونے والا ادیب، ایک عام شہری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، اس لیے میں ایک عوامی شعورِ سیاست کا قائل ہوں۔ سیاست نے اس منزل تک پہنچنے کے لیے کڑی منزلیں طے کی ہیں — غالباً یہ تاریخی شعور رائگاں نہیں جائے گا۔ شعر و ادب، تاریخ و فلسفہ کاوش و محنت کے علاوہ ایک اپنی ہی ساخت کا آدمی چاہتے ہیں۔ اس دنیا میں ایک خاص معیار کا تقاضا شرطِ اوّل ہے، اس لیے، میں خلوتیِ خاص کی محرمانہ گفتگو کا قائل ہوں — ادب کا آدمی — اپنے مزاج میں — ایک خاص آدمی ہوتا ہے، اس لیے اس آدمی کی ذاتی پسند — انفرادی — شرکتِ غیر سے دور — صاف ستھری ہوتی ہے۔ اس کا ذوقِ جمال — اس کی اخلاقی ذمے داریاں — دونوں اس کی ضروریات پر حاوی رہتی ہیں۔ اس کی فکری زندگی کشادہ و صاف ہوتی ہے۔ اس کے جنسی و شہوانی متعلقات افادیت سے ملحق نہیں ہوتے۔ تأثرات کی رو سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کی محبت و نفرت تہذیبی ہوتی ہے۔ وہ اعتدال جو مصنف میں رہ جاتا ہے، تصنیف کی جان ہو جاتا ہے۔ ۴۸ء سے پہلے کی فضا میری کتاب میں مجھے خود اجنبی معلوم

ہو رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ میری بینائی کا قصور ہو۔ بزرگ دانش مندوں نے ابتدا میں کہا تھا، تحریر— تصنیف کی غلط فہمی تک پہنچا دیتی ہے— کاش میں جنونِ تحریر اور قیدِ سخن وری سے دور— ایک بے نام پڑھنے والا رہ جاتا!

دل ربودند و دو چشمِ نگرانم دادند

عزیز حامد مدنی
کراچی. ۱۹۶۲ء

انتساب

ہزار درد خریدے ہیں میں نے دل کے لیے
ابھی یہ پردۂ جاں ہے کہ ایک پردۂ ساز
ہر اک اُفق سے پلٹتی ہوئی بکھرتی ہوئی
تجھے ہی ڈھونڈ رہی ہے ابھی مری آواز

تجھے خبر ہے مری لَے ہے ایک مدّت سے
ہجومِ کاہ میں مانندِ آتشِ چقماق
اسی خزاں میں جو موجِ نفس کے ساتھ گئی
ملیں گے — صوت و صدا کے ہزارہا اوراق

سکونِ ہجر میں بدلی ہوئی تھی آرزوئے وصال
کہ دشتِ شوق سے دامن تھا نارسیدہ بہت
تو ہی تو خلوتیِ دیر آشنا نکلی
رسومِ پردہ کشائی سے سرکشیدہ بہت

کوئی محل یہ تری برقع افگنی کا نہ تھا
تجھے خبر ہے مرا کارواں ہی راہ میں ہے
یہ نذرِ اوّل و آخر ہے اے عروسِ سخن
رگِ گلو کا لہو تیری بارگاہ میں ہے

(۱۹۵۹ء)

زندانی

تم کو دنیا نہیں دے گی غم و آلام کے جام
اک تبسّم سے سنبھالے ہوئے دنیا کا نظام
روک سکتی ہو جنوں خیز ہواؤں کا خرام
تم سمجھتی ہو کہ آسان ہے جینا اپنا
سیلِ دریا سے نہ گزرے گا سفینہ اپنا

یہ جو کاکل میں مہک ہے یہ جو آنکھوں میں ہے رنگ
تیز لَو دیتی ہوئی دل کی یہ دھڑکن یہ اُمنگ
سیکھ لے دیدہ و دانستہ نہ فریاد کا ڈھنگ
تم فقط پیار کی باتوں کو سمجھتی ہو ابھی
شمع کے نام سے راتوں کو سمجھتی ہو ابھی

ابھی اُمید کی شمعوں سے فروزاں ہے حیات
ابھی ٹھہری ہوئی اک موجِ چراغاں ہے حیات
ابھی مہتاب ہے، وادی ہے، خیاباں ہے حیات
پھول برسا کے گزرتی ہیں ہوائیں تم پر
مہرباں ہیں ابھی دنیا کی فضائیں تم پر

تم سمجھتی ہو کہ یہ نورِ شبستاں ہے بہت
نازِ ابرو ہے بہت، جنبشِ مژگاں ہے بہت
کوئی طوفاں ہو نظر میں تو یہ طوفاں ہے بہت
اک حسیں خواب میں دنیا کا جنوں گم ہے ابھی
تم ہو اور شام و سحر ایک تبسّم ہے ابھی

یہ نظر اب بھی جو اٹھتی ہے ستاروں کی طرف
رنگِ دنیا لیے گردوں کے نظاروں کی طرف
دُور ہو جائے گی گر تیرہ غباروں کی طرف
ان غباروں میں کئی بھوت نظر آئیں گے
دل کا در توڑ کے کم بخت یہ در آئیں گے

رہزنوں کا یہ بسیرا ہے جہاں ہم تم ہیں
ہر طرف ایک اندھیرا ہے جہاں ہم تم ہیں
اور بہت دُور سویرا ہے جہاں ہم تم ہیں
یہ تبسّم کی سِپر کام نہیں آسکتی
راہ پر گردشِ ایام نہیں آسکتی

کسی طوفاں کے اشاروں کی طرح بہتا ہے
زخم سے خون کے دھاروں کی طرح بہتا ہے
وقت لاوے کے شراروں کی طرح بہتا ہے
اور تم گیت کی طالب — مہ و انجم کی اسیر
اک سلگتی ہوئی دنیا میں تبسّم کی اسیر

بے کسوں نے تمھیں جھنجھلا کے پکارا ہی نہیں
موت کی وادیِ گریاں میں اُتارا ہی نہیں
تم کسی ڈوبتی کشتی کا سہارا ہی نہیں
خیر ہے فتنۂ ہنگام جزا سمجھو گی
تم غمِ عالمِ خوں ریز کو کیا سمجھو گی

ہوگیا وعدہ وفا ، بات ہوئی ، گھر جاؤ
سعیِ ہم رنگیِ جذبات ہوئی ، گھر جاؤ
جاؤ گھر جاؤ ، بہت رات ہوئی ، گھر جاؤ
اس اُفق پر ہی شبِ تار کو سر کرنا ہے
اس سحر ہی کو محبّت کی سحر کرنا ہے

(۱۹۴۲ء)

نئے نام

خواب آلودہ ، پُراسرار صنم خانوں میں
خاک اور خون میں غلطیدہ بیابانوں میں
آہ اے مادرِ گیتی ترے ایوانوں میں
حبس ہی حبس ، اندھیرا ہی اندھیرا ہے ابھی
اک جہاں سوز جہالت کا بسیرا ہے ابھی

علم و عرفاں کی غلط بینیِ پیہم کا نظام
ذرّے ذرّے پہ ہے افسونِ روایات کا دام
کس قدر خوار یہ ہنگامۂ عالم ہے تمام
ایک ذرّہ بھی زمیں کا نہیں بیدار ابھی
آہنی نیند میں ہے خاکِ پُراسرار ابھی

کتنے اوہام زبوں کے ہیں خداوند ابھی
اک اندھیرے میں ہیں تقلید کے فرزند ابھی
شب کے سینے میں ہے سورج کی کرن بند ابھی
ہوک سی اٹھتی ہے آدم کے سمن زاروں سے
تیرگی ہے کہ لپٹ جاتی ہے مہ پاروں سے

درد میں ڈوبی ہوئی خاکِ حزیں پر کب سے
خندہ زن داورِ محشر ہے زمیں پر کب سے
مُہر سجدوں کی ہے آدم کی جبیں پر کب سے
آؤ آدم کو ہر اک قید سے آزاد کریں
تازہ ہنگاموں سے اس خاک کو آباد کریں

آدمی صرف فرشتوں کا فسانہ نہ رہے
دیوتاؤں کے تبسّم کا نشانہ نہ رہے
اب روایاتِ کہن ہی کا زمانہ نہ رہے
تیرہ و تار خیالات کے آسیب نہ ہوں
حرم و دیر کرامات کے آسیب نہ ہوں

کب سے ہر ذرّۂ ساکن میں ہے جنبش کا جنوں
سنگ پاروں میں لرزتا ہے تغیّر کا فسوں
وقت کے دامنِ صد پارہ سے ٹپکا ہوا خوں
سینۂ خاک سے طوفان اٹھاتا ہے ابھی
ایک افسانۂ خوں ریز سناتا ہے ابھی

آدمیّت کو کُلاہوں کے اندھیروں نے ڈسا
امن و اصلاح کے پرچم کے سویروں نے ڈسا
سینۂ ارض کو چنگیز کے ڈیروں نے ڈسا
آؤ چنگیز کے تابوت پہ کیلیں جڑ دیں
سیل کی راہ میں آہن کی فصیلیں جڑ دیں

چشمِ آدم ہے کہ پیمانۂ پُرخوں کب سے
میر و سلطاں کے زمانوں کا ہے افسوں کب سے
خاک آلودہ ہے افسانۂ گردوں کب سے
آؤ افلاک کے تاروں کے نئے نام رکھیں
جنبشِ دل کو رقیبِ غمِ ایام رکھیں

(۱۹۴۳ء)

معذرت

نور و آہنگ کا افسانۂ بے تاب لیے
چشمکِ برق و شرر خندۂ مہتاب لیے
محفلِ لالہ رُخاں صبح کا سیلاب لیے
زندگانی کی شرر بار فضاؤں میں تو ہے
مےِ رفتارِ بتاں اب بھی ہواؤں میں تو ہے

جام و مینا میں ستاروں کی ضیائیں غلطاں
رہ گزاروں میں جوانی کی شفق شعلہ فشاں
بربط و ساز سے آہنگ کا سیلاب رواں
آج بھی وسعتِ افلاک پہ چھا جاتا ہے
ہر نفَس یاس کا احساس مٹا جاتا ہے

جامِ خیّام میں ڈوبی ہوئی ہر شام کہیں
صبح اک پرتوِ رخسارِ دل آرام کہیں
ہر نفس پردہ درِ عشقِ بد انجام کہیں
یہ گزرتے ہوئے کچھ سیم براں پاس سے دوست
خوں ٹپکتا ہی رہا دیدۂ احساس سے دوست

رہ گزاروں پہ یہ شاداب تبسّم کی کرن
آتشیں جس سے ہوئے تیرہ فضا کے دامن
موج در موج یہ اشکوں میں محبّت کا چلن
درد یہ سینۂ سوزاں سے چرانے والے
آہن و سنگ کو نیندوں سے جگانے والے

رنگِ گل خیمہ زن و رقص میں بے تاب طیور
مہر و مہتاب کا دہکے ہوئے جسموں میں یہ نور
بے ارادہ یہ کہیں تنگ قباؤں کا غرور
ہم جوارِ مہ و پرویں یہ گُل اندام کہیں
نیند کی گود میں کھوئے ہوئے اصنام کہیں

اوس میں ڈوبی ہوئی صبح پرندوں کی قطار
نغمہ پیرا ہے کبھی لوٹ کے تاروں کا دیار
ان کی پرواز سے خوابیدہ فضاؤں میں خمار
دل کو ہر نیند سے رہ رہ کے جگا دیتا ہے
آج بھی نبض کی رفتار بڑھا دیتا ہے

تابشِ جسم میں کچھ انجمِ شب تاب لیے
بجلیاں خون میں ساکت لیے بے تاب لیے
اک کفِ پا میں کئی رقص کے گرداب لیے
کوئی محفل میں ابھی رقص کناں ملتا ہے
ایک صیّادِ غمِ عمرِ رواں ملتا ہے

ابر کی چھاؤں میں یہ گرم و منوّر اجسام
آتشیں نرم تبسم کے بگولوں کا نظام
قصۂ خلد کو دُہراتے ہوئے لاکھ پیام
کتنے ہی قدموں سے منزل کی صدا آتی ہوئی
زندگی رقص میں ہر موڑ پہ لہراتی ہوئی

دل میں کچھ گرمیِ رخسارِ بتاں باقی ہے
ساز میں جنبشِ ہر نبضِ جواں باقی ہے
خاک کے ڈھیر میں جذبوں کا دھواں باقی ہے
خاک آلودہ سہی اپنی قبا چاک سہی
ہم جیے جائیں گے ، جینا غمِ ادراک سہی

(۱۹۴۳ء)

افکار

اس فضا میں مری محبوب محبّت کا یہ خواب
آتش و خوں کے اُمڈ آئے ہیں لاکھوں سیلاب

ابھی تخلیق کے پردوں میں ہے جنبش باقی
ابھی تنظیم کے ذرّوں میں ہے لرزش باقی
رہ گئی خاک میں شاید کوئی لغزش باقی
آج بھی مادرِ گیتی کو پیام آتے ہیں
آتش افکار جوانوں کا لہو تیز ہوا
کتنے جھلسے ہوئے خوابوں کے جنازے لے کر
بامِ گردوں سے رسولوں کے سلام آتے ہیں

کتنے خوابوں کی فضا ہے شکن آلود ابھی
کتنے اوہام کے اصنام ہیں معبود ابھی

کس قدر زیست کا پیغام ہے محدود ابھی
میتّیں کتنے ارادوں کی مجھے روز ملیں
روحِ سقراط کی سوگند ارسطو کی قسم
درس گاہوں کی فضاؤں میں اندھیرے وہ ملے
جن میں آزادیِ افکار کی کلیاں نہ کھلیں

درد خاموشیِ احباب سے رِستا ہے ابھی
خون امّید کا ہر خواب سے رِستا ہے ابھی
اک اندھیرا شبِ مہتاب سے رِستا ہے ابھی
آج افکار کے بت خانوں کے بجھتے ہیں چراغ
کچھ ضیا اپنے تبسّم کی عنایت کردے
فہم و ادراک کے بے جان دھندلکوں کی طرح
کہیں بے نور نہ رہ جائے یہ سینے کا بھی داغ

قید خانے بھی ہیں زندانیِ بے حال بھی ہیں
دستِ آدم میں ابھی موت کے کچھ جال بھی ہیں
روحِ انساں میں اندھیروں کے خط و خال بھی ہیں
رہ گزاروں پہ لٹیرے ہیں تجھے کیا معلوم
میری بے خواب نگاہوں کا فسانہ تو نہ پوچھ

میں نے ہر صبح کے سورج سے شکایت کی ہے
کتنے سنسان سویرے ہیں تجھے کیا معلوم

اک دھواں ہے کہ حریفِ مہ و انجم ہے ابھی
کارواں پیچ و خمِ راہ میں خود گم ہے ابھی
کس قدر تند ہواؤں کا تلاطم ہے ابھی
کتنی صدیوں سے زمیں شعلہ فشاں ہے اب تک
تو مری جان ضیا پاش ستاروں کو نہ دیکھ
اسی مرّیخ نے آدم سے وہ سازش کی ہے
جو سنانوں کی چمک سے بھی عیاں ہے اب تک

یہ ہجومِ گل و لالہ ، یہ تبسّم یہ جبیں
یہ جو بکھری ہوئی کرنیں ہیں خیاباں کے قریں
یہ روش جن پہ ابھی ثبت ہیں وعدوں کے نگیں
کل نہ ہو جائے یہ ٹوٹے ہوئے تاروں کی زمیں
زندگی کیا ہے ، فنا کیا ہے ، مشیّت کیا ہے
میں ابھی سوچ رہا ہوں کہ محبّت کیا ہے

(علی گڑھ، ۱۹۴۴ء)

تصویریں

میں نے سوچا ہے کہ خورشید کا ماتم نہ کروں
شب کی آغوش میں مے خانے ہیں، سیّارے ہیں
جن کا پرتو مری بے خواب نگاہوں میں رہا
ابھی افلاک کی محراب میں وہ تارے ہیں
جو خلاؤں میں لٹاتے رہے کرنوں کی ضیا
آتشیں ہو کے شفق روز پگھل جاتی ہے
روز نظّاروں کی اک لاش سی جل جاتی ہے

دُور کرنوں سے لپٹتا ہوا پُرپیچ دُھواں
رقص کرتا ہے دُھندلکوں کے سہارے اب بھی
میں نے جلتے ہوئے سورج کا محل دیکھا ہے

سرخ ہوجاتے ہیں گردُوں کے کنارے اب بھی
ناگزشتہ ہی رہا شام کا غم ناک سکوت
کس کی غم خوار نگاہوں سے اٹھا یہ تابوت

روز اٹھتی ہے فضاؤں میں اُجالے کی فصیل
گرتی جاتی ہے ، کھنڈر ہوتی چلی جاتی ہے
موت تاریخ کے گرتے ہوئے ایوانوں میں
ابنِ آدم کا لہو چاٹ کے گھبراتی ہے
چھوڑ دوں دامنِ خورشید کو نظروں سے یہیں
شب کے خاموش اندھیرے بھی تو بے نور نہیں

رنگ لوں آج نگاہوں کے تحیّر کا خلا
آتشیں لب سے دہکتے ہوئے رخساروں سے
چاندنی رات کے خاموش سمن زاروں سے
صبح کا نور جہاں رقص کیا کرتا ہے
دُور اِن دھند میں لپٹے ہوئے کہساروں سے
اجنبی دخترِ دہقاں کی نگاہوں سے کبھی
کارواں سو گئے جن پر انھیں راہوں سے کبھی

کچھ پرندوں کی جھجکتی ہوئی پروازوں سے
کھیلتی ہیں جو سرِ شام مرے رازوں سے
جو بُنا کرتی ہیں ہر لحظہ نئے گیت کے جال
ان پسِ پردہ لرزتی ہوئی آوازوں سے
لب و رخسار کے کھوئے ہوئے افسانوں سے
نیم خوابیدہ نگاہوں کے شبستانوں سے

نکہتِ زلفِ پریشاں کی کم آمیزی سے
عشق اور حسن کے ہنگامِ جنوں خیزی سے
دل کی اک لَو سے جو وابستہ رہی ہے برسوں
ایک بے باک تبسّم کی شرر ریزی سے

کتنے جلوے ابھی مجروح و پریشاں ہیں یہاں
رہ گزاروں کا سلگتا ہوا دامن ہے ابھی
آدمی اپنی ہی امّید کا رہ زن ہے ابھی
ذہنِ انساں کہ جسے تابشِ خورشید ملی
تیرہ و تار روایات کا مسکن ہے ابھی
رزم گاہوں سے اُمڈتے ہوئے سیلاب بھی ہیں
بستیاں جلتی ہوئی خون کے گرداب بھی ہیں

کتنے بے نام جنازے ہیں ابھی راہوں پر
کتنے ناسور ہیں تہذیب کی ان بانہوں پر
آج تیور ہیں مگر تیرہ فضا کے کچھ اور
ایک پرتو سا لرزتا ہے سکوں گاہوں پر

وقت اس دشت میں ہے زمزمۂ بانگِ رحیل
جنبشِ دستِ تغیّر سے نہ منزل ہے نہ میل
یہ اندھیرا ہے اسیرِ غمِ خورشید تو کیا
کسی آنسو کسی اُمید کا ماتم نہ کروں
میں نے سوچا ہے کہ خورشید کا ماتم نہ کروں

(۱۹۴۴ء)

سرگوشی

اُفق کی ڈوبتی خونیں کفن فضاؤں میں
نگاہ سوز شراروں کا ایک مبہم رقص
فسردہ شمعوں کو آواز دے کے تیز ہوا
نکل ہی آئے ہیں زنداں سے چند زندانی
ہزار یادوں کو ہے فرصتِ پرافشانی
وہ در کہ جن کی نگہباں تھی دل کی ویرانی
بڑھا کے ہاتھ ، خموشی نے آج کھول دیے
طلسم گاہ کے پردوں کو چاک کرتا ہوا
ہر ایک لمحۂ رُوپوش شعلہ ریز ہوا

فضائے خواب کے بے نقش و رنگ سایوں میں
سنا رہی ہے کوئی داستانِ پارینہ

فرازِ چرخ سے زہرہ گداز خاموشی
بنے گی تا بہ سحر ، نیند کا یہ رات کفن
اُچھالے جائیں گے ہنگامہ ہائے دار و رسن
نگاہ و فکر کے یوں تو نہ چھٹ سکیں گے گہن
نڈھال ، زرد ، حزیں ڈھیر موم پاروں کا
تری فسردہ و ویران خواب گاہ میں بھی
کبھی نہ تجھ سے ہوا دوست محوِ سرگوشی

سکوتِ شب میں فضا جب بھی سانس لیتی ہے
صدائیں آتی ہیں پامال رہ گزاروں سے
ہر ایک ذرّۂ خاکی ہے کب سے محوِ خرام
فغان و اشک کی راہوں کے درمیاں ہی سہی
بہ طرزِ نالۂ غم ہائے خاکیاں ہی سہی
بہ ایں سکوتِ جنوں ساز و بے کراں ہی سہی
کہاں ہے وہ غمِ منزل جو رہ گزاروں میں

جنونِ راہ نوردی کو خام کرتا ہے
نہ سنگِ میل ، نہ منزل کہ یہ سفر ہے مدام

لبوں پہ شکوۂ بیدادِ زندگانی ہے
یہ کیا کہ راہ میں اک استخواں کا ڈھیر نہ ہو
زمیں اداس بھی ہو اور کراہ بھی نہ سکے
نہ آہِ سرد ، نہ گرم آنسوؤں کا ساز ملے
بس ایک پیچ و خمِ گیسوئے دراز ملے
ملے تو چشمِ فسوں ساز ، نیم باز ملے
اداسیاں نہ ہوں شاخوں کی سرسراہٹ میں
کلی کلی میں نہ پیوست ہوں یہ سناٹے
نہ برگِ گل کی مہک خشک ہو کے گرد بنے

یہ زندگی ہے کبھی تو اداس بھی ہوگی
ہنسے گا تجھ پہ بہاروں کا پُرفریب گداز
خزاں بھی اپنا تجھے ہم نفس نہ سمجھے گی
جنوں نواز ستارے نڈھال بھی ہوں گے
یہی زمین یہی ماہ و سال بھی ہوں گے

غبارِ رہ میں ترے ہم خیال بھی ہوں گے
کوئی تو ہے کہ یہ سایے لرز رہے ہیں ابھی

یہ بال و پر میں ابھی تک جو ارتعاش سا ہے
یہ ارتعاش فضائے قفس نہ سمجھے گی

تو میری چاپ سے بھی آشنا نہیں شاید
سمندروں کو جگا میری چشمِ نم کی قسم
زمیں کو ساز سنا ، آج دل کی دھڑکن کا
حدیثِ خاک ہے اک حسرتِ دوام تو کیا
محبّتوں کو نہیں فرصتِ کلام تو کیا
ہزار زہر سہی زندگی کا جام تو کیا
ہر ایک راہ میں چھائی ہوئی ہے موت کی گرد
یہ گرد اُڑتی ہوئی منہ نہ ڈھانپ دے اے دوست
محبّتوں کا کہ اک زندگی کے روزن کا

(۱۹۴۵ء)

بنگال کا انگریز سیّاح

تنگ و تاریک گزرگاہوں میں
خاک آلودہ حزیں راہوں میں
اف، یہ افلاس کے مارے دہقاں
موت کے شہر کی جانب ہیں رواں
ان کے بے نام جنازوں کی برات
یہ مہاکال کی دیوانہ رات
میرے خوابوں کے تعاقب میں نہ ہو
آفتابوں کے تعاقب میں نہ ہو
مہ جبینوں کے یہ عریاں اجسام

اور سرِ راہ یہ ان کا نیلام
تیز تر نبضِ شعورِ مہ و سال

اور مٹی کی تہوں میں اطفال
سینۂ خاک سی لپٹی ہوئی آہ
اور کچھ پھول سے اجسام تباہ
یہ جنازے یہ فضائیں یہ دھواں
ہر قدم پر ہیں صلیبوں کے نشاں

تو بھی اے خطّۂ بنگال کہیں
اک مسیحا کی تو رُوداد نہیں

(۱۹۴۵ء)

خواب گاہ

آج یہ خواب گاہ ہے بے نور
جال بنتے ہیں ماہ و سال یہاں
زندگی آ مجھے سنبھال یہاں
ایک بجھتے ہوئے تبسّم کی
لرزشِ نیم جاں بھی ختم ہوئی
راحتوں کے جو خواب تھے ان کی
شوخیِ داستاں بھی ختم ہوئی
شکوے، لطف و کرم، وصال و فراق
سعیِ خونِ جواں بھی ختم ہوئی
گھورتی ہیں سیاہ راتیں اب
بجھ گیا ہے چراغِ ذوقِ طلب

نورِ مہتاب و بوئے عنبر تک
مضمحل ، سوگوار ہوتی ہے
گفتگو آج ہم نشینوں کی
دلِ نازک پہ بار ہوتی ہے
موسمِ گل کے خواب ختم ہوئے
خاکِ دل شعلہ بار ہوتی ہے
میرا دامن سلگ رہا ہے یہاں
راکھ کا ڈھیر لگ رہا ہے یہاں

(۱۹۴۵ء)

سکوت کا بن

میں نے جانا تھا اس دیار میں ہے
خوابِ گل حدِّ آخریں کوئی

رقص میں ہیں جوانیاں پیہم
پُرفسوں نکتہ دانیاں پیہم
رات کی لازوال خاموشی
ارضِ محزوں کی پاسباں ہے ابھی
ذرّے ذرّے میں دل کی دھڑکن ہے

راہ میں کوئی گیت گاتا ہے
بے سبب کوئی مسکراتا ہے

آتشیں لب ہیں نرم بانہیں ہیں
جال بنتی ہوئی نگاہیں ہیں
ایک میلہ لگا ہے ، ساون ہے

پاس پہنچا تو ہے اداس فضا
بجھ رہی ہے فلک کی تابانی

ہر شبستاں ملا فغاں بہ کنار
ایک نم دیدہ خاک کا انبار
سیکڑوں زرد رُو حزیں مہتاب
سرد راتوں سے کر رہے ہیں خطاب
رات تاروں پہ دام افگن ہے

چیخنا چاہتی ہے تیرہ زمیں
جراَتِ نغمہ بھی ہے کارِ حزیں
یہ خموشی یہ کاروانِ وجود
آج تیری دُہائی ہے معبود
زندگی اک سکوت کا بن ہے

(۱۹۴۵ء)

مدفن

رات کی درد ناک خاموشی
ذرّے ذرّے میں نیم مدہوشی
رہ گزاروں پہ منتشر سایے
اُف یہ بے خواب فتنہ گر سایے
راہ گیروں کے یہ اداس قدم
زندگی ماورائے رقص و رَم

دیدۂ نم میں خواب کی کلیاں
اور کھلتی رہیں تو اچھا ہے
ان اندھیروں میں ڈوبتی گلیاں
اک فسانہ کہیں تو اچھا ہے

مگر آسودگی تو یہ بھی نہیں
زندگی! زندگی تو یہ بھی نہیں

رہ گزاروں پہ جرم و عصیاں کی
بے زبانی پکارتی ہے ابھی
وہ جُوا کھیلتا ہے وقت کا ہاتھ
زندگی روز ہارتی ہے ابھی
کس جواری کی اب کے ہے باری
اے جھلکتے سرابِ غم خواری

ہر شبستاں میں اک اُداسی ہے
خواب بوجھل ہیں روح پیاسی ہے
جام و مینا میں سسکیاں غلطاں
ساز و بربط سے اُٹھ رہا دُھواں

راکھ کا ڈھیر آتشِ جذبات
آگہی مدفنِ جہانِ حیات

(۱۹۴۵ء)

وقت

کتنے رخساروں کا رنگِ آتشیں
کتنے مہ پاروں کی تابندہ جبیں
کتنے پُرآشوب جام و ساتگیں
میری افسردہ نگاہوں میں رہے
قافلے گم گشتہ راہوں میں رہے

کس قدر بت خانے ، کتنے سومنات
کارگاہِ علم کے لات و منات
کتنے بے گور و کفن لاشوں کی رات
دُور سے آواز دیتی ہے مجھے
گرمیِ پرواز دیتی ہے مجھے

ناظر و منظر کی یہ بے چارگی
کارگاہِ میّتِ نظّارگی
آب و باد و خاک کی آوارگی
نرم پھولوں میں ببولوں میں کبھی
کاخ و کو میں اور بگولوں میں کبھی

جستجو کی یہ فضائے بے چراغ
اک ہوا سے شاخِ گل ہے بے دماغ
اک کرن سے چاند کے سینے میں داغ
ایک پرتو کا خرامِ بے حذر
آئنوں سے آئنوں تک ہے سفر

تشنہ و سیراب اجزا کا لہو
ایک ہی زنجیر میں مرگ و نمو
ہر نفس الجھے ہوئے سے تار و پو
خامشی آواز سے ملتی ہوئی
انتہا آغاز سے ملتی ہوئی

کوزہ گر کے چاک کی کچھ گردشیں
حسرتِ تعمیر کی کچھ لرزشیں
اور سکوں کی سمت بڑھتی جنبشیں
میرے گہوارے میں تھک کر سو گئیں
اک افق سے جھانک کر گم ہو گئیں

(۱۹۴۶ء)

آج کی رات کے بعد

آج کی رات کے بعد آئے گا
اور اک نوح کا طوفانِ عظیم
کوہساروں کے گراں بار وجود
اور یہ بازی گریِ زرد و کبود
خواب گاہوں کے یہ شب تاب سبو
بزمِ عرفاں کا یہ ہنگامۂ ہُو
دم بہ دم ایبک و سوری کی حدیث
اور یہ آئینِ جہانِ تثلیث
سنگ و آہن جو پگھلتے ہی نہیں
اپنا عنوان ، بدلتے ہی نہیں
جس سفینے میں جگہ پائیں گے
وہ سفینہ ہی الٹ جائے گا

(۱۹۴۶ء)

رات کی قبر

نیم جاں ، شکوہ کناں گیت ، حزیں آوازیں
راہ گیروں کے تھکے ماندے سے قدموں کی صدا
شب کی خاموش ، فضاؤں میں گھلی جاتی ہیں

خامشی رات کی بانبی سے نکل آتی ہے
شہر کے شور کو ، جاگے ہوئے مے خانوں کو
سائبانوں کو ، در و بام کو ، ایوانوں کو
اک ذرا دیر میں ڈس جائے گی دھیرے دھیرے

پر سمیٹے ہوئے بیٹھی ہے ہوا کی لرزش
ساز کے راگ ، دمِ حرف ، لبوں کی جنبش
اس شبِ تار کے اسرار کھلے جاتے ہیں

تم مرے پاس ہو ، لیکن یہ فضاؤں کا سکوت
جیسے ہم دونوں خموشی میں گھلے جاتے ہیں

چشمکیں کرتی ہے افسردہ نگاہوں سے ابھی
دور اک طائرِ درماندہ کی آوارہ اڑان
وقت کی رَو سے ، کسی جنبشِ بال و پَر سے
ٹوٹ کر جیسے گرا چاہتا ہے نیند کا جال
تم ذرا دیر سنبھل جاؤ کہ یہ شب کا ملال

نقش بر آب ہے مٹ جائے گا کھو جائے گا
راہ میں گرمِ سفر ، عالمِ بیداری ہے
سرسراتے ہیں اجالوں کے ہزاروں داماں
یوں الجھنے کو ہے ظلمت سے شعاعِ خورشید
رات کی قبر پہ ہوں جیسے صلیبوں کے نشاں

نیند کو محو کرو ، رات تو اب بیت گئی
وہ جنوں کاریِ ظلمات تو اب بیت گئی

(۱۹۴۶ء)

شہر کی شام

دلِ حزیں کی فضا جس سے جاگ اٹھتی تھی
حکایتیں وہ جنونِ وفا کی خواب ہوئیں
تلاشِ منزلِ گم گشتہ میں ہیں محو ہنوز
وہ آرزوئیں جو محرومِ آب و تاب ہوئیں

بس ایک بابِ تمنّا جو تجھ پہ بند ہوا
وہ یاد جس سے عبارت ہے زندگی تیری
وجود اس کا مری جان ، زہر خند ہوا

فضا میں کھو گئیں رعنائیاں نگاہوں کی
ترے پیامِ نہاں بھی ہیں جرم اب تیرے
کھلی جو آنکھ ہوائے نشاط یوں بدلی
ترس رہے ہیں تبسّم کو آج لب تیرے

ہر اک نفس ہے ترا مرگِ بے کسی کی دلیل
تصوّرات کی دنیا میں خاک اُڑتی ہے
ہوا کی زد پہ ہے خوابوں کی زر فشاں قندیل

وہ دل پذیر ، جزا و سزا کے ہنگامے
نگاہ کھیل کے جن سے سکون پا نہ سکی
تری سپردگیِ بے کراں کی آگاہی
جو قرب و بُعد کے احساس کو مٹا نہ سکی

جفائے عمرِ گریزاں پہ خندہ زن ہے ابھی
گزشتہ شام و سحر کے ہزار سایے ہیں
انھیں سے تیرے خیالوں کی انجمن ہے ابھی

تھکے ہوئے سے تنفّس میں ہے فسانۂ دوش
یہ جاگتا سا بدن ہے کہ محوِ سرگوشی
اندھیری رات میں کھلتے ہوئے دریچوں سے
پکارتی ہے مرا نام لے کے خاموشی
نگاہ اب کوئی جادو جگائے یا نہ جگائے

وہی ہے عشق بھی نم دیدہ اور خاک بسر
جنوں کے مدفنِ پارینہ پر چراغ جلائے

بس اک نگاہ تاملِ وفا کی بات نہیں
اداسیوں کی فضاؤں پہ ہنس بھی سکتے ہیں
یہ سرکشی بھی گوارا نہیں تجھے شاید
ہم آج اپنی خطاؤں پہ ہنس بھی سکتے ہیں
یہ شام شہر کے دامن میں ڈوب جائے گی
بہت دنوں میں یہ فرصت جو راس آئی ہے
خیالِ رہبر و رہزن میں ڈوب جائے گی

(۱۹۴۶ء)

ملاقات

رُت بدلی تھی شاخوں میں
آوارہ پھول کِھلے تھے

کچھ دیر تھی ان کی خوش بو
سینے میں اُترتا چاقو
گردِ شب و روز سے آخر
مٹتے ہوئے سوز سے آخر
مٹی کی تہ نے اچھالا
پت جھڑ کا بڑھتا ہالا
اب دُھول اڑا کرتی ہے
بنجر سوکھی دھرتی ہے

اک موڑ پہ دو ہم راہی
مدّت کے بعد ملے تھے

(۱۹۴۶ء)

بے حسی

تیری آنکھوں کی اُداسی میں لرزتی ہے ابھی
کوئی افسردہ سی بے ربط حدیثِ مہ و سال
سانس لیتی ہے پپوٹوں میں اک اُچٹی ہوئی نیند
اشک بننے کو ہے اک موڑ پہ ملنے کا خیال

ان اندھیروں میں ترے جسم کی بجھتی ہوئی آگ
چند بیتے ہوئے لمحوں کو جگا دیتی ہے
اک ترے نرم تبسّم کی لرزتی ہوئی رَو
بے نوا دردِ محبّت کو ہوا دیتی ہے

آج بھی اس سے ہے وابستہ مقدّر میرا
تیری آنکھوں میں جو احساس ہے ویرانی کا

زرد چہرے پہ ہے ڈوبے ہوئے سورج کا غرور
یہ بھی عنوان ہے اک قصّۂ زندانی کا

کھیل اس دور کا تھا گرچہ شکستِ زنجیر
تو کہ پابندِ قوانینِ حرم ہے، چپ ہے
آج ہر خواب سے ہے دست و گریباں تعبیر
دل کہ اک دشمنِ آدابِ ستم ہے، چپ ہے

(۱۹۴۶ء)

یاد

اک یاد کبھی آجاتی ہے
ننھے سے پرندوں کے دل میں چاقو سی لگے جب خاموشی
ڈسنے کو اندھیری رات بڑھے ، بیری ہو ہوا کی سرگوشی
اور بے سمجھے بوجھے لب پر ، فریاد — کبھی آجاتی ہے
دل تم کو بھول چکا لیکن — اک یاد کبھی آجاتی ہے
جب تیز ہوا کی آہٹ سے سویا ہوا بن جاگ اٹھتا ہے
کھوئے ہوئے رشتے سلگا کر، جب دردِ کہن جاگ اٹھتا ہے
اور ویرانی دل کو کرنے آباد، کبھی آجاتی ہے
دل تم کو بھول چکا لیکن — اک یاد کبھی آجاتی ہے
راتوں کو راہ گزاروں پر سایوں کی جالی ٹوٹ چکے
اک شعلۂ عریاں کی لَو سے صہبا کی پیالی ٹوٹ چکے

ایسے میں کہیں کچھ دل کی بھی ، روداد۔ کبھی آجاتی ہے
دل تم کو بھول چکا لیکن — اک یاد کبھی آجاتی ہے
جب بندِ قبا سے بیگانے راہوں میں آنچل اُڑتے ہیں
پُر پیچ گھنیری زلفوں سے خوش بو کے بادل اڑتے ہیں
اور عشقِ جنوں پیشہ پہ کوئی افتاد کبھی آجاتی ہے
دل تم کو بھول چکا لیکن — اک یاد کبھی آجاتی ہے
سینے میں کوئی اَن جان کسک محسوس سی پل پل ہوتی ہے
بادل کے دُھویں سے دھڑکن جب کچھ دل کی بوجھل ہوتی ہے
اور دامِ جنوں میں عقلِ ستم ایجاد کبھی آجاتی ہے
دل تم کو بھول چکا لیکن — اک یاد کبھی آجاتی ہے

یہ میرے دل کی رِیت ہوئی
کیا جانیے کیسی بیت ہوئی

کچھ وقت کے بکھرے ٹکڑوں کو جب تیز ہوا سلگاتی ہے
دل تم کو بھول چکا لیکن — اک یاد کبھی آجاتی ہے

(۱۹۴۶ء)

مادرِ گیتی سے

یہ ترا ہمدمِ دیرینہ، رفیق و غم خوار
شبنمی نور میں ملبوس، یہ مہتاب، الجھتا ہوا برگد کی حزیں شاخوں سے
زہر خند اس کی ضیائے خاموش

یہ سرِ راہ تجھے دیکھ کے عریاں شاید
اپنے ہی سینے کے داغوں میں بدل سکتا تھا
توڑ کر رات کی زنجیر نکل سکتا تھا
دور اس حلقۂ پروین و ثریّا سے بھی دُور
شب کے زندانیِ بے سوز سے یہ بھی نہ ہوا——

کیا مرے سامنے دُہراتی ہے
وہ اساطیرِ جنوں خیز وہ پارینہ حدیث
جو کبھی بابل و یونان کی خوابیدہ فضاؤں میں لہو بن کے رواں رہتی تھی

لُوٹ کر لے گئے کچھ لوگ تبسّم تیرا
درس گاہیں بھی ارسطو کی کمیں گاہیں تھیں
مشعلیں جلتی رہیں، تیرہ مگر راہیں تھیں

سیکڑوں باب ہیں گزرے ہوئے روز و شب کے
خوں ٹپکتا ہے در و بام کی پیشانی سے
ایک ویرانی، لپٹ جاتی ہے ویرانی سے
شمعیں بجھتی ہیں دُھواں اٹھتا ہے
اک نہ اک پردۂ اسرار جہاں اٹھتا ہے

وقت کا محبسِ تاریک ہوئی بزمِ وجود
ہر تغیّر کے اشارات نہاں پا ہی گئے
راہ اپنی، ترے اشکوں میں تری آہوں میں
تجھے آنا ہی پڑا ـــــ

سنگ و آہن کے ستونوں کی کڑی بانہوں میں
تیرے سینے سے لپٹتے ہی رہے شعلہ و دُود

آج باقی نہیں پیراہنِ صد چاک ترا
چھوڑ گلتی ہوئی پوشاک کے انباروں کو
اپنی عریانی پہ ہنس لینے دے سیّاروں کو
آئے گا، آئے گا کوئی تو شہابِ ثاقب
اس کے دامن میں دہکتے ہوئے شعلوں سے بنائی ہوئی چادر کا اک آنچل ہی سہی
میں تماشائی سہی آج تری خلوت کا
میری اس حیرتِ طفلی پہ نہ جا
ماں تجھے گھورتے رہنے کا خطاکار ہوں میں

(۱۹۴۶ء)

انجم شناس سے

ایک بوسیدہ و خاموش وفسردہ مینار
زرد رُو پودوں کا، خفّاش کا کنجِ بے سوز
پرنیاں اس کی سرِ راہ کی عریانی پر
ہر نفس اُگتی ہوئی کائی کے مانند ہے دُودِ شب و روز
میرے اجداد کی روحوں سے ہے آباد ہنوز
اس کے ہر گوشۂ ویراں کا جنوں خیز سکوت
میری آشفتگیِ شام وسحر کا تابوت
تجھ پہ آئینہ ہے تقدیر مری
عارفِ شعبدۂ چرخ ہے تُو
ہر نظر تیری جہاں تاب رہی
تجھ سے کیا کاتبِ تقدیر نے سرگوشی کی

میں بھی آئینۂ اسرار ہوں جامِ جمشید
فاش ہوتے رہے اسرارِ نہاں بھی مجھ پر
ہر نظر صیرفیِ کون و مکاں تھی برسوں
راکبِ مرحلۂ سود و زیاں تھی برسوں
یہ مگر کھو بھی چکی اپنی رسائی کا غرور
مدتیں ہوگئیں پتھرا گئیں میری آنکھیں
فرصتِ یک نفسِ سوختہ راس آئی تو کیا
خشک ہونٹوں پہ حسیں گیتوں کے مدفن دیکھے
سیکڑوں مارِ سیہ، سیکڑوں رہزن دیکھے

رہبرِ تیز قدم جادہ و منزل کے امیں
جن کی تنہائی کا برسوں رہے عنواں دونوں
خندۂ اہرمن و گریۂ یزداں دونوں

نرم جاں پودوں پہ بے سوز چٹانوں کا جمود
وادیاں خوف سے تاریک۔ چڑیلوں کا دیار

اس گزرگاہ میں شمشیر بہ کف
دُور و نزدیک رواں

ایک مخلوق نگوں سار۔ دریدہ دامن
شہریاروں کا ہدف

خارزاروں کی فضاؤں میں سکوں کیا ملتا
اک پنہ ڈھونڈی تھی، دنیا کے جنوں زاروں میں
پا گئے تھے مرے برگشتہ خیال
اک حسیں جسم کے گہوارے میں
ایک مسکن کہ جہاں غم کا نشاں بھی نہ ملے
ایک مدّت سے مگر نیم عیاں بھی نہ ملے
وہ شرارے جو ستاروں پہ ہنسا کرتے تھے
کرب آلودہ تنفّس کے سوا
اور جو کچھ ہے وہ قانون کی زنجیر کا ماتم ہی نہ ہو

عارفِ شعبدۂ چرخ ہے تُو
چرخ کے ثابت و سیّار سے شکوہ تو نہیں
کھا گئی مجھ کو یہ بے نور زمیں
کھا گئی مجھ کو یہ بے نور زمیں!

(۱۹۴۶ء)

گوتم کی زمیں

ارضِ مغرب کی حسیں دوشیزہ
مجھ سے لپٹی ہوئی شرماتی رہی
نیلگوں آنکھوں کے پردوں میں جھلکتا رہا، ان سرد ممالک کی فضاؤں کا سرور
جن کے برفیلے کہستانوں کی وسعت میں شب و روز کئی رقص کے گرداب میں
سمٹے ہوئے جسم
ڈوبتے ڈوبتے رہ جاتے ہیں
اس کے رخساروں کی دہکی ہوئی آگ
روحِ زرتشت کی کھاتی تھی قسم
چند کافی کے پیالوں کے سبک سایوں میں
ہر تبسّم غمِ دوراں کو تھا مانندِ صلیب
اجنبی سے کوئی شکوہ تو نہیں

اس نے سمجھا تھا کہ نروان کا شاہد ہوگا
ہر بشر یوں بھی جو اک صفر ہے اور صفرِ مدام
اس کے آبا کے تصور کے ہزاروں آسیب
بڑبڑاتے ہوئے خاموش ہوئے
تیرہ و تار روایات کی بانی سے عبارت ہے یہ گوتم کی زمیں
اس کو اک ملحد و زندیق کے بوسوں کا تپاک
آشنا تیرہ فضاؤں سے کبھی کر نہ سکا

قہقہے بجتے رہے
ایک خوددار رِشی کا کردار
دیر تک بحث کا عنوان رہا
اس نے فاقوں کے طلسمات پہ جب زور دیا
آہنی نیند میں جکڑی ہوئی مٹی کے لبوں پر یہ صدا ناچ کے خاموش ہوئی
میں بھی بھوکی ہوں بہت بھوکی ہوں
تیرگی جاگ اُٹھی
اور اک صفر کے بے جان اُفق سے اٹھ کر
کتنے آوارہ جنازوں نے قدم چوم لیے
اُن خداؤں کے قدم

جن کے سنگین بتوں کے سایے
وقت کی سوئی سے لپٹے ہوئے سورج کے اُجالے بھی مٹا ہی نہ سکے

اجنبی سے کوئی شکوہ تو نہیں
تیرہ و تار روایات کی بانی سے عبارت ہے یہ گوتم کی زمیں

(۱۹۴۶ء)

سرِ مژگاں

تیرے اشکوں کی داستاں مت پوچھ
چند ویراں عمارتوں کے قریں
کر رہا ہے سکوت سرگوشی
یا مکینوں کی آہٹیں — پا کر
اک طرف ہٹ گئی ہے خاموشی

چار سو ڈھیر زرد پتّوں کا
وہ خزاں کے سے اوّلیں آثار
سرنگوں ، دل گرفت نوحہ کناں
نیم عریاں سے پا بہ گِل اشجار

اور زندانیوں کا ایک ہجوم
چہرے سنگین و دست و پا بے جان
ایسے تیشے ز فرق تا بہ قدم
ایک خوں ریز دور کی پہچان
مجھ پہ جو راز ہیں عیاں مت پوچھ

(۱۹۴۶ء)

کمیں گاہ

یہ تری آغوش، میری قبرِ بے سنگِ مزار
زندگی کے بے کراں غوغائے خوں آشام کی ہر مملکت سے دُور کتنی دُور ہے
کوئی آوارہ صدائے بازگشت آتی نہیں
اس لحد کی تیرگی میں پیچ و تابِ کائنات
ایک رقصِ خام کی بے سوز کاوش کا خیال
یہ مہکتی سانس کافوری کفن سے کم نہیں
جو حیاتِ خونچکاں کی ہر روش پر— اک وبالِ دوش بن کر سامنے آجائے گا

قہقہوں کی نیم پیدا روشنی کی چھاؤں میں
آج کیوں دُہرا رہا ہے تیرا جسمِ تاب ناک
بے بسی کی وہ دلیلیں میں نے جن کی اوٹ سے

خوں فشاں اُدھڑی ہوئی کھالوں کے ناہموار و بے جاں فرش پر دیکھا ہے
ناسوروں کا ناچ

نوحہ گر دل کو گزرگاہوں کے سناٹے میں بھی
نطق سے محروم آبادی صدا دیتی ہوئی
تیرے لب کی لرزشوں میں نیم پوشیدہ سی ہے

میں تو چشم و گوش کی ان بیڑیوں کو توڑ کر
ڈوبنے آیا تھا اس مدفن کی تاریکی میں آج
یہ تری آغوش میری قبرِ بے سنگِ مزار
اک کمیں گاہِ جنونِ فتنہ ہائے روزگار

(۱۹۴۷ء)

فصیلیں

رات اور نیند کی یہ شہر پناہ
کھو گئی ہے فضائے نقش و نگار
خامشی ہے کہ اک حریف کا وار
ایک غوغائے بے صدا ہے جہاں
کوئی راہی نہ رہ گزار کوئی
شادماں ہے نہ سوگوار کوئی
آہنی ہے سکوت کی زنجیر
گنگ ہے طبلِ جنگ کی آواز
محو ہے آج ہمتِ تگ و تاز
وقت کو فرصتِ کلام نہیں
راستہ روکتی ہے ویرانی
زندگی ہے کہ ایک زندانی
ایک کیا سیکڑوں فصیلیں ہیں

(۱۹۴۷ء)

بدلتے ہوئے عنواں

کبھی اک کاسۂ دریوزہ گری فرصتِ زیست
کبھی اک نیم تبسّم کی سکت بھی ہے وبال
کبھی بیمار کی ڈوبی ہوئی نبضوں کی طرح
آہنی نیند میں سوتا رہا صدیوں کا جلال
کنمناتے رہے تاریخ کے سن سینوں میں
کبھی چنگیز و ہلاکو کے درخشاں خدوخال
اجنبی اپنی ہی بستی میں کبھی خود انساں
آدمی اپنے ہی قدموں کے تلے خود پامال
ٹوٹتے تارے کی افسردہ ضیا ہو جیسے
یوں دبے پاؤں گزرتا رہا جینے کا خیال

عشق اُجڑی ہوئی بستی کا چراغِ مردہ
حسن ہارے ہوئے شاطر کی کوئی آخری چال
اس میں ہر ہاتھ کی خامی نے پناہیں ڈھونڈیں
کس کے ہاتھوں نے بُنا ہے یہ شب و روز کا جال

کس کے ہاتھوں نے بُنا ہے یہ شب روز کا جال
اِس کے پردوں میں ہیں رازِ غمِ انساں کیا کیا
ہر کرن صبح کی صدیوں سے رہی پردہ شگاف
کھا گئی رات مگر پردہ شگافاں کیا کیا
خواب و بیداری و تفسیرِ جہانِ صد رنگ
چور بازار میں بکتے رہے درماں کیا کیا
زیست کے دشتِ جگر تاب کے سنّاٹے میں
خاک اُڑاتے ہی رہے راہ سپاراں کیا کیا
چھین لی کس نے اُفق تابی کی فرصت اِن سے
جل بجھے یوں بھی تو اکثر مہِ تاباں کیا کیا
کتنے دیوانوں کو خود پوچھنے آئی ہے صبا
اس گزرگاہ میں تھے چاکِ گریباں کیا کیا

مے کدے سو گئے مے خواروں نے توبہ کرلی
تشنہ ہی رہ گئے آدابِ بہاراں کیا کیا
ظلمت و نور کے ہنگامِ جنوں پرور میں
زندگانی کے بدلتے رہے عنواں کیا کیا

(۱۹۴۷ء)

شمع بجھتی ہے تو......

جاگتے جاگتے وہ پچھلے پہر تک اے دوست
خواب کی بجھتی ہوئی آگ سے بنتی ہوگی
نیند اک شعلۂ تریاک تری آنکھوں میں
کتنی یادوں کے ورق اب بھی الٹتا ہوگا
صبح کا دامنِ صد چاک تری آنکھوں میں

تیرے کمرے کی اُداسی تجھے ڈستی ہوگی
اُس کی تنہائی کے دامن میں سمٹتی ہو گی
شعلۂ جاں سے جو روشن ہیں وہ شب ہائے وصال
اس کے سایے میں لباس اپنا بدلتے ہوں گے
تیرا اندازِ تبسم ترے خوابِ مہ و سال

بھیگتی رات کہ اک قافلۂ درد بھی ہے
تیری پلکوں کی گھنی چھاؤں میں آتے ہوں گے
اک مسافر کی طرح خواب بھی دم لینے کو
میرا سایہ تری آنکھوں میں لپکتا ہوگا
راہ کے موڑ پہ دُزدیدہ قدم لینے کو

زیرِ لب آہ سے کیا جی پہ گزرتا ہوگا
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں چھلکتا آنسو
کس جتن سے سرِ مژگاں ہی سنبھلتا ہوگا
کرب اُچٹی ہوئی نیندوں کا وہ افسانہ ہے
صبح تک سیکڑوں عنوان بدلتا ہوگا

زندگی تُند ہواؤں میں ٹھہرتی بھی نہیں
نقشِ پا رہ گئے باقی کوئی منزل ہے نہ میل
کس کا ایثار ہوا رنگِ ہنر میرے لیے
اس فسانے کی زمانے کو خبر کیا ہوگی
کون بے خواب رہا تا بہ سحر میرے لیے
کون بیگانۂ آغوش ہوا میرے بعد
"شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد"

(۱۹۴۷ء)

ہم سفر

سوادِ زندگی میں خواب آسا
خطِ آتش تھا نوعمری کا جادہ
ہوائے سیر سے بیدار تھا دل
زمیں تھی تازہ رُو رنگیں کشادہ
کھڑا تھا راہ میں لیکن غمِ وقت
پہن کر عشق کا خونیں لبادہ
نظر میں جاگ اُٹھا تھا کوئی پیکر
قد و قامت میں سروِ تاب دادہ
سوالِ نودمیدہ کی چمک سے
جبیں پر اک شکن سی بے ارادہ

بڑی منّت سے میں نے اُس سے پوچھا
کتابِ قیس کا اک حرفِ سادہ
لگا کہنے کہ دیوارِ دبستاں
اثر اچھا نہیں رکھتی جنوں کا
ہوائے عشق کا جادو بلا ہے
کوئی جیتا نہ دیکھا اس فسوں کا
زمیں پر آسماں نامہرباں ہے
وفا قصّہ ہے جامِ واژگوں کا
کہا میں نے کہ اے جانِ بہاراں
بہاراں نام ہے اک موجِ خوں کا
سمجھتے ہیں اسے ہم خوابِ شیریں
گزرگاہوں میں آنا بے ستوں کا
کچھ اس کے بعد کی منزل میں اکثر
چلا وہ ساتھ میرے لڑکھڑاتا
قدم کی آہٹوں کی تیز لَو سے
چراغِ جادۂ فردا جلاتا
گریزاں وصل سے ہجراں سے نالاں
قیاسِ ساحل و طوفاں لگاتا
اُفق کی روشنی میں خوابِ نو سے

در و دیوار کے نقشے بناتا
کسی نادیدہ میزاں کا تصوّر
حدیثِ عصمت و عصیاں میں لاتا
مُقفّل در پہ میرا نام لکھ کر
پسِ دیوارِ دل خود کو چھپاتا

(۱۹۴۷ء)

نہ ہو نگار کو فرصت

حسن نے مجھ کو جو فریب دیے
وہ بہ اندازۂ وفا ہی دیے
ہاتھ میں ہاتھ دے کے منہ موڑا
اور قدم میرے ڈگمگا ہی دیے
گرم بوسوں کے نشہ آور جال
سیکڑوں راہ میں بچھا ہی دیے
شوقِ گستاخ کا جواب دیا
بارِ آداب بھی اٹھا ہی دیے
سیج پر جب نگاہ نیچی کی
چند الزام بھی لگا ہی دیے
نیم عریاں بدن کی جوت سے بھی
تیرگی میں دیے جلا ہی دیے

اُس اُفق کا میں کرب ہوں اے دوست
جو طلوعِ سحر سے تھا شاداب
اُف وہ ہنگامہ ہائے دورِ وصال
ایک موجِ بلا کا پیچ و تاب
اک گہن وہ کہ نورِ جاں کے لیے
تیرگی سے گزر رہا تھا شباب
گرم بانہوں کے تنگ حلقوں میں
کتنے طوفاں تھے کس قدر گرداب
اک سرکتی ہوئی سی چادر میں
اک سمٹتی ہوئی شبِ مہتاب
دیدۂ نیم باز میں آخر
قصّۂ خلد کی کھلی تھی کتاب
مجھ سے مت پوچھ عشق کے قصّے
خاک اِس رہ گزر میں چھانی ہے
حسن کو جب اداس پایا ہے
میں نے اپنی شکست مانی ہے
جسمِ جاناں میں کروٹیں لیتا
میرا ہنگامِ نوجوانی ہے
جس نے چمکا دیا ہے اس کا شباب
وہ مری خونچکاں کہانی ہے

اُس کے رنگِ ستم گری کو نہ پوچھ
کیف و کم روحِ زندگانی ہے
میں اور اس کا تغافلِ بسیار
یہ بھی اک طرزِ شادمانی ہے
کم نہیں ہے فسونِ تابِ صنم
جادوئے چشمِ برہمن نہ سہی
دل یہ کہتا ہے اس سے جانِ وفا
اب تجھے ذوقِ انجمن نہ سہی
زندگانی میں رشتۂ غم کا
سلسلہ یادِ پیرہن نہ سہی
قلب میں چبھ رہا ہے عہدِ وصال
آج اگلی سی وہ لگن نہ سہی
کب سے آوارہ ہے یہ تیرے بغیر
فکرِ آہوئے بے ختن نہ سہی
مجھ کو آنے دے اک نفس کے لیے
تیری خلوت کا یہ چلن نہ سہی
سرِ بالیں کوئی صلیب سہی
میں محبّت کا بانکپن نہ سہی

(۱۹۴۷ء)

وہ مرا آہوئے ختن

وہ مرا آہوئے ختن اے دوست
نکہتیں ہم رکاب چلتی ہوئی
رنگِ رخسار آتا جاتا ہوا
آفتابوں کی ضو پگھلتی ہوئی
جسم کی نیم خواب ضو میں کہیں
صبح سی کروٹیں بدلتی ہوئی
اور شانوں کے نرم گنبد پر
آگ آتش کدوں کی جلتی ہوئی
وہ چمکتی ہوئی کمر کا خم
ایک ہیرے سے لو نکلتی ہوئی

جرأتیں نیم باز آنکھوں میں
لڑکھڑاتی ہوئی سنبھلتی ہوئی
اس کے عجز و غرور کا عالم
کشتیاں ڈوب کر اُچھلتی ہوئی
اس کے خوابِ گناہ کی تعبیر
ادھ کُھلے گھونگٹوں میں پلتی ہوئی
رات اس کے سکوت کی تصویر
اس کی بیداریوں کی صبح امین
اس کی خلوت حدیثِ آدم و خلد
اس کی جلوت نگار خانۂ چین
وہ بہ شوخی غزالِ رم خوردہ
وہ بہ دورِ سکوں حرم کی زمین
زہر و تریاق ایک پیالے میں
اس کا اندازِ شورش و تمکیں
ایک کیا لاکھ دلبرانہ ادائیں
اس کی شائستگی سے جھانک اٹھیں
زیست کے سرمگیں دُھندلکوں میں
اس کی آمد طلوعِ ماہِ مبیں

اس کے سایے میں روحِ کون و مکاں
اس کے قدموں پہ ساعتوں کی جبیں
اس کا اندازِ کافری مت پوچھ
قبلۂ زندگی و کعبۂ دیں
اس کے عہدِ وصال کی باتیں
یک دگر اختلاطِ سنگ و سبو
موج در موج وہ تبسّمِ لب
پیچ در پیچ وہ کھلے گیسو
اس کی کھوئی ہوئی سی آنکھوں میں
جرم کا شوق ، شوق کے آنسو
پُرسکوں یوں بھی تھی فضائے وصال
اور اس کی غنودگی جادو
آپ اپنے حجاب سے سرشار
آپ اپنے نشے میں اک خوش بو
وہ ہجومِ گناہ میں تقدیس
شب کی تاریکیوں میں اک جگنو
وہ کہ تارِ قبائے مریم سے
چاک کرتا ہے معصیت کا رفو

(۱۹۴۷ء)

مجھے گلہ ہے ابھی

مجھے گلہ ہے ابھی انقلابِ دوراں سے
سحر پہ یوں تو مرا کوئی اختیار نہ تھا
اُفق کی بجھتی ہوئی ضو کا انتظار نہ تھا
وہ آفتاب جو راتوں کو میں نے ڈھالے تھے
خیال و خواب کی دنیا نے جو سنبھالے تھے
ہوائے بزمِ سلاطیں سے بجھنے والے تھے
یہ میری دیدہ وری پر بھی آشکار نہ تھا

سمجھ رہا تھا کہ اب میرے دشتِ ویراں سے
شعاعِ مہر اگر آئنہ اٹھائے گی
اُفق سے تا بہ اُفق اس کی چھوٹ جائے گی

نگاہ و دل کی یہ حسرت پرستیاں اک دن
اندھیرے ڈستے ہیں جن کو وہ پستیاں اک دن
مجھے یہ نطق سے محروم بستیاں اک دن
پکار اٹھیں گی تو منزل قریب آئے گی

چھڑا چکا ہوں میں دامن کو دستِ زنداں سے
شکستِ طوق و سلاسل کے گیت گاؤں گا
بجھا ہوا سا چراغِ وفا جلاؤں گا
یہ زلف تا بہ کمر ابروؤں کی یہ محراب
یہ اک تبسّمِ زیرِ لبی کا طرزِ خطاب
یہ میرا جامِ سفالیں یہ خانہ ساز شراب
یہ کم نہیں ہے کہ میں جامِ جم اٹھاؤں گا

ورق ورق تھی سحر یا سحر کے ایواں سے
فقط سکوتِ شبِ سوگوار ٹوٹا تھا
سمجھ گیا ہوں کہ منزل کا خواب جھوٹا تھا
ابھی کرن نے اندھیرے میں راہ پائی تھی
متاعِ نور بہ یک کاسۂ گدائی تھی
فضا میں شوخیِ نبضِ جواں نہ آئی تھی
ہوا نے قافلۂ زندگی کو لوٹا تھا

مگر اُمید ہے اک موجِ گرم جولاں سے
لرز رہی ہے برابر اُفق کی ضو میں ابھی
کوئی حدیثِ تغیر ہوا کی رَو میں ابھی
سرشتِ خاک کو پائے ہوئے سے ہیں مہ و سال
تڑپ رہے ہیں زمانے کے دل کشا خدوخال
بدل رہا ہے ابھی آدمی کے دل کا ملال
جلے گی فردِ ستم ایک تیز لَو میں ابھی

(۱۹۴۷ء)

آخری تجویز

یہ لہکتے ہوئے آنچل یہ تبسّم یہ شباب
نیم خوابیدہ نگاہوں کے پُراسرار خطاب
آہنی جال سا بنتے ہوئے رومان کے خواب
دیکھتا ہوں کہ یہ منّت کشِ تعبیر نہیں
اور تسلیم مجھے شیوۂ زنجیر نہیں

رقص گاہوں میں یہ طاؤس یہ راہوں میں غزال
ہر تصوّر میں لرزتا ہے جہانِ اشکال
اور تاحدِّ نظر یہ شبِ تاریک کا جال
زندگی دیر سے عنوان بدلتی ہی نہیں
اس شبِ تار کی بانہی سے نکلتی نہیں

یہ شبِ تار یہ محرابِ صد آثارِ کہن
آہ یہ کژدم و خفّاش کا پُر ہول وطن
فہم و ادراک سے چھٹتے نہیں بے جان گہن
نالۂ بوم میں سینوں کی دھڑک گم ہے ابھی
اک سیاہی میں ستاروں کی چمک گم ہے ابھی

سانس اُلجھی ہے کہ طاری ہے ابھی حبسِ دوام
یہ مہ و سال سے لپٹے ہوئے قحط و آلام
اُف یہ دنیا یہ کفن چور خداؤں کا نظام
ہم جدھر جائیں اک آسیب صدا دیتا ہے
اک نہ اک حلقۂ زنجیر بڑھا دیتا ہے

رات کی ساحری پُر دم ہے، ابھی تک اے دوست
سانس میں کرب کا عالم ہے ابھی تک اے دوست
زندگی دیدۂ پُر نم ہے ابھی تک اے دوست
اس کو اک خندۂ دل گیر کا عنواں کردیں
نیشتر ہی سہی پیوستِ رگِ جاں کردیں

کج کلاہی پہ ہنسیں بندہ پناہی پہ ہنسیں
جرم و عصیاں کی اس آوارہ نگاہی پہ ہنسیں
صبح تک رات کی پُر ہول سیاہی پہ ہنسیں
اور اک زندہ حقیقت کے پرستار بنیں
زندگی جرم ابھی تک ہے خطاکار بنیں

عالمِ نو کا یہ سینوں میں مچلتا ہوا راگ
اور یہ سرحدِ آفاق کو چھوتی ہوئی آگ
خونِ تازہ ہی سہی آج حقیقت کا سہاگ
اور اک زہر کا جام ، ایک صلیب اور سہی
آج سقراط و مسیحا کا نصیب اور سہی

(۱۹۴۸ء)

موسم کا تغیّر

زندگی کا ہر نفس ہے دیدہ و دل کا رقیب
مہ وشوں کے قہقہے ہیں اور ہم ہجراں نصیب
اک فضائے چاک دامانی سی ہے دل کے قریب
جنبشِ نبضِ جنوں کچھ آرزو انگیز ہے
وہ ہوا جو شوق کا رخ ہی بدل دے، تیز ہے

زمزموں کی نرم جولاں موج کا یہ پیچ و تاب
عود و عنبر کے دُھویں میں گم ہیں بے اشکال خواب
چھینتا ہے آئنوں کی تاب کس کس کا شباب
اس شبستاں کے کنارے وقت تھم جانے کو ہے
نیند کھڑکی کے خنک شیشے پہ جم جانے کو ہے

ارغنوں کے جزر و مد میں ہیں ترانے پے بہ پے
رقص کے گرداب میں ہے جسم اک خوابیدہ لے
اک وصالِ ہجر ساماں ، نالۂ پابند نے
جنبشیں آوازہ کستی ہیں رخِ ایّام پر
ریشم و سنجاب تک زنجیر ہیں اجسام پر

چھائیاں ہیں پھر رخِ حکمت پہ بیداری ہے خوار
ہوش فولادی سپر ڈالے ہوئے ہے سوگوار
خستگی ہے یا رگ و پے میں کسی چاقو کی دھار
موم پاروں کی طرح پگھلے ہوئے اوقات کی
کس نزاکت سے پرت رکھتی ہیں گھڑیاں رات کی

دُور تک ہیں اس شبستاں سے وہ سونے سقف و بام
جن کی ویرانی سے آوارہ ہوا ہے ہم کلام
بجھنے والی شمعیں دو اک رہ گئیں داغِ جذام
راہ کے بے نطق سایوں میں بھی سرگوشی ہے آج
اک برہنہ درد کی ہم راز خاموشی ہے آج

کوئی شب خوں ہے کہ یہ پرچھائیاں ہیں رات کی
دل کے ویرانے میں چلتی ہے ہوا آفات کی
اک کفِ گرداں میں ہیں چنگاریاں لمحات کی
گرد کے طوفان چھٹ جانے کو ہیں ، وہ موڑ ہے
فاصلے صدیوں کے کٹ جانے کو ہیں ، وہ موڑ ہے

یہ شبِ تاریک یہ آب و ہوا کا اضطراب
آج ہے ذرّات کی گردش میں رقصِ آفتاب
چھٹنے والے ہیں گہن سے عالمِ فردا کے خواب
رات کی چینِ جبیں کے اور ہی انداز ہیں
اس خموشی میں نئے آہنگ کے در باز ہیں

در پےِ تغیرّ ہے اک انقلابِ تیزگام
شیشۂ ساعت میں آوارہ بگولوں کا خرام
اک نئی مٹی میں گوندھے جا رہے ہیں صبح و شام
اب رصدگاہوں کے پیمانے میں لَو دینے لگا
ایک موسم کا تغیرّ کروٹیں لینے لگا

(کراچی، ۱۹۴۸ء)

خواب اندر خواب

یہ ہجومِ مہ وشاں یہ رات یہ دُھندلے چراغ
قہقہوں کی جوت سے جاگے ہوئے سینے کے داغ
خواب کی اس دُھند میں تنہا ہے عشقِ بے چراغ
برگِ گل کی طرح جادہ ہے نگاہِ یاس کا
شوق کی منزل میں گم ہے قافلہ احساس کا

تشنگی کی مے کدہ بردوش آنکھوں میں ہے لاگ
نرم کاجل کی لکیروں میں سلگتی تیز آگ
اک خیال و خواب کے گھونگھٹ میں دنیا کا سہاگ
پرچموں کی طرح کھلتی کاکلوں کی چھاؤں میں
اک جھجک ہے وقت کے اُٹھتے ہوئے سے پاؤں میں

موجِ صہبائے جنوں اک گرمیِ رگ ہائے تاک
کانپتا ہے نرم ہونٹوں میں وہ بوسوں کا تپاک
جن کے افسانوں سے ہیں بے نور راتیں تاب ناک
کس قدر صیدِ زبوں ہیں ، کس قدر صیّاد ہیں
اس سوادِ شوق میں کتنے غزال آباد ہیں

رات کے اندھے کنویں میں محو ہیں امروز و دوش
ڈھونڈتے ہیں آبِ تازہ صاحبانِ عقل و ہوش
فکر کی اُجڑی ہوئی بستی کے یہ خانہ بدوش
ہم نے یہ مانا کہ یہ راہِ بیاباں سخت ہے
آبِ تازہ زندگی ہے آب تازہ وقت ہے

حرفِ بے معنی ہوئی ہے علم و عرفاں کی کتاب
ہے خیال و خواب کی جولانیوں پہ سدِّ باب
روحِ پرویز و ہلاکو نے اُلٹ دی ہے نقاب
عشق کا سودائے سر بھی خام ہو جانے کو ہے
تیشۂ فرہاد تک نیلام ہو جانے کو ہے

زندگی کے دشت میں کس کو ہے یارائے سخن
کوئی لمحہ قافلہ سالار ، کوئی راہزن
رہ سپاری کا صلہ ہے گردِ رہ کا پیرہن
زندگی اک خواب منزل کا کفن بنتی ہوئی
ریگِ صحرا ، دامنوں میں ہڈیاں چنتی ہوئی

کب سے ہے غوغائے بے آہنگ انساں کی پکار
راستہ روکے کھڑی ہے ، کچھ بگولوں کی قطار
خوابِ منزل بے سپر ہے، تیرگی کرتی ہے وار
کوئی جرمِ زندگانی خواب اندر خواب ہے
ایک طوفاں ہے کہ جو گرداب در گرداب ہے

(۱۹۴۸ء)

دستِ حنائی تک

نہ پوچھ اے جانِ جاں آوارگانِ شوق کا احوال
نہ ان کا شوق واماندہ نہ تیری رہ گزر پامال
ہوائے ہجر بھی آتش اثر ہے درد بھی سیّال
نوا کو پردہ ہائے ساز میں خاموش رکّھا ہے
ابھی تک شعلۂ آواز کو رُوپوش رکّھا ہے

وہی اک موجِ درد اب تک وہی پابندیِ اوقات
وہی تاروں کی آسیبی ضیا میں ذی نفس ذرّات
سپر تک نیند کی دو نیم ہے وہ یورشِ لمحات
وہی بے خوابیاں پیوند ہیں شب کے دُھندلکوں میں
سوالوں کی طرح ہیں ساعتیں آویزاں پلکوں میں

وہی ہیں حاشیے پر شہر کے دو چار قندیلیں
اندھیرے کے فسوں سے نقش بر دیوار قندیلیں
شبِ تاریک کے بستر پہ یہ بیمار قندیلیں
پتنگوں کی جگر سوزی کو جو الزام دیتی ہیں
لگن کی خاک سے لیکن خراجِ نور لیتی ہیں

وہی زیتون کا روغن ہے پاپائی چراغوں میں
جہاں بینی کی مے ہے موج زن کہنہ ایاغوں میں
وہی قانون کے اہرام ہیں ویراں دماغوں میں
وہی زیر و زبر کی وسعتِ عالم سے اٹھتی ہیں
فصیلیں ، آج تک کچھ معنیِ مبہم سے اٹھتی ہیں

عبارت خوابِ گل کی جب کبھی، تحریر ہوتی ہے
وہ داناؤں کی فرہنگوں میں اک تقصیر ہوتی ہے
نوائے در گلو ، اک حلقۂ زنجیر ہوتی ہے
کہاں کی منزلیں جب جادہ تک زندانیوں میں ہے
سخن کیسا کہ حرفِ سادہ تک زندانیوں میں ہے

مگر دل ہے کہ اپنا آپ خود ہے داد رس اب تک
کسی آہنگ کی بنیاد ہے موجِ نفس اب تک
پکارے ہی چلی جاتی ہے آوازِ جرس اب تک
غبارِ رہ میں ہیں کچھ آبلہ پایانِ صحرا بھی
ابھی اک کاروانِ وقت پنہاں بھی ہے پیدا بھی

فضا کی رَو میں چہرے گم شدہ یاروں کے کھلتے ہیں
صبا چلتی ہے کتنے پھول دیواروں کے کھلتے ہیں
سیہ محضر میں اب تک رنگ رخساروں کے کھلتے ہیں
جو تیرے جسم کے اسلوب سے ہم اخذ کرتے ہیں
خیالوں سے وہ سایے صبح ہونے تک گزرتے ہیں

ترے ہجراں نصیبوں پر گراں یہ رات بھی کب ہے
چٹک اٹھتی ہیں کلیاں درد کی وہ نالۂ شب ہے
نہ پوچھ اے دوست کس منزل پہ دل کا قافلہ اب ہے
سحر کی لاگ ، چشمِ خوں فشاں تھی، نارسائی تک
پہنچنے ہی کو ہے دستِ جنوں، دستِ حنائی تک

(۱۹۵۴ء)

دشتِ امکاں

پہلی اشاعت: جون ۱۹۶۴ء

پچھلی جنگِ عظیم کی سفاک ہواؤں میں—— فرانس ایک خیمۂ پامال ہو کر رہ گیا تھا—— پھر بھی تہذیبی اقدار کی باقی قناتیں لوگوں کے کچھ نہ کچھ کام آ رہی تھیں—— یوں بھی آدمی کی تقدیر ہے کہ اس کے حصے کی گویائی کسی سے رُکتی ہے، نہ اس کے حصے کی زندگی—— اس وقت فرانس کی رات کہتی تھی کہ میں تیری زمینوں پر چاند گہن کی رات ہوں، لیکن اس کی روح کہتی تھی—— کہ دلوں کی رزم گاہ سے—— نیک و بد کی پیکار میں—— مجھے مقامِ اعتبار سے کوئی نہیں ہٹا سکتا—— ایسے دکھ میں فرانس کے شیریں کلام شاعر پال ایلواگ نے آزادی پر چند ابیات لکھیں، اس نے لکھا کہ میں نے تیرا نام—— مکتب کی کاپی بستے پر، سایوں میں پنہاں، یک جان یک قالب سایوں پر—— شہرِ تعجب کی گلیوں میں، جاں بازوں کی تیغ و سپر پر—— تجدیدِ پیاں اور مرگِ انساں کی رُت میں لکھا ہے—— ہم ایشیائی ایسی چیزوں کی چبھن اپنے سینے میں رکھتے ہیں—— میں اس کتاب کو ان چند ابیات سے معنون کرتا ہوں——

با ایں بہانہ دریں بزمِ محرمے جویم
غزل سوائم و پیغام آشنا گویم

در کوزۂ لذت شکناں چشمۂ زہرم
در کاسۂ کودک منشاں جرعۂ شیرم

در خانۂ مجنوں کہ خراب است غبارم
در حجلۂ لیلیٰ کہ بہشت است عبیرم

— عرفیؔ

فہرست

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک

۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۲ء تک

○○○

دانشِ حاضر کے سواد میں

ادب زندگی کے اضطراب کی ایک صورت ہوتا ہے۔ اس کی نبضِ تیز میں آدمی کے مزاج کی استواری، برہمی، خوئے ہم نفسی کی جھیل سے نکلتی ہوئی کوئی خاموش ندی، کسی چھپی ہوئی شارک کے تیز خنجر سی بہتی ہوئی غم و غصے کی رو مواج رہتی ہے۔ ہر دور میں تہذیب و ثقافت کے نیک و بد کو، سیاہ و سفید کو، ساز کے پردوں میں کوئی آہنگ، حرفوں کی اوٹ میں کوئی موجِ نفس الٹتی پلٹتی رہتی ہے۔ ادب کی یہ خوئے سینہ شگافی بہت پرانی ہے۔ دورِ جدید میں بعض لوگوں کے لیے یہ دل آزاری کا باعث ہوگئی ہے۔ مگر یہ ملال بے وجہ ہے۔ آج کی دنیا میں ادب سے الگ بھی آدمی کے مزاج کے لازمی عناصر، تجزیہ، تجربہ اور تلاش ہوگئے ہیں۔ ساری فضا ایک اندرونی پیکار میں مبتلا ہے۔ ایسے ماحول میں سوچنا ضرور چاہیے کہ آدمی کن راستوں سے گزر رہا ہے اور اس کی منزل کیا ہے۔ کچھ نکتہ دانوں نے یہ بھی سمجھایا ہے کہ سفر خود اتنا اہم ہے کہ منزل سے بے نیاز ہوکر چلنا بھی بہت بڑا کام ہے۔ ایک بے قیام رفتار کے علاوہ زندگی ہے بھی کیا۔ اسی رفتار کی رو میں اندھیرے اُجالے کی گردشوں میں آدمی نے وقت کے آثار سمجھے، اسی میں اس نے اوزار بنائے، مکان تعمیر کیے، محبتیں کیں، کتابیں لکھیں۔ زندگی کی رفتار کے یہی پیمانے ہیں۔ ایک دور سے

دوسرے دور میں منتقل ہونے والی زندگی کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ وہ لباس کی نئی تراش، زبان کے نئے مفہوم، فکر کے تازہ سواد تلاش کرتی رہتی ہے۔ اسی تلاش کو ادب اپنی روح سمجھتا ہے۔ اس کے اشارے، استعارے، علامتیں، روایات سے ملحق ہوکر بھی ایک نئے یا الگ معنی میں سامنے آتی ہیں۔ اس صدی کے ادب میں، انسانی روح کے اضطراب کی وہ حیرت انگیز تازہ شکلیں ملتی ہیں جو خود ادب کے طالبِ علم سے ایک عمر کے مطالعے کی طالب ہیں، اس لیے ادب کو اخبار، رسالے یا اشتہار کی حیثیت سے نہیں پڑھنا چاہیے۔ معاشرے کا دکھ سکھ، سطحی روزنامچے کی چیز نہیں ہوتا، یہ تو آدمی کی حکایتِ خونچکاں ہے۔

وقت، تغیر، زندگی، انھیں دائروں میں انسان کی کتنی ہی منزلیں آئیں، کتنی ہی گردِ راہ ہوگئیں۔ تقویم کے لحاظ سے بھی حال و آئندہ کی سمتیں ارتقا کی علامتیں ہیں۔ ہر چند کہ عام آدمی کو دیکھیے تو آج بھی گھریلو، نجی، ذاتی زندگی میں زہرہ گداز مایوسیاں ہیں، خوف ہے، بے نامی ہے، ہراس ہے، اکتاہٹ ہے۔ آدمی اپنی ہی یادوں کا ایک کباڑی معلوم ہوتا ہے۔ مگر معاشرہ کل سے زیادہ تنظیم شدہ، شعوری حساب داں اور انصاف پسند ہے۔ آج گزشتہ ادوار کے مقابل ضرور کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوتی ہوگی جو بے اعتدالی میں، تاریکی میں، شکست میں بھی انسان کو سنبھال لیتی ہے۔ یہ دور یوں بھی ہزاروں ہاتھوں کی طاقتوں کا دور ہے، ہزار شعبوں کی کاوشیں ان کے تعمیری پہلو، ان کا اثر انسانی ذہن کو انفعالیت کے سفاک حملوں میں ایک سپر ہے۔ آس پاس کی فضا، دور کے دائرے، گھر، خاندان، وطن، بین قومی شعور، سیاسی اور نامیاتی زندگی عافیت کی طرف رُخ کیے ہوئے ہے، یہ بھی مانا کہ ان حدوں میں بھی کشت و خون کے ہنگامے ہوجاتے ہیں، سود و زیاں کی گھاتیں ہوتی ہیں، خطِ فاصل کھینچے جاتے ہیں، مٹائے جاتے ہیں۔ کبھی سیاسی آدمی کے تصور پر توجہ دی جاتی ہے، کبھی اقتصادی آدمی کا فریب دیر تک جاری رہتا ہے۔ آج دنیا متضاد کیفیات کی ایک رزم گاہ ہوگئی ہے، چھوٹی چھوٹی ضرورتوں سے جو ایک لکھنے والے کے لیے بادامی کاغذ، روشنائی، دو گز سکون کی زمین سے شروع ہوکر اس کی ذہنی تربیت اور اُس کے پاس کی تہذیب تک جاتی ہے۔ ماحول ہزاروں سدِباب، ہزاروں دروازوں کی ایک بھول

بھلیاں ہوگیا ہے۔ سادگی، سلجھی ہوئی زندگی، استوار قدریں، سراب کی طرح گردانی جاتی ہیں۔ ان مرحلوں میں پیٹ پر پتھر باندھ کر، سفید پوشی کا اعتبار رکھ کر، دنیا کے ادیبوں نے لکھا اور اکثر و بیشتر نے یہی لکھا ہے کہ آدمی بڑا ہوتا ہے۔ زندگی ارتقا کی طرف جا رہی ہے۔ تہذیبیں جنگ و جدل سے، بے اعتنائی سے، تخریبی تساہل و کاہلی سے مٹ جاتی ہیں۔ مفکرین نے اسی راستے کو اختیار کیا۔ سائنس کی دنیا میں کام کرنے والوں نے اسی ارتقا کی شہادت دی۔ ایجاد و تخلیق نے اسی کا ثبوت دیا۔ آج راکٹ ہے جو چاند کے سینے کا داغ تلاش کر رہا ہے، آج کوبیلٹ ریز ہیں جو سرطان کی ناگ پھنی کو بیماریوں کے جنگل سے مٹا رہی ہیں، آج حبشی نژاد فریادی دنیا کے سامنے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ دکھا سکتا ہے، آج نابینا بچے اپنی انگلیوں کی جنبشوں سے حرف و معنی کے جادہ شناس ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بھی ایک ترقی ہے۔ انسان کی عملی زندگی نااستوار ذہنوں کو تاریک کھائیوں میں گرا سکتی ہے۔ مگر ذرا سنبھلا ہوا ذہن سفید و سیاہ میں امتیاز کرسکتا ہے۔ شاعری میں معاشرے سے ہٹ کر جو اجنبی فضا ہوتی ہے تو اس کی وجہ خالص یہ ہے کہ شاعر وقت کے پہیے کی تیز گردش کو ایک ہی نظر میں دیکھ لیتا ہے۔ یہ نگاہ کا زیاں دل کے لیے ہزار سود ہے، اس تیز گردش کو تغیر بھی کہتے ہیں جو زندگی کی تقدیر ہے۔ تغیر انسانی معاشرے کی دیومالا کی اَن مٹ علامت ہے۔ اس کا نام ابر و باد بھی ہوسکتا ہے، قطب نما بھی ہوسکتا ہے، راڈار بھی ہوسکتا ہے۔ علامتیں انسانی ذہن کی تخلیق ہیں، وہ اپنے خالق سے متعلق ہوتی ہیں اور اسی کے تابع ہوتی ہیں۔ ارتقا یا ارتقا کے شعور سے مذاق نہیں کرنا چاہیے، یہ بھی ایک مفکر کا قول ہے کہ ارتقا تیز دھار کے چاقو کا پھل ہے۔ بہرکیف جو چیزیں سامنے آ رہی ہیں، وہ انسان کی مجبوریوں کو کم کرتی جا رہی ہیں۔ مہلک بے حسی کے آثار کا یوں کافور ہوجانا اس بات کی دلیل ہے کہ نہ انسانی ذہن تھکا ہے، نہ معاشرہ تجربوں سے خائف ہے۔ ان سب ہنگاموں کے درمیان شاعر بھی ہوتا ہے اور اس کے صریرِ خامہ سے الجھی ہوئی ہزاروں آوازیں ہوتی ہیں۔

بات یہ ہے کہ اس صدی کے ادب کو ایک نہایت آسیب زدہ سائبان رات بسر کرنے کو ملا ہے۔ اس سائبان کے نیچے سائنس بھی ہے، ٹیکنولوجی بھی ہے، دنیا کی آفتیں

بھی ہیں، دلوں کے درد بھی ہیں۔ تاریخ و تغیر کے اس عظیم سواد سے گھر کی طرف لوٹیے بھی تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے جدید ادب کی روح بہت آشفتہ حال ہے، مجروح پرندے کی سی آواز آتی ہے جو دُھویں میں گھر گیا ہے۔ سکون کے دو حرف کوئی آہستہ خرام لے کوئی خواب آور آہنگ اس میں نہیں ملتا۔ ظاہر و باطن میں جدید فکر ایک سیلِ بے کراں ہے۔ اس سیل میں سیاسی، نفسیاتی، جنسی، علامتی، غیر علامتی، بلاخیز موجوں کا دیوانہ پن ہے۔ کھلے خزانے یہ سیلِ بے کراں اپنی ضدی منہ زور سرکش دھاروں کی رو میں عہدِ پیشیں کے بسائے ہوئے شہر بہا لے گیا۔ جب اس سیل کی ایک گردش پوری ہوگئی تو شعور و وجدان نے ایک نئے اضطراب میں ڈھلنا شروع کیا۔ یہ اضطراب ہنوز ایک ناآفریدہ جنگ اور کچے امن کے درمیان معلق برزخ میں پل رہا ہے۔ انسان کی ہمت، جستجو، کامیابی، محبت اور آرزو کی سبدِ گل ایک اتفاقی حادثے کی بے مایہ چنگاری سے بھی جل سکتی ہے۔ آج آدمی سوچ رہا ہے کہ اس کا معاشرہ یہ جیتی جاگتی ہزار شیوہ دنیا، اس کی ذات، خود وجود، وقتِ بے کنار کے سوادِ پیدائی میں کوئی مفہوم بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر عافیت و اعتبارِ زندگی کی تمام صفات اضافی ہیں تو ان کا علاقہ کن قدروں سے ہے؟ اگر زندگی اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے کسی منفی جادے کی تلاش میں ہے تو وہ کیا ہوگا؟ شعر و ادب میں زندگی کا یہ اضطراب، کبھی ایک سوال کی صورت میں، کبھی ایک طلسمِ پیچ و تاب کی حیثیت سے نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ کبھی گویائی نوحۂ جاں کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ کبھی سکوت ضبطِ سرتابی کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔ جدید ادب میں بھی دل کی اداسی ٹوٹ کر برسی ہے۔ اُمید کے نحیف دیے کو وہی دل کی پرانی سرایے کا عاجز طاق ملا ہے۔

سچ پوچھیے تو نئے ادب کے اُٹھائے ہوئے سوالات اتنے الگ، ان کے متعلقات اتنے پیچیدہ، ان کی زبان اتنی اجنبی ہے کہ وہ اپنے مفہوم کی پوری ادائیگی کے لیے ایک نیا شعور یا تاریخ کا ایک نیا رویہ چاہتی ہے۔ بیس ویں صدی عیسوی سخن گسترانہ باتوں کی صدی ہے۔ بیاباں کی تاریکی میں اس کا کنجِ فکر الگ، اس کے خضر الگ، اس کے آبِ بقا کی تاثیر الگ ہے۔ اس صدی میں جو کچھ سوچا گیا ہے، وہ عہدِ پیشین سے سوائے ایک

مفکرانہ ربط کے یا مقابل رویے کے اور کوئی دوسرا تعلق ہی نہیں رکھتا۔ آج کا آدمی نیا ہے، اس کے آداب و اطوار، اس کی تعلیم و تربیت، اس کی تہذیب و ثقافت کا راستہ جدا ہے۔ ہر زمانۂ حال کے الگ وجود کو عارف و عامی روحِ عصر بھی کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ لوگ جن کی فکر نے زندگی کو نئے پیمانے دیے ہیں، علم کے ایسے شعبوں سے متعلق تھے جو روزانہ زندگی کے برتاؤ میں میز یا کرسی یا چائے کی پیالی کی طرح نہیں آتے۔ آج کے ادب کی سرحدیں جن رقیبوں اور حریفوں کی سرحدوں سے مل رہی ہیں، وہاں ایک بہت گہری دُھند چھائی ہوئی ہے۔ اس گہری دُھند میں زندگی کی تلاشِ ہزار شیوہ جاری ہے۔ اس دُھند میں بسنے والے علم و ایجاد کے لوگ ہیں، برسوں ان کا کام سامنے نہیں آتا۔ مگر جب ان کی جستجو کسی ایک منزل پر پہنچ جاتی ہے تو معاشرے میں، تہذیب میں، زندگی کے سیاسی اور سماجی تصور میں ایک حیرت انگیز تغیر آجاتا ہے۔ یہ دور اسی عظیم تغیر کا دور ہے چوں کہ اس دور کی اکثر و بیشتر خارجی علامتیں مغربی ہیں، اس لیے بعض لوگ ساری جدید فکر کو خالص مغربی بھی کہتے ہیں۔ قاعدہ یہی ہے کہ جب سیاسی طاقتیں اپنا لوہا منوا لیتی ہیں تو انھیں کا سکّہ اور اُنھیں کی مہر سند سمجھی جاتی ہے، ویسے جدید فکر میں مشرقی کاموں کی کتنی ہی شاخیں جا کر ملی ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس بین قومی شعوری سائنٹفک دور میں جغرافیائی حدود میں سمٹ کر رہ جانا ایک جرم ہے۔ یہ تنگ دلی انسان کی تباہی اور ہلاکت کا باعث ہوسکتی ہے۔ سائنس اور ٹیکنولوجی نے اپنا منتر کسی اونچی گوت کے برہمن کے لیے مخصوص نہیں کیا۔ سائنس نے کسی ایک قبیلے کی فرمائش پوری نہیں کی۔ اس میدان میں چھیڑ خوباں سے چلی جائے والی کاوش کچھ نہ کچھ ہمارے یہاں بھی ہوتی ہی رہی ہے۔ ذہنِ انسانی نہ جانے کتنے موڑ کاٹ کر اس منزل پر پہنچا ہے۔

معاشرے کے ایک نہایت سنجیدہ روشن قیاس مفکر نے اس منزل کو جسے ہم سائنٹفک عہد کہتے ہیں، اپنی کتاب Golden Bough کے آخری باب میں خوب سمجھایا ہے۔ یہ کتاب علمِ انسانیات پر ہے۔ فریزر (Fraser) کہتا ہے کہ زندگی اپنے خوابوں کی تعمیر و تسکین کے لیے نہایت نرم و نازک جال بُنا کرتی ہے تاکہ انسانی ذہن اپنی تنہائی میں

اپنے سے بلند تر خیال کا سہارا لے سکے۔ اوّلین دور میں یہ تارِ عنکبوت اہرامی سیاہیوں کی تاریکی لیے ہوئے، ایک سیاہ ڈور تھی، یہ مارِ سیاہ کی سی ڈور پیچ در پیچ بڑی دور تک جاتی ہے۔ اسے علمِ انسانیات کے ماہر جادو کے عہد سے تعبیر کرتے ہیں۔ جادو کے عہد میں اساطیر، علم الاصنام، افسوں، طلسم نے کچھ قدریں، کچھ اشارے، کچھ مفہوم بنا رکھے تھے جو زندگی کی تعبیر کے کام آتے تھے۔ اس سیاہ ڈور پر ایک اور گرہ لگا کر سرخ ڈور شروع ہوتی ہے۔ یہ ڈور مذہب کی ہے۔ مذاہبِ عالم نے تہذیب و ثقافت کو تاریخ کی دوسری منزل پر بڑا سہارا دیا ہے۔ زندگی کی ساری فضا پر اب بھی کہیں کہیں سرخ و سیاہ ڈور کا جال نظر آتا ہے جہاں یہ دونوں رنگ ختم ہوتے ہیں، وہیں سے ایک نہایت نرم و نازک دودھیائی دوشیزہ دھاگا آگہی و ادراک کی علامت بن کر آگے چلتا ہے۔ یہ دور اسی دودھیائی دوشیزہ سفید تار کے جال کا دور ہے۔ اس دور سے معلومات، خبر، تجربات، حقیقت کی پرکھ کے دائروں میں آگہی و ادراک کا مقفل دروازہ کھل رہا ہے۔ اس دور تک ہمیں کون لے کر آیا تھا، طلسم و افسوں کی تاریکی کو کس نے مٹا دیا، مذہب و دین کی کاوشوں کو احترام کا سجدہ کر کے کون آگے بڑھ گیا، یہ بھی کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ خیر تو یہ جدید فکر اندر سے تہذیبوں کو بدل چکی ہے۔ اس نے معاشرے کے پرانے اصول رد کر دیے۔ کئی چیزیں جنھیں ممنوعات میں داخل کر دیا گیا تھا، سامنے کھڑے ہو کر سوال کر رہی ہیں۔ اور جو کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، ایک بات تو یقین کی حد تک آگئی ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف تقاضے محض پیچیدہ سوالات کے انتشار میں کھو کر نہیں رہ سکتے۔

ادیب روحِ عصر کی پیچیدگیوں کو سمجھتا ہے مگر ادیب ماہرِ نفسیات نہیں ہوتا، سیاسی مفکر نہیں ہوتا، رہبر و صوفی نہیں ہوتا، وہ زندگی کی مایوسیوں کو اس کی سرخوشی، اس کے پیچ و تاب کو ایک اپنی زندگی کا حصہ سمجھ کر دبی دبی زبان میں کچھ نہ کچھ کہتا رہتا ہے۔ ''یہ کچھ کہہ جانے'' کی مجبوری اس کا مقدر ہے، اس کی یہ سزا بھی ہے اور جزا بھی۔ شعر میں سب سے گہرے دکھ اور سب سے گہری سرخوشی کا انکشاف ہوتا ہے، انکشاف اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ — دل کی زرخیز مٹی میں پڑے ہوئے کس بیج سے پھوٹتی ہوئی شاخِ گل سے

شاعر کے سر کا تاج بھی بنتا ہے اور اس کے کفن کی چادر بھی۔

جدید فکر، شعر و ادب میں مختلف تشبیہوں، مختلف استعاروں اور علامتوں کے ساتھ آئی ہے، یہ جدید فکر کوئی ایک دن کا کام نہیں ہے۔ انیس ویں صدی کے سخت گیر نظام نے جب اپنا وقت پورا کرلیا اور اس کا شیرازہ منتشر ہونے لگا تو زندگی کے مختلف شعبوں کو ایک عظیم فکری انقلاب نے متأثر کرنا شروع کیا۔ پارینہ مسلمات پارہ پارہ ہوگئے۔ بنیادی قصہ سرشتِ زندگی کی تعبیر کا تھا۔ ان سیاسی و سماجی رجحانات کے علاوہ جنھوں نے پورے معاشرے کو تبدیل کردیا۔ جس فکری انقلاب نے دانشِ حاضر کو ایک اپنا نام دیا ہے، وہ بھی سائنس کی دنیا سے متعلق تھا۔ حاصلِ فکر یہ تھا کہ مادے کے بجائے توانائی اصلِ حیات ہے، یہ زندگی کی علتِ غائی ہے اور کائنات کی حقیقتِ کبریٰ ہے۔ مادے کو توانائی میں تبدیل کردینا، ہر چند دور کی بات تھی مگر اس نظریے نے مادے کے پرانے تصور اور اس کے تحفظ کے اصولوں پر ضرب لگائی۔ دریافت کرنے والوں نے دریافت کیا کہ توانائی کا بہاؤ کسی یکساں جزر و مد کی سی کیفیت سے نہیں ہوتا بلکہ وہ ذرّاتِ جوہر سے فوارے کی دھاروں کی طرح اُچھل پڑتی ہے۔ جوہر ہماری صدی کا نوزائیدہ بچہ ایسی بال ہٹ لے کر پیدا ہوا ہے کہ خود ماہرِ طبیعیات کے قابو میں نہیں آ رہا ہے۔ اب تو اس ایک ذرّۂ جوہر میں پورا نظامِ شمسی بسا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مختلف ماہرینِ طبیعیات کے انکشاف نے جہاں فطرت کے رازوں کو ٹٹولا ہے، وہاں معاشرے کے لیے کچھ الجھنیں بھی پیدا ہوگئیں۔ آئن اسٹائن، پیڈ اور پنسل لے کر مساوات کے معصوم ٹکڑے لکھ گیا تھا۔ مگر وہ خود بھی اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ اس کی تخلیقی فکر سے دنیا میں کیا عظیم تغیر ہونے والا ہے۔ کتابت میں یہ مساوات کہ الف = ب ج^2 $E = MC^2$ کس قدر آسان ہے مگر اس کی عملی صورت ہیروشیما کی تباہی کا باعث ہوئی۔ یہیں سے جدید دنیا میں سیاسی فکر کی حد شروع ہوجاتی ہے کہ آخر کون سا نظام ہوگا جس میں تخلیق و جستجو کی کاوشوں کو ہلاکت کا آلۂ کار نہیں بنایا جائے گا، کیا کوئی فرد محض ایک صفر مقام پر صفر رقم سے ایک صفرِ مقصد کے لیے دنیا کے لوگوں سے بے نیاز ہوکر تخلیق و ایجاد کو اپنے مفاد کے لیے مخصوص کرسکتا ہے؟ جوہری ذرّات کی طاقت سے لے

کر سیاسی تصورات کے بنیادی اصولوں تک انسان کی فکر کا میدان ہے۔ کبھی فکر ایک تاریک گوشے سے چل کر خانہ بہ خانہ تجزیہ کرتی ہوئی ایک تازہ اُفق کی نئی روشنی کو چھوتی ہے، کبھی نردبان سے پھسل کر کسی ایسی کھائی میں گر جاتی ہے جسے کسی کرین (Crane) کے سہارے بھی نہیں نکالا جاسکتا۔ آج ہر شعبے کی فکر ہر دوسرے شعبے سے مل رہی ہے۔ یہ سب تغیرات آدمی پر جو تہذیب کی کلیت کا مظہر ہے، اثر انداز ہو رہے ہیں، اس کے معاشرے میں خوف و ہراس کے انداز پیدا کر رہے ہیں۔ ادب بھی زندگی کے انھیں چشموں سے سیراب ہوتا ہے۔ جب یہ چشمے زہر آلودہ ہونے لگتے ہیں تو ادب کے ہونٹوں پر بھی نیل نمودار ہو جاتا ہے۔

آگہی لازمۂ وجود ہے۔ حیاتی یا فکری دائرے میں منتقل ہوتے ہوئے جذبات کو دماغ مختلف صورتوں میں ڈھال لیتا ہے۔ یہ اس کی کیمیائی خصوصیت ہے۔ اسی طرح تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کی آگہی معاشرے کے وجود، اس کی ترتیب و تنظیم کے نظام کو سمجھ لیتی ہے۔ سائنس کا وہ دودھیائی تار جو ذہنِ انسانی کی آگہی کی علامت بن کر نرم و نازک جال بُن رہا ہے، صرف ایسے معاشرے میں پنپ سکتا ہے جہاں زہریلا دُھواں اسے کثیف نہ کر سکے۔ اس دور میں فضا کو روشن اور صاف رکھنا سیاست، حکومت اور تدبرِ ریاست کا کام ہے، آئینِ جہاں بانی کا موضوع ہے۔ اس سواد میں سر بہ کف پہنچ کر دوسروں کو ٹوکنا بھی بڑے جیالے اور دلیر مفکرین کے بس کا روگ ہے۔ فکر کی اس شاخ سے شعر و ادب، آرٹ، موسیقی، فنونِ لطیفہ کے چھوٹے بڑے منجھولے شعبوں سے کوئی تعلق بھی نہیں ہے مگر شاعر، ادیب، مصور اور موسیقار اس فضا کے اندھیرے اجالے کو اپنے خون کی گردش میں حل ہوتا ہوا پا رہا ہے۔ اس کی بینائی اور بینش کے راستے میں گہن کی ساعتیں آرہی ہیں اور یہ ساری چیزیں بغیر کسی شعوری کوشش کے، اس کے شعور کا ایک جزوِ لاینفک بن رہی ہیں۔ جدید فکر کی فضا سائنس اور ٹیکنولوجی کی دنیا اور شعر و ادب کا ماحول کوئی الگ چیزیں نہیں رہ گئی ہیں۔ شعری وجدان میں اتنی سکت ہونی چاہیے کہ وہ ان چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ سکے۔ ادب کی یہ ہمہ گیری اور وسعت کوئی نئی بات بھی نہیں ہے۔ شعر و مصوری کے

علاوہ دوسرے علوم کی آگہی لیونارڈو ڈاونشی یا گوئٹے کے لیے اجنبی نہیں تھیں، فردوسی نے پوری سلیح جنگ کے ادراک کے بعد رزم گاہوں میں پیکار کا نقشہ کھینچا ہے۔ تصوف کی بے شمار اصطلاحیں جسم کی ساخت اور علمِ طب سے ماخوذ ہیں۔ اردو کے قصائد میں نظام سیارگاں کا ادراک بنیائے کواکب کی زبان سے کچھ اتنا الگ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ جب تہذیبیں کسی نقطۂ عروج پر پہنچ کر بالغ ہوجاتی ہیں تو اس کے مختلف دائروں میں آباد روحیں ایک دوسرے سے محرمانہ ہم نفسی کی خواہاں ہوتی ہیں۔ اس لیے شاعر کے وجدان کو ایک ماہرِ نفسیات کے وجدان سے بالکل بیگانہ سمجھنا غلط ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ عائد کرنا چشمِ بینا کی نفی کرنا ہے۔ البتہ یہ بڑی حد تک درست ہے کہ ان روحوں کا اندازِ خرام الگ الگ ہے۔

شعری وجدان اپنے وسیلۂ اظہار کے لیے ایک صورت، ایک ہیئت، ایک شکل، ایک تصور کا محتاج ہے۔ اس سے باہر اگر اس کی دنیا ہوتی بھی ہے تو ادیب کی حیاتی زندگی کا وہ حصہ ہوتی ہے جو اس کے جذبات کے سکوتِ پردہ دار میں ایک ابدی نیند سوتا رہتا ہے۔ اس کو جگانا فتنۂ قیامت کو جگانا ہے۔ شعر کی وہ ظاہری شکل جو الفاظ، محاورے، تشبیہ، استعارے، علامت اور امیج سے بنتی ہے، معاشرے کا وہ سرمایہ ہے جو ذرا سی الٹی سیدھی تاجرانہ چالاکی سے خلّاقانہ فن کاری تک صرف میں آتا رہتا ہے۔ جدید ادب میں یہ سرمایہ کہاں اور کس طرح لگا ہے یا وہ بدنصیب جو اسے خلّاقانہ طریقے سے استعمال کرنے کی سعی میں کھپ ہوجاتے ہیں، ان چیزوں کو کیونکر برتتے ہیں۔ ادب کی ایک چوتھائی تاریخ اسی کی داستان ہے۔ آج تو آنکھیں یہ بھی دیکھ رہی ہیں کہ روحِ سخن اور پیرایۂ سخن اپنے مرکزِ اتصال سے ہٹتے جارہے ہیں۔ پہلے اصنافِ سخن کے مختلف پیرایے ایک اپنی کشش رکھتے تھے، عبارت وانشا کے مستند اور آشنا قواعد تھے۔ کچھ طغرا نویسی کے آداب کی طرح رٹے ہوئے الفاظ کے خوب صورت زاویوں سے عبارت کی ایک چوکھٹ بن جاتی تھی۔ مگر آج شاعری، روح و ادراک کا بہترین اتّصال ہوتے ہوئے بھی جیسے کسی مجذوب کی بڑ ہوتی جارہی ہے۔ لوگوں نے اسے نظامِ حواس کا کوئی ایسا قطعہ قرار دیا ہے جو سارے آدابِ تحریر سے

بے نیاز ہو۔ الہامی کیفیات کا یہ رمز کہ شاعری وجدان کی وہ اَن دیکھی رتیاں ہیں جو خاص ذہنوں کا وزن بڑھا دیتی ہے، یہ سمجھنا بھی کچھ مشکل نہ تھا، اگر اس کا کوئی ثبوت ہوتا۔ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ شعر کی کوئی آشنا ہیئت مختلف اصنافِ سخن میں ہو ہی نہیں سکتی، شعری وجدان ابیات کے خول کو توڑ کر آہنگ کے گردابوں میں تصور کے برق پاروں میں شش جہت میں بہنے لگتا ہے۔ ہر دور میں جب تغیر پارینہ اصولوں کی نفی کرتا ہے تو سخن آشنا کی خیانت کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اس لیے بڑے ادیب زبان و بیاں کے اسالیب میں مختلف راہیں نکالنے کے بعد بھی اجداد کا نام اپنے شجرۂ نسب سے نہیں کاٹ سکتے۔ تبدیلیِ ہیئت کو، شاعری کے اندرونی آہنگ کو، صوتی تناسب کو، الفاظ کے درست برتاؤ کو، تلفظ کے صحیح مخرج کو، جو موسیقی کی تعلیم کا ایک حصہ ہے، ہرگز مجروح نہیں کیا جاسکتا۔ شعر کا وہ بنیادی عنصر جو صاحبانِ ذوق کو اپنی طرف کھینچتا ہے، حافظ، غالب، اقبال کے کلام سے ہم آہنگ کرتا ہے — کسی بکھرے ہوئے مجہول، ساقط اسلوب پر کس طرح ختم کیا جاسکتا ہے، بلکہ نئے شعری محاورے کی اجنبیت خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی تخلیق کا ضامن معاشرے کا بطن ہے اور وہ اس بطن کی تاریخ سے الگ نہیں ہے۔

شعر ایک نوع کی سرتابی ہے۔ ازسرِ نو احساس و فکر کی دنیا میں ایک نئی تلاش ہے۔ وہ اس موڑ کو کاٹ کر گزرتا ہے جو اجداد سے رہ گیا تھا۔ وہ چیزوں کو بالکل بے نقاب اپنی معصوم اصلیت میں دیکھنے کی سعی ہے۔ اس لیے اس کا اجنبی ہونا لازمی ہے، مگر اس میں ''غریبِ شہر سخن ہائے گفتی دارد'' والی اجنبیت ہونی چاہیے۔ شاعری عافیت کی بدترین دشمن ہوتی ہے۔ ذاتی عافیت کی بھی اور معاشرے کی قبول شدہ روایتی عافیت کی بھی۔ آدمی نے جو گھروندے بنا رکھے ہیں، جہاں صندلی کے کنارے لحافوں کی نرمیوں میں سکون کے لمحات بسر ہو جاتے ہیں۔ ان بستیوں میں جہاں روایت و اخلاق اور چوبِ عسس پاسبانی کرتے ہیں۔ جہاں دن کے اجالے میں اس کے خوابوں کی پریاں آسمان سے نہیں اُترتیں۔ ان تمام بستیوں میں جہاں زندگی کا سارا برگ و ساز ضروریاتِ ہوس کے لیے صرف ہوتا ہے، جہاں نگہبانوں کی تحویل میں آزادی کی پابند راہیں نکلتی ہیں۔ ان روایتی

حصاروں میں جنھیں آدمی زندگی کی حقیقتِ کبریٰ سمجھتا ہے، کسی شاعر کے ساز کی آواز دوسروں کی نیندیں حرام کرسکتی ہے۔ آدمی شہریت قبول کرنے کے اوّلین دور میں شکست و ریخت کے عجیب دورِ براہمی سے گزرتا ہے۔ اس کا شک، اس کی بدگمانی، اس کا سوال کرلینا، اس کا انکار، ایک تخریبی عمل ہے۔ اس لیے دنیا کے بڑے دانش وروں نے اسے بستی میں قدم رکھنے سے منع کیا ہے۔ برہمی اس کے مزاج کا فطری فعل ہے۔ مگر تہذیب نیک و بد کے قوانین میں، معاشرہ اپنی تنظیم و عافیت میں ایک اکتسابی عمل ہے۔ اس کی بستگی خیر کی حامل ہے۔ اس دائرے میں قدم رکھتے ہی اس کے پردۂ ساز میں چھپے ہوئے آہنگ سے زمانۂ حال کے پُرآشوب ماحول کا دکھ برس پڑتا ہے۔ اس کے ساز کی آواز آدمی کے اندر چھپی ہوئی روحِ سرکشی کو بیدار کردیتی ہے۔ وہ درد کے منازل کس طرح طے کرتا ہے، دنیا کو ایک خواب کی سرخوشی تک کس طرح پہنچاتا ہے، اس کا آہنگ کن کانوں تک ''افسونِ انتظارِ تمنا کہیں جسے'' والی فضا پیدا کرتا ہے۔ کس پر اس کی آواز گراں ہوتی ہے؟ یہ کس کو خبر ہے۔ مگر حرف و آہنگ کا یہ شعبدہ ہے کہ وہ داشتۂ ہر لب اور آوازۂ ہر گوش ہو جاتی ہے، اس کے ساز کی آواز پر کبھی شکستہ پا مسافروں کے گروہ اس کے گرد جمع ہوجاتے ہیں، کبھی کسی دانائے راز کا سایہ اس کے ساز پر پڑتا ہے، کبھی رات کی نیم تاریکی میں کوئی مہوش لڑکی نانِ جویں اور کوزۂ آب پہنچانے کے بہانے اس کے زمزموں کو آنسوؤں کی سلکِ گہربار دے جاتی ہے:

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

ایک ایسے دور میں جب سائنس روشنی کی رفتار کے ہم قدم ہونے کی سعی میں ہے، جب فلسفہ خود سائنس کی قدروں کی روشنی میں اپنی اصطلاحوں کو بدلنے کی فکر میں ہے، جب صنعتی ماحول زندگی کو اپنے اصولوں کی پابندی کا اسیر کرنے کو ہے، شاعر کا کام زمانۂ حال کے اضطراب کو، زندگی کے کیف و کم کو، ایک دوام دینے کا رہ گیا ہے۔ ایک غیر منطقی فضا کے فطری فعل سے ایک ہوش و گوش کی دنیا تک، ایک خیال سے ایک دائرۂ عمل تک پہنچنے

میں شاعر نے اپنی روح کا کرب بڑھا لیا ہے۔ یہ حجم بڑھ کر اس کے قد و قامت کی مناسبت سے کیا کچھ کرے گا، یہ کون کہہ سکتا ہے۔ شاعر کی دنیا شعوری بھی ہے اور نامعلوم بھی۔ فردا یا غمِ فردا اس ابدی حال میں گرفتار ہیں۔ مختلف سمتوں کی موجِ دود بدلتے ہوئے افق کی روشنی، مختلف دائروں کا رنگ اس کی طرف رخ کیے ہوئے ہے۔ آج کے شاعر کے احساسات و جذبات کو، وجدان و فکر کو روزانہ کی مزدوری سے لے کر خوابِ ہم کناری تک کی تمام منزلیں ایک جیتی جاگتی دنیا میں گزارنی پڑتی ہیں، اس لیے وہ خود غرض ہو کر کوئی الگ شہریت کے اصول نہیں بنا سکتا۔ جدید فکر نے ان فاصلوں کو جو آدمی اور آدمی کے درمیان تھے، مٹانے کی کوشش کی ہے۔ زندگی کی مختلف کیفیتوں اور جذبوں کو اب شاعر صرف اپنے لیے مخصوص نہیں کر سکتا۔ زندگی کی غم خواری اس کی شدتِ احساس دوسرے شعبوں میں بھی اتنی ہی ہے جتنی شاعری میں ہے۔ میڈیکل سائنس میں، انجینئرنگ میں، پلاننگ میں وہ محبت اور خلوص جو صرف شاعر کے محاورے تک محدود تھے، اپنا تجربہ پورا کر رہے ہیں۔ اس لیے شاعر کی منزلِ دید اور آگہی کو اور بھی منزلیں مل رہی ہیں۔ ''وسعتِ بیاں'' کے لیے اس صدی میں کیا کچھ نہیں ہے، یہ صدی فزکس اور کیمسٹری کی دریافتوں میں، غذائی مسائل میں، آبادی اور ویرانی میں، اپنی سیاسی بصیرت میں، اپنے خالص فکری نظام میں، تمام دوسرے ادوار سے الگ ہے۔ اس بدلے ہوئے ماحول کی کوئی عبارت ایسی نہیں ہو سکتی جو گزشتہ کل کی کاربن کاپی یا محض نقل ہو، سچ پوچھیے تو ایک لکھنے والے کی راہ میں سدِ باب ماحول ہی ہوتا ہے۔ ادب اس پتھر کو کاٹ کر ایک نئی شکل دیتا ہے۔ ادب اسی رشتے سے معاشرے کی ایک تنقید بھی ہے اور تخلیق بھی۔ کوئی ایسا آہنگ جو محض آہنگ ہو، کوئی ایسا لفظ جو محض لفظ ہو، وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ فنِ موسیقی جو ایک خالص فن ہے، وہ بھی دل کی گہرائیوں سے کرب و کیف کو ساعت کی سطح پر لے آتا ہے۔ ماحول کی کثافت و لطافت کا ہر پردۂ ساز سے تعلق ہے۔ یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ آج کا شاعر راستے کے سگنل کے سایے میں کھڑا ہے جو زندگی میں قیام کے تصور کو کوئی جگہ نہیں دیتا۔ ہر نفس ایک اضطراب ہے، ایک رفتار کا تقاضا ہے۔ اس نئی زندگی کے تصور سے جو علامتیں اسے بنانی

پڑتی ہیں، اتنی تیز، اتنی ناگاہ، تاریخ کی امواج کی شناوری میں اتنی چاق چوبند ہوتی ہیں کہ نظر ان کو سمیٹ کر دیر تک کانپتی رہتی ہے۔ نئی شاعری میں اشاریت، علامت، استعارے، نیم گفتہ حرف اسی لیے بڑی منزل رکھتے ہیں۔ معاشرے کی رفتار سے ہم آہنگ ہونے کی یہ سعی بھی رائگاں ہوگئی تو شاعر کی آواز صدا بہ صحرا ہوجائے گی۔

دورِ جدید کے ایک مفکر لیوس ممفورڈ (Lewis Mumford) کا خیال ہے کہ وہ تمام اشیا جن سے ہم کچھ بنانا چاہتے ہیں، سماجی ہیں اور اپنی صفات میں انسانی سماج کے لیے ضروری قرار دی گئی ہیں۔ آدمی زندگی کا آغاز کرتا ہے تو وہ زندگی کے راز کو کسی کچے خام مواد کی حیثیت سے نہیں بلکہ معاشرے کے ادراک کی علامت کی حیثیت سے سمجھتا ہے، وہ ان تمام اوزاروں کو جو آدمی نے تاریخ کے مختلف ادوار میں بنائے ہیں، استعمال کرتا ہے۔ یہ اوزار — الفاظ، علامت، گرامر، منطق یہ ساری چیزیں ہیں۔ زندگی کے ابلاغ و اظہار کے ان اوزاروں اور انسانی تجربات کے خزانے بغیر ہم بالکل بے دست و پا رہ جاتے ہیں۔ ہماری وہ فکر جو سرتاسر ماورائی ہے یا چیزوں کے برتنے کا وہ راستہ بھی جو ایک لخت غیر ذاتی ہوتا ہے، آخرکار معاشرے کے تنظیم شدہ اقدار سے ماخوذ ہے۔ عہدِ وکٹوریہ کی اس خام داستان سرائی کے تصور کو کہ پیکارِ حیات ایک نافہم اندھی طاقت کا آئینِ جاری ہے، آخر آدمی کب تک مانتا رہے۔ آج کے فلسفی، آج کے دانائے راز نے ایک دوسرا نظریۂ زندگی پیش کیا ہے۔ اس نظریے کی دلیل اگر تمام تر نہیں تو بیشتر عملی تجربات کی دنیا سے ملحق ہے۔ مادے کی ساخت، ارضی سطح پر بکھری ہوئی اشیا کا نظام، ان کا حجم، ان کی توانائی، تبدیلِ ہیئت اور ان کی محدود مقناطیسی طاقتیں، ان کی تقسیم اور ان کی کیمیائی خصوصیت ازخود زندگی کے ارتقا کی ضامن ہیں۔ یہ باتیں ہر شعبۂ فکر کے سوچنے والوں نے مان لی ہیں۔ اس پس منظر میں آدمی کی شخصیت کے نئے معنی پیدا ہوگئے ہیں۔ نئے آدمی کی دنیا بیم و رجا کے ایک نظامِ شمسی سے دست و گریباں ہے۔ ایک طرف آگہی اور اس کی صد شیوہ جرأتیں ہیں، انسانی عقل کہاں تک آزاد ہے اور کتنی پابند ہے، کہاں تک صالح، کہاں تک بے راہ رو — اس کی کسوٹی تاریخ نے ہمیشہ کچھ اخلاقی، تہذیبی اقدار کو رکھا ہے۔

سائنس اور ٹیکنولوجی کے اس عظیم دور میں آدمی جس پیکار میں مبتلا نظر آتا ہے، وہی شعر و ادب کا بھی موضوعِ سخن ہے۔ یہ سارے کارنامے جو متقل معمل سے افلاک کی پہنائیوں تک ہو رہے ہیں، آدمی اور فطرت کی جنگ کا ایک رخ ہیں۔ آج آدمی اور فطرت میں ایک ہم آہنگی کی سعی جاری ہے۔ فطرت کی خارجی ہیئت میں، اس کے اندرونی عمل میں، چھپے ہوئے راز کو آدمی اپنے ادراک کے شیشوں میں اتار رہا ہے۔ جس رفتار سے آدمی کی حیرتیں کم ہوتی جا رہی ہیں، اسی قدر اس کی آگہی کا پلّہ فطرت کے اسرار و رموز کے پلّے کے برابر ہونے کی سعی میں لرزاں ہے۔ فطرت اور انسان کے اس رشتے سے ہٹ کر اگر صرف سوادِ زمیں کی عظیم ترین قوت، صنعت و حرفت کو دیکھا جائے تو بھی انسان اور ضروریات میں ہم آہنگی تہذیب کی عافیت کے لیے ایک لازمی فعل ہوگیا ہے۔ آج ہر نوع کا ماہرِ اقتصادیات یہ ماننے کے لیے تیار ہوگیا ہے کہ ساری صنعتیں محض ایک مرکز، ایک حلقۂ آمدنی، ایک بازار تک محدود ہوکر نہیں رہ سکتیں۔ انسان اور اس کی ضروریات میں ایک توازن کی تلاش جاری ہے۔ آج بھی انسانی آبادی کے ایسے خطے موجود ہیں جو ایک نیم قحط کی حالت میں گرفتار ہیں۔ آبادی کے، غذا کے، تعلیم و تربیت کے ہزاروں مسائل ہیں جو لکھنے والے کے قلم سے الجھے ہوئے ہیں۔ ان سب محرابوں کے سایوں سے گزرنے کے بعد یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ انسان کے ضمیر کو، اس کی فکر کو، سیاسی، سماجی، تہذیبی، روحانی ہم آہنگی کے بغیر نجات حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ زندگی کا وہ ثباتی رُخ ہے جو شاعر کے کلام میں ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے شہر کے رسم و آئین میں اگر وہ کچھ خرابیاں دیکھے گا تو اس پر کچھ نہ کچھ کہنے کا حق اسے ضرور حاصل ہوجائے گا۔ شاعر کی فکر کا سواد بھی وہی ہے جو زندگی کی ہنگامہ پرور فضا کا ہے۔ اس قدر وسیع سواد میں روح کی بے چارگی، فرد کی لاچاری، عجزِ ذات کی تریاکی ذہنیت کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ ہر لمحہ اس پیکار میں گزر رہا ہے کہ کس طرح آدمی کو نئی منزل کا سکون دیا جائے، اس کی روحانی اور مادی عافیت کا سامان بہم کیا جائے۔ مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ذہنِ انسانی، آدمی کی ذات، اس کا ادراک، اس کی روح گردابِ حال میں رقص کرکے رہ جائے۔

عمل کی بہت سی صورتیں تسکین و قرار کا سامان رکھتی ہیں۔ انھیں دائروں سے ہر اضطراب کو گزرنا پڑتا ہے۔ مگر ذہن ایک اپنی خصوصیت بھی رکھتا ہے۔ یہ ذہن پابندیوں سے گزر کر ایک لمحاتی ابدیت کے لیے ایک وجود کا اقرار چاہتا ہے۔ اس کو فلسفے کی زبان میں ''انا'' بھی کہتے ہیں۔ اور انانیت زندگی کے فرازِ کم آشنا پر ٹھہری ہوئی برف کی وہ چادر ہے جس پر کوئی نامحرم ہاتھ نہیں لگا سکتا، یہ خود پرست بھی ہوتی ہے، خود نما بھی ہوتی ہے، خود آرا بھی ہوتی ہے۔ اس کا الگ وجود کم عمر ہوتا ہے مگر ہوتا ہے۔ یہ ایک امرِ اتفاقی ہی سہی مگر شاعر کو دو دنیاؤں کو کبھی کبھی خود سمیٹنا پڑتا ہے۔ ایک وہ جو اپنے خارجی اور داخلی عمل میں ایک اکائی کی صورت تاریخ و تغیر کی ایک علامت ہے، ثباتی ہے، اصل ہے۔ دوسری وہ جو اس کے ذہن کا تخلیقی عمل ہے، کم عمر ہے مگر ابدیت آشنا ہے۔ ایک ایسی کیفیت شیکسپیئر میں، ڈن میں، غالب میں ملتی ہے۔ بہرکیف یہ بات بھی ذہن سے ہرگز محو نہیں کی جاسکتی کہ ایک فرد کی زندگی کے وہ دو حصے جو اس کی حس اور اس کے ذہن سے تعلق رکھتے ہیں، معاشرے سے وابستگی کے بغیر مہلک ہوجاتے ہیں۔ حیاتی زندگی کبھی کبھی جسم و خون کی حرارتوں کی سیرابی کے لیے تاریک راستوں سے گزر سکتی ہے۔ اس کی منزل کچھ اتنی دور نہیں ہوتی مگر ذہن ناگہاں ہر چیز سے بے تعلق ہوسکتا ہے۔ عشق کی درد آفرینیوں سے، حسن کی مہربانیوں سے، اس کے جور و جفا کی گردشوں سے، خود نظامِ حواس کی قید میں رہ کر اپنے خالق کے بنائے ہوئے قوانین سے، جیسے سورج کی روشنی سورج سے جدا ہوکر کسی ایک ذرّے میں اپنا نشیمن تعمیر کرلیتی ہے، فرد کی معاشرے میں بڑی اہمیت ہے۔ اس کا آزاد ذہن معاشرے کے بہت کام آتا ہے۔ کیوں کہ ایسے ہی ذہن کو فکر کی فرصت ملتی ہے۔ اس کے ذہن کی جست و خیز شعوری اور لاشعوری طور پر زندگی کے ثباتی پہلوؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ کوئی ذہن، ذہنِ عالم سے جو روحِ عصر کی پیداوار ہے، بڑا نہیں ہوتا۔ آخرکار ہم زندگی میں جو کچھ سمجھتے ہیں، وہ روحِ عصر کے ذریعے ہی سمجھتے ہیں، خواہ ہمارا رشتہ منطقی ہو یا وجدانی!

میں نے جو نظمیں لکھی ہیں، وہ کسی تفسیر اور تشریح کے قابل نہیں ہیں۔ یہ نظمیں

اور غزلیں ۹ر جولائی ۱۹۴۸ء سے ۱۵ر جون ۱۹۶۲ء تک کہی گئی ہیں۔ کچھ علامتیں، کچھ نیم پیدا اشارے ہیں، ذہن کی ایک کیفیت ہے، ایک جستجو ہے، ایک تلاش ہے۔ ان کے متعلق کچھ لکھنا بے سود ہے، بلکہ دل ایک اور رنج سے ہراساں ہے کہ ہماری شاعری میں میرؔ کی کتاب ہے، غالبؔ کی کتاب ہے، اقبالؔ کی کتاب ہے، جوشؔ و فراقؔ کا کلام ہے۔ راشدؔ اور فیضؔ کے مجموعے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ آدمی جو مر کھپ کر لکھے، اس کی ایک کتابی صورت بھی ہو، مگر ہمارے دور میں پریس حرف و فکر کا ایک مرکزِ اتصال ہوگیا ہے۔ دوشیزۂ ورق کا حرف سے متعلق ہونا ایک سماجی فعل ہوگیا ہے۔ بے چارہ ورق یا بے چارہ حرف! میں دو کمروں کی چھوٹی سی بارک میں بیٹھے ہوئے لکھ رہا ہوں، ایشیا کی ہوائی شاہراہ پر مرطوب فضاؤں کی چادروں میں لپٹا ہوا شہر کراچی — اپنے چراغوں کی تاجرانہ چمک لیے ہوئے رات پر ہنس رہا ہے۔ رات جس کے سر بہ مہر اندھیرے میں چرخیاں گھوم رہی ہیں، سیّارے گرداں ہیں، گردشیں گردشوں کو کاٹ رہی ہیں۔ رمزِ ابدیت اور رمزِ ابدیت کی حریف زندگی ایک پردۂ سکوت چاہتی ہے۔ سر کے اوپر سے گزرتی ہوئی جیٹ کی آواز سے یہ چھوٹی سی بارک سہم اٹھتی ہے۔ تغیر کے تازہ دم پرندوں کے اجراس سے ذہنِ انسانی کی چھوٹی سی بارک بھی سہم اٹھی ہے۔ اس کی دیواریں بھی لرزہ براندام ہیں، شاید انھی لرزوں کو شعرا شعر کی زبان دیتے ہیں، شاید!

دلِ شکستہ نہ بینی و باتو بحث خطا است
سر شکستہ منِ بیں ز چوب دربانش

پچھلے پہر کا چاند

بیضوی ماہتاب سوئے اُفق
ایک یرقاں زدہ مریض کی آنکھ

رات کا طنز روشنی کا ہدف
ریگِ ساحل سے پُر غلیظ صدف
مبتلائے فریبِ دیدہ وری
صیدِ شورش اسیرِ خود نگری
محوِ صد شیوہ ہائے بال و پری

ایک بے خواب دُھند میں مستور
اک معلّق بجھا ہوا سا تنور

اک گرہ خوردہ دودِ ماہ و سال
ربط کی سعی میں ہیں ماضی و حال
پارۂ گوشت برسرِ چنگال

نیند نے ڈال دی ہے اپنی کمند
سو گیا ایک ریچھ کے مانند
اوڑھ کر برف کا مہیب غلاف
ران ، شانے ، کھلے ہوئے موباف
اک خلش رہ گئی ہے زیرِ ناف

خشتِ بے جاں بنانے والے ہیں
اس کی ضو کو بجھانے والے ہیں
تنگ دل تیرگی کا اک درپن
سرخ ہیں اس کے خواب کے دامن
قبر و ایواں ہیں یا قبا و کفن

کچھ نہ پایا تھا کیا عدم کے لیے
اک ترازوئے کیف و کم کے لیے
کیا یہ آوارہ و فسردہ روح

اک جفائے سفر سے ہے مجروح
راہ میں مل سکی نہ کشتیِ نوح

چند اُلجھے ہوئے غباروں سے
اور دھندلکوں کے کہساروں سے
ماہ تاب اور ہم کنار ہوا
میں بھی کیا کیا ذلیل و خوار ہوا
آج سورج کا اعتبار ہوا

(۱۹۴۸ء)

انتظار

خواب ہی خواب کہاں تک جھلکیں
خستگی رات کی ، اٹھتا ہوا درد
آہنی نیند سے بوجھل پلکیں

اوس کھڑکی کے خنک شیشے پر
برص کے داغ کی صورت تارے
طنز اک رات کے آئینے پر

نیند آنکھوں کی بکھر جاتی ہے
سرد جھونکوں میں وہ آہٹ ہے ابھی
جنبشِ دل بھی ٹھہر جاتی ہے

رات کٹتی نہیں کٹ جائے گی
اور ترے درد کی دنیا اے دوست
وقت کی دھول میں اَٹ جائے گی

(۱۹۴۸ء)

ایک ابر آلودہ رات

دُور تک ایک رَو ستاروں کی
دودِ پُر پیچ و خم سے لڑنے لگی
ایک ژولیدہ مو سیاہی میں
رات کی مانگ سی اُجڑنے لگی

چند عریاں اداس قندیلیں
منزل و رہ گزر سے بیگانہ
منتشر راستوں میں اُلجھی ہوئی
خود ہی عنواں ہیں خود ہی افسانہ

خامشی چھیڑتی ہے افسانے
دکھ رہے ہیں کئی پرانے گھاؤ
منّتِ مرہم و دوا سے دُور
درد کا زخم زخم ہے پھیلاؤ

رات کی سرد و گنگ بستی میں
نطق کا کارواں بکھرنے لگا
دُور ٹھیرا ہوا کوئی پرتو
خواب کی اوٹ سے گزرنے لگا

رک گیا تیری آہٹیں پاکر
کاروانِ غمِ حیات آخر
بس گئی نیند کے دھندلکوں میں
ایک بے خواب کائنات آخر

(۱۹۴۸ء)

—— کے نام

خواب کجلا گئے جوانی کے
چھاؤں غم کی دراز ہونے لگی
گردشِ وقت شعلۂ دل کو
راکھ کے ڈھیر میں سمونے لگی
شوق کے مہر و ماہ زرد ہوئے
اک جہنم کی آگ تھی جن میں
وہ بھی ذرّات دل کے سرد ہوئے

اک مسافر تھا کاروانِ شباب
کھو گیا دشت کے بگولوں میں
برقؔ کی جست و خیز جذب ہوئی

منتشر خواب کے ہیولوں میں
سر سے سودائے سر گیا اے دوست
دامنِ دل کو جیسے چھوتا ہوا
کوئی جھونکا گزر گیا اے دوست

اس زیاں خانۂ محبت میں
معتبر اک نفس نہیں ہوتا
مرگِ موسم کا اک تسلسل ہے
وقت پر کوئی بس نہیں ہوتا
خستگی حاصلِ سفر ہے آج
چارہ سازی کے اور ہیں آداب
درد کی دھار تیز تر ہے آج

بوئے گل چھیڑتی ہے قصۂ دوش
آنسوؤں سے مہک سی آتی ہے
طنز کرتے ہیں بند دروازے
گرد چوکھٹ کی مسکراتی ہے
اب نہ تو ہے نہ تیرا داماں ہے

رائگاں ہو گئی متاعِ وفا
زندگی کو تلاشِ عنواں ہے

سانس اب خار و خس سے الجھی ہے
دل الجھتا ہے نکتہ چینوں سے
آدمی کو پرکھ سکے نہ کبھی
دیکھنے والے خوردبینوں سے
کس قدر درد ناک منظر ہے
غم گساروں نے راستے بدلے
سنگِ طفلاں ہے اور مرا سر ہے

(۱۹۴۸ء)

وصال

خواب و بیداری میں پیہم چشمکیں
جسم اک ٹھہری ہوئی موجِ خیال
چار سو پُرکیف اداسی کا نشہ
کھوئے کھوئے سے درخشاں خدّ و خال
نرم شاخوں میں وہ مبہم لرزشیں
اجنبی دیسوں کے خوابوں میں طیور
اور وہ آفاق کو چھوتی ہوئی
سرد و آوارہ ہوائیں دُور دُور

زرد رُو مہتاب ، ہنگامِ غروب
وہ شکستِ جذبۂ دل بستگی
آہ وہ چھوٹی ہوئی نبضِ وصال
نیم باز آنکھوں میں رنگِ خستگی

(۱۹۴۸ء)

ایک خط کے جواب میں

ہر سبو میں زہر ہر دامن میں خار
زندگانی کے ہیں کیا کیا غم گسار
ہر خوشی رم خوردہ آہو کی طرح
اور سینے میں اترنے کے لیے
اک برہنہ درد چاقو کی طرح

ذوقِ نظّارہ پہ لاکھوں زہر خند
عہد و پیماں کے ہیں سارے باب بند
خواب کی کتنی طنابیں کٹ گئیں
وہ دہکتے لب وہ بل کھاتی لٹیں
رہ گزر کی دھول میں سب اَٹ گئیں

ایک کروٹ سو فسانے کہہ گئی
اور تجھ بن سیج سونی رہ گئی
آج کیا افسانۂ فردا و دوش
رہ گیا تیرا خیالِ جاں نواز
نیند کے صحراؤں میں خانہ بدوش

وقت بھی اک کوزہ گر کا چاک تھا
جو اشارہ تھا بہت چالاک تھا
نقش ہائے نو بہ نو کی کارساز
اس کی ہر جنبش تھی ناخن درگرہ
اور غنودہ خاک کے کُھلتے تھے راز

وقت کا یہ کھیل حسرت ناک ہے
اور یہ بازارِ جہاں سفاک ہے
اس کباڑی کی دکاں سے دستیاب
رہ گئے ہیں آج ہم اپنے لیے
گرد آلودہ سبو ، ٹوٹا رباب

(۱۹۴۸ء)

ہجر

افسردہ خزاں کی مملکت میں
یہ رقصِ بے کراں کا عالم
ترتیبِ گل و سمن ہے برہم
باندھے ہوئے پتیوں کے گھنگرو
بے کیف فضاؤں میں ہر اک سو
آوارہ بگولے ہیں نرت میں

یہ رقص یہ وقت کی تباہی
اُڑتا ہوا رنگِ پیرہن ہے
آئینِ طرب پہ خندہ زن ہے
وہ راہ کے موڑ اور وہ گھاتیں

لَو دیتی وہ تند و تیز راتیں
بکھرے ہوئے سنگِ میل و راہی

وہ ربطِ جسم و جاں کہاں ہے
ہر چند ہے محوِ میزبانی
نم دیدہ تھکی ہوئی جوانی
لرزاں ہے سکوت انجمن میں
پروانے کی خاک ہے لگن میں
اک نشے کا ٹوٹنا عیاں ہے

(۱۹۴۸ء)

جرمِ ناکردہ

میری بے خواب ساعتوں کی کفیل
نیند کی کاغذی رِدا سے ادھر
جھلملاتی ہے دور اک قندیل
ایک آواز پاس آتی ہے
بام و در کے طویل سایوں میں
ایک پرچھائیں ڈوب جاتی ہے

راہ گیروں کی آہٹوں سے اداس
دُور کوسوں کی منزلوں سے کوئی
آ نکلتا ہے آپ میرے پاس
شوق کا اوّلیں وہ دروازہ

نیند اُچٹی ہوئی سی پہلے پہل
جرمِ ناکردہ کا اک اندازہ

تیز سانسوں کی اوٹ میں الفاظ
ایک لمحے کی بے نقابی میں
کتنے نادیدہ آئنوں کا لحاظ
گردشِ ماہ و سال ٹھہری ہوئی
جسم کی لرزشِ خفی میں مگر
صورتِ یک سوال ٹھہری ہوئی

میری تیرہ شبوں سے لڑتی ہے
اس کی پرچھائیں اب بھی پچھلے پہر
وقت کے آئنے پہ پڑتی ہے
میں کبھی کا سنبھل گیا ہوتا
اس کے پیمانِ دوستی کا کرب
ایک بوسے میں ڈھل گیا ہوتا
خواب کا سلسلہ ہی ٹوٹ گیا
راہ کے موڑ پر وہ چھوٹ گیا

(۱۹۴۹ء)

صلیبوں کی اوٹ میں

You know what makes my coffin

So great so hard to bear

It holds my love within it

And my too heavy care

—**Heine**

صلیبوں کی اوٹ میں

ہوا کی رَو میں لرزتا پرچم
سکون و شورش کا ایک سنگم
شکن شکن اس کی پردہ در ہے جلال انگیز کروٹوں کی
ہر ایک جنبش کھلی ہوئی شاہراہ ہے بے تاب آہٹوں کی
کواڑ ہیں بند اور حویلی میں شمع کی کوئی لَو نہیں ہے
غبارِ رہ سے اَٹی ہوئی کھڑکیوں میں جنبش کی رَو نہیں ہے
متھے ہی جاتے ہیں سرد جھونکے مگر اسے آکے ہر نفس میں
یہ روحِ آزاد ہے قفس میں

مہیب طوفاں میں کشتیِ نوح
یہ بطنِ مادر میں جاگتی روح

یہ اک مقفّل کواڑ پر دستکوں کی اک خوں چکاں کہانی
یہ ربطِ لوح و قلم سے اک حرفِ زندہ افکار کی جوانی
یہ اک ہمکتا ہوا سمندر ہے جزر و مد اس کا کس کے بس میں
یہ موجِ طوفاں کہ محوِ بازی گری ہے انبارِ خار و خس میں
یہ ایک کشتی کہ اپنے دامن میں امنِ ساحل لیے ہوئے ہے
سکونِ منزل لیے ہوئے ہے

سکونِ منزل کی استواری
یہ آمدِ فصلِ لالہ کاری

اداس راہوں میں بادلوں کی طرح اُڑتی شکستگی سے
جگا رہی ہے فسردگی اس جہاں کو اک خوابِ آہنی سے
قدم پکڑتی ہوئی یہ مہماں‌نواز ویرانیاں ہر اک سو
وہ سرد ٹوٹی ہوئی چٹانوں پہ تیز گندھک کی رینگتی بو
کبھی کبھی سامنے لپک کر یہ راہ کھوٹی بھی کرچکی ہیں
بہ رنگِ نشتر اُتر چکی ہیں

یہ ایک قندیل کا اجالا
سکوتِ منظر پہ رونے والا

ہزار صبحوں پہ رات کی تیرگی چھڑکتی رہی سیاہی
کہیں ہدف بن گئی ہے بے روح عیش کی شب کی بے گناہی
سمٹتے نور اور لپٹتی تاریکیوں کے دامن سے جاگ اٹھے ہیں
ہزار کج مج خطوط آوارگی کے مسکن سے جاگ اٹھے ہیں
گزر گیا ہے جلال و جبروت کا شرر ریز دیو پیکر
تہس نہس کرتا ایک لشکر

یہ سر بہ زانو حیات ہر سو
یہ کاوشِ کائنات ہر سو

کبھی زمیں گیر خواب کا اک لرزتا خانہ بدوش پرتو
کبھی یہ کوہِ گراں کے مانند ہر نفس ظلمتوں کا پیرو
کہیں کہیں وادیوں میں اک کھیل قلزموں میں اک عہد و پیماں
یہ زندگی سیلِ تند جولاں رُکی ہوئی ایک موجِ طوفاں
مؤرّخوں کے گراف پر اک خطِ فراز آشنا کے مانند
کسی سگِ خاص کا گلو بند

سوال کرتی اداس آنکھیں
نہ آئیں دنیا کو راس آنکھیں

ہزار دیدہ وری کے خوابوں پہ تکیہ کرتی رہی ہیں اب تک
ہزار آئینہ خانوں کی حیرتیں نکھرتی رہی ہیں اب تک
کہیں لعابِ دہن سے دوشیزگی لبوں کی الجھ رہی ہے
ہزار خنزیر راہ میں ہیں ہر ایک کھیتی سمجھ رہی ہے
وہ سرد سیجوں پہ سونے والی برہنہ تصویر جاگ اٹھی ہے
زمیں کی تقدیر جاگ اٹھی ہے

سکوتِ صحرا کراہتا ہے
خموش رہنا ہی چاہتا ہے

مگر وہ گھوڑے وہ آہنی تند و تیز گھوڑے جو بڑھ رہے ہیں
فرازِ عالم پہ آندھیوں کی طرح برابر جو چڑھ رہے ہیں
انھیں کی ٹاپوں سے سرد و جامد لہو بکھرتا چلا گیا ہے
زمیں کے سینے میں ایک چاقو کا پھل اُترتا چلا گیا ہے
اور ایک فریادِ بے صدا صرف اس کا مرہم بنی ہوئی ہے
سکوتِ مبہم بنی ہوئی ہے

سکوتِ مبہم کے یہ دھندلکے
انھیں کے پردوں میں ہیں تہلکے

یہ خواب تریاکیاں میں اک شعلۂ جنوں خیز بن چکے ہیں
سلگ اُٹھیں گے کئی نیستاں وہ آتشِ تیز بن چکے ہیں
یہ ریگ زاروں میں نیم خوابیدہ سی دندک کو جگا رہے ہیں
یہ چپکے چپکے سراب میں اونگھتی چمک کو جگا رہے ہیں
مگر برہمن کے منتروں کا یہ کھیل بھی آج آخری ہے
کہ یہ تہلکوں کی بے پری ہے

سراغِ گم گشتگاں کی خاطر
شکستِ خوابِ گراں کی خاطر

مسافروں نے ہزار پُر ہول بستیوں کی ہے خاک چھانی
کہیں ہیں سنگِ نشاں کے مجروح ڈھیر اور ان کی تر زبانی
لہو میں ڈوبی ہوئی صلیبوں کے سایے سے پُرفشاں ملے ہیں
اجاڑ پامال کھیتیوں میں تھکے ہوئے نوحہ خواں ملے ہیں
بگولے ہنستے اٹھے ہیں نادیدہ منزلوں کا سراغ بن کر
فضا کا چشم و چراغ بن کر

فغاں بہت بے اثر تھی ان کی
مگر صداقت سپر تھی ان کی

اُسی سپر کی شکستہ سامانیوں کے ہیں خوں چکاں فسانے
یہ شیونِ بے کراں کی راتیں لہو میں بھیگے ہوئے زمانے
چراغِ کشتہ زمین کے پُر شگاف سینوں میں جل اٹھے ہیں
فسردہ کھنڈروں کی روح اٹھی ہے جگمگاتے محل اٹھے ہیں
زمانے جن کی ہر ایک موجِ نفس سے سو بل نکل رہے ہیں
ہزار عنواں بدل رہے ہیں

ہزار سازوں سے راگ اٹھے ہیں
ہوا کے شیون سے جاگ اٹھے ہیں

ہزار سنگیں تہوں کے دامن سے نیم رُخ خال و خط فضا میں
جو نیند کی آہنی مگر پُرسکون بے تار و پو رِدا میں
حیاتِ دوراں سے بے نیازی کو اپنا مسلک سمجھ رہے تھے
برہمنوں کے فسونِ خوابِ گراں سے اب تک الجھ رہے تھے
کہ اُن کی بے جان سرد نبضوں میں وقت کی روح تک اُتر آئے
صنم کدہ ایک آگ برسائے

غنودہ بے روح پستیوں میں
اجاڑ ویرانؔ بستیوں میں

سمت کے سرگوشیاں سی کرتی رہی ہے شب خون کی حزیں رات
وہ جس کے جابر سکوت کی منتظر تھی روحِ مسیح و سقراط
یہ اک طلوعِ سحر صلیبوں کی اوٹ سے زہر کے سبو سے
اُفق اُفق اک ندائے تازہ نفس سی ہے ساز کے لہو سے
یہ دورِ شب خوں طلوعِ مہر و ندائے شعلہ نفس کی موجیں
یہ نرم جاں روشنی کی فوجیں

(۱۹۴۹ء)

دستک کے بعد

ہر لفظ کا دروازہ مقفّل کب تک
اک آہنی چادر میں سمیٹے ہوئے جسم
محفوظ ہے یہ جبر کا ہیکل کب تک

باہر تو ہے آشفتہ سروں کا وہ ہجوم
اک اک ہے رقیبِ غمِ آداب و رسوم
ان کھوکھلے خوابوں کی ہے کب تک میعاد
گہری ہے بہت نیو کہ نیند آجائے
سوتا رہے قانون کا سنگِ بنیاد

دے گا کوئی ایک آدھ مہذّب دستک
لیکن وہ زمانہ ہے کہ جھپکی جو پلک
اک خواب نظر آئے گا یہ لاف و گزاف
کھا جاتے ہیں محلوں کو زمینوں کے شگاف
خود وقت کی زلفیں نہیں پابندِ مباف
پھل سخت کُدالوں کے جو پڑ جائیں گے
لوہے کے ہوں ٹانکے تو اُدھڑ جائیں گے

(۱۹۵۱ء)

نیند

نیند کے حاشیے پہ افسانے
شپرک کی طرح ہیں آویزاں
چند بے برگ و بار ویرانے
بادلوں کی طرح ہیں چھائے ہوئے
چند اترے ہوئے خنک چہرے
ایک بارِ سکوت اٹھائے ہوئے
پتھروں کے مہیب گرزِ گراں
استخوانوں کے چند دھندلے ڈھیر
اور افق پر کراہتا سا دھواں

داستاں رہ سپار صدیوں کی
سینۂ کوہ و دشت میں اب تک
راکھ ہے بے شمار صدیوں کی
کچھ صلیبوں سے خوں ٹپکتا ہوا
وقت ہے اک سوال کی صورت
جسم کے کرب میں لٹکتا ہوا
پتھروں کی فصیل کے اُس پار
اُگ رہے ہیں زمیں کے سینے سے
زنگ خوردہ ڈراؤنے اوزار

چاند پچھلے پہر نکلتا ہوا
اک اُجالا اداس آسیبی
رات کے دامنوں پہ چلتا ہوا
خشکیوں کی حدیث کہتی ہوئی
وقت کی خفتہ پا ندی جیسے
بے جہت بے خرام بہتی ہوئی

(۱۹۵۱ء)

ایک رَم خوردہ دریا

جانِ من سوئیاں ساعتِ تازہ دم کی
ایک رم خوردہ دریا کی موجیں ہیں
ان کی سفّاک جنبش کی رو میں شبوں کے گرہ بستہ در
رشتۂ شوق کے سیکڑوں سلسلے
نیند آدم کی ٹوٹی تھی جس کی گھنی چھاؤں میں اس شجر تک
پیچ در پیچ بکھرے ہوئے فاصلے
خار و خس کا اک انبار ہیں

روند ڈالیں گی یہ سوئیاں ساعتِ تازہ دم کی
تیرے تازہ لبوں میں دھڑکتے ہوئے گرم بوسوں کی نوخیز فصل
تیرے شاداب چہرے کا نکھرا ہوا رنگ
یہ خطاؤں پشیمانیوں میں الجھتی ہوئی ایک دوری کہ کب سے
ہے بے میل و فرسنگ

ایک رم خوردہ دریا کی آخر ہدف ہیں
سوئیاں ساعتِ تازہ دم کی ہیں کف در دہاں اور تلاطم بدوش
ان کے گرداب میں اک پرِ کاہ ہے یہ سفینہ یہ امروز و دوش
ان سیہ تند موجوں میں گرتے ہوئے سقف و بام
حادثے بے زمام
ڈھیر کے ڈھیر بوسیدہ اخبار
جن کے بے جان حرفوں میں گوندھی گئی تیز رو ٹینک کی گھڑگھڑاہٹ
لپٹ آگ کی
یک دگر طفل و مادر کی نعشوں کے خاکے
نہ جانے ہیں کب سے سیہ خندقوں میں وطن جن کے، ایسے جواں
اور لاشیں رہیں بے کفن جن کی، ایسے جواں

بستیاں اور ویرانیاں
اور اُفق تا اُفق شعلہ سامانیاں
دشتِ غربت میں صبحِ وطن
نرم جسموں کی یادوں سے چھٹتے گہن
دور ساحل سے کچھ کشتیاں نارسیدہ
وہ احوال جن کی کہ زنجیر اسبابِ عالم تھی خرد آفریدہ

زہر و تریاق کی داستانیں
کیمیاگر کے آلات کے جال

نلکیوں کے سبک بطن میں محوِ ترکیب اجسام
تودۂ خاک کی داستانیں
ان سیہ تند موجوں میں ہیں

جانِ من، سوئیاں ساعتِ تازہ دم کی
ایک رَم خوردہ دریا کی موجیں ہیں
ایشیا کی ہر اک ساعتِ خواب آلودہ کی سوئیاں ہیں
مگر آج بے آب دریاؤں کی طرح محروم اک تندیِ سیل سے
ایک بے آب دریا کے بے حس کنارے پہ بکھری ہوئی ریت
کا ایک ذرّہ ہے یہ حسن تیرا
ایک بے آب دریا کا بے حس کنارہ کہ دامن میں اس کے
نہ شبنم نہ بادِ صبا ہے نہ ایسا شجر کوئی جس کے
ثمر میں جزا اور سزا ہی کی نیرنگیاں ہوں
مگر کوئی دریا تلاطم بدوش اور کف در دہاں
آج بھی میری بے خوابیوں اور تری نیند کے درمیاں
ایک دستک سی دیتا ہے
جانِ من سوئیاں ساعتِ تازہ دم کی
ایک رَم خوردہ دریا کی موجیں ہیں!

(۱۹۵۳ء)

نیند کی خفتہ پا ندی

نیند کی خفتہ پا ندی سے اُدھر
دُور اک شہر کے در و دیوار
خواب کی بستیوں کے سے آثار
چند پرچھائیوں کے دامن میں
نیم وا اک مکاں کا دروازہ
اور ہوا میں لکیر کی صورت
درد کی ایک رَو سبک تازہ

کھڑکیوں کے دبیز شیشوں سے
وہ دبے پاؤں جھانکنے کی رات
وہ اشارے وہ چشمکیں وہ حیات

اک حسیں جسم سے لپٹتی ہوئی
نیم جاں چاند کی پشیماں ضو
وقت کی اوٹ میں سرکتا ہوا
زیرِ دیوار نیم رُخ پرتو

ایک بے خواب و نم فضا کا سکوت
رشتۂ جسم و جاں میں کھویا ہوا
موجِ انفاس میں سمویا ہوا
صبح تک جاگنے کے وہ ہنگام
قہقہے طنز گیت سرگوشی
گفتگو کے ہزارہا عنواں
اور اچانک طویل خاموشی
نیند کی خفتہ پا ندی کا خرام
کاٹ کر وقت کے دیاروں کو
چھونے والا ہے آج گام بہ گام
دور اک شہر کے کناروں کو

(۱۹۵۳ء)

رصدگاہ

رمیدہ وقت کے سایوں سے اس قدر آباد
یہ میرے فن کا فسردہ ملول ویرانہ
درِ سکوت پہ اس کے فضا نے حرف لکھے
سمجھ میں آنے لگا کچھ نہ کچھ کنایۂ وقت
ٹھہر ٹھہر کے وہ کلکِ ہوا نے حرف لکھے

اسی کھنڈر میں ہزاروں چراغ ہیں روشن
یہ ایک بے در و دیوار خانۂ محبوب
یہ لوحِ سادہ پہ حرفوں کے نیم وا روزن
یہ خلوتیں کہ جہاں نیند کی قناتیں ہیں
کہ تیرے نام سے سرگوشیاں ہیں باتیں ہیں

ہر اک نفس یہ سبک گام درد کی اک رَو
ہر ایک چہرۂ ساعت کی اوٹ سے اکثر
یہ نیم رخ ترے چہرے کا دُور سے پرتو
یہ زاویے ترے رُخ کے یہ فاصلوں کا قیاس
بسا رہے ہیں اک اسلوبِ تازہ سے مہ و سال
نئی نئی سی کئی بستیاں سرِ قرطاس
کہیں کہیں ترے قدموں کی آہٹیں اب تک
حروفِ سادہ میں لیتی ہیں کروٹیں اب تک

کنارِ جاں میں ہے آباد ایک شہرِ وصال
یہ تیری یاد سے پرچھائیوں کا ایک ہجوم
یہ موسموں کو بدلتے ہوئے سے خواب و خیال
خنک ہوا میں ہیں آثار ابر و باراں کے
سمو رہا ہے ابھی وقت ان فضاؤں میں
کچھ آنے والے جو موسم ہیں عہد و پیماں کے
ہوائے سرد بھی ہے اک محاورہ اے دوست
یہ تیرا درد بھی ہے اک محاورہ اے دوست

فضائیں دشمنِ جاں ہیں ہوا حریفانہ
مزاج دانِ تغیر رہا ہے برسوں سے
یہ میرے فن کا فسردہ ملول ویرانہ
سمندروں کا مد و جزر دشت و در کا غبار
قلم سے الجھے ہوئے صد ہزار تشنہ سوال
رم و سکون و طلوع و غروب کی پیکار
حدیثِ دل میں ہوئی کس جتن سے صرف نہ پوچھ
سمو رہی ہے ابھی نیک وَ بد کے ہنگامے
کن آئنوں میں رصدگاہِ صوت و حرف نہ پوچھ

(۱۹۵۴ء)

سرما کی ایک رات

اس شہر میں رات کا گزرنا
مجرم کی طرح خموش بستی
کہتی ہے کہ آئے ہو تو ٹھہرو
ہر چند محال ہے ٹھہرنا
اے جانِ وفا اُجڑ گئے ہیں
افسردہ مکان کے در و بام
غرفوں میں شگاف پڑ گئے ہیں
سرما کے بھی یخ زدہ سے ناخن
شاخوں کے سڈول بازوؤں میں
پیوست ہوئے ہیں ، گڑ گئے ہیں

باہر ہے خنک ہوا کی دستک
ہر سایہ سوال کر رہا ہے
ٹھہرو گے تو یہ بتاؤ کب تک
پہنے ہوئے برف کا لبادہ
آسیب سا جھانکتا ہے کوئی
شیشوں سے کھڑکیوں کے جھک کر
اور نیلگوں اوس ڈھونڈتی ہے
کھویا ہوا گم شدہ سا جادہ
بکھری ہوئی پتیوں پہ رک کر
تیور ہی خزاں کے بے بدل ہیں
بے مایہ شجر کی زندگی میں
ہر چند کہ پھول ہیں نہ پھل ہیں
لیکن ہے لگن سی کوئی باقی
ہر بیج میں جنبشِ نمو ہے
وہ برف کی سِل سے جھل سکے گی
سینے سے شجر کے شاخِ گُل سے
تخلیقِ حیات ڈھل سکے گی
ہر لمحۂ زندگی ہے جنباں
ہر بطن میں اک خموش تاریخ

کروٹ سی ابھی بدل رہی ہے
اس خیمۂ برف و باد میں بھی
اب تک پسِ پردۂ تغیر
اک شمع مدام جل رہی ہے

گردوں سے دُھواں برس رہا ہے
یہ رات یہ نیلگوں سا کُہرا
ویران فضا میں بس رہا ہے
اک فرصتِ غم ہے زندگانی
ہونٹوں کے ہے دائروں کی تقدیر
ایک آدھ سخن کی میزبانی

طاری ہیں ڈرے ہوئے سے انداز
اک ربط کی آرزو میں باتیں
اُچٹی ہوئی نیند کی ہیں غمّاز
اک سلسلۂ غم میں کھو گیا ہے
آنکھوں میں تری ہر ایک لمحہ
پگھلا ہوا موم ہوگیا ہے
ہر خواب ہے آپ ہی تو تعبیر

جھونکے جو ہوا کے چل رہے ہیں
کہتے ہیں کہ جاگنا ہے تقصیر
ہر لحظۂ داد خواہ کب تک
آئینِ وصال و موسمِ گُل
کروٹ کا تری ہے دوسرا نام
موسم ہے تو سدِّ راہ کب تک
کانٹوں میں پلی ہے رات سو جا
مانا کہ حریف کا ہے خنجر
ڈھلتی ہی چلی ہے رات سو جا

(۱۹۵۴ء)

مراجعت

ایک شوقِ خود نمائی کا گداز
تیرے پیکر میں بھی اے آرامِ جاں
فصل و موسم کے ملے سر بستہ راز
خال و خط میں شیشۂ ساعت کوئی
رشتۂ بیداریِ فطرت کوئی

ہیئت و ہندسہ کی ترکیبوں سے دُور
دُھند کی صورت میں ہے چھایا ہوا
وقت کا اک خواب تعبیروں سے دُور
جلد کی تہ میں گھنی پرچھائیاں
کنجِ خواب آلودہ کی تنہائیاں

لمحۂ اوّل کا اک شوقِ سپاس
وہ زبانِ مار سے ٹپکا ہوا
حرفِ یک اسرار و صد جانِ قیاس
داستاں انگیز سرگوشی تری
نطق سے لبریز خاموشی تری
یہ قبا یہ جلد یہ ترکیبِ جسم
سلسلے مرگ و نمو کے خون میں
وقت کی یہ قید اک قیدِ طلسم
یہ بہ عنوانِ رمِ عمرِ رواں
تیز تر اک گردشِ پرکارِ جاں

رخ کے آئینے پہ اک پیوندِ گرد
شمع دانوں کے پگھلتے موم سے
استخوانوں تک اترتا ایک درد
بے خطِ فاصل کبھی ہجر و وصال
یک دگر ہوتی ہوئی موجِ خیال

کتنے عنوانوں کی الجھائی ہوئی
اب گزرتے وقت کا احساس ہے
ایک خود رَو بیل مرجھائی ہوئی
زندگی ویران بستی رہ گئی
آبیاری کو ترستی رہ گئی

فاختاؤں کے پروں کی نرمیاں
نیند کی خنکی میں حل ہوتی رہیں
شوق کی موجِ نفس کے درمیاں
تہ بہ تہ آخر اداسی جم گئی
عمرِ نو تھی رات کی شبنم گئی
ہر شبِ تاریک سے تاریک تر
موجِ خوں میں موت کی اک دھار ہے
خنجرِ اغیار سے باریک تر
خوش قبائی وقت کی اب کھو چکی
کاوشِ پیرایۂ جاں ہو چکی

جنبشِ گہوارہ سلجھاتی رہی
رشتۂ لمحات کی کوئی کڑی

قبر تک رشتہ بپا جاتی رہی
تیری نوخیزی کے پیچ و تاب سے
جا ملے ہیں موت کے گرداب سے

آتشِ جاں سرد ہوتی ہی رہی
زندگانی ہر تغیّر وقت کا
تیری مٹی میں سموتی ہی رہی

(۱۹۵۵ء)

موت سے پہلے

تیرے خد و خال کی تابندہ رَو
زندگانی کے سیہ خانے میں ہے
صورتِ قندیلِ معدن ایک ضو
تیری خلوت گاہ کی وہ کائنات
نم ہوا کی رَو میں وہ کھلتی ہوئی
رات کی گہری سیاہی کی قنات
وہ حیا آمیز سرگوشی کبھی
آئنہ در آئنہ وہ ساعتیں
تیرا اندازِ ہم آغوشی کبھی

تیری آنکھوں کی اداسی کے وہ جال
تہ ہوئے جاتے ہوں جیسے خود بہ خود
عمر کے فیتے بساطِ ماہ و سال
روشنی چہرے کی سنولائی ہوئی
شمع دانوں کے پگھلتے موم سے
اک اداسی تا بہ جاں چھائی ہوئی
وہ نگاہِ آشنا کی ایک رات
دل یہ کہتا ہے ابد کی تھی حریف
تیرے پیمانِ وفا کی ایک رات

زندگی اک جاں کنی کا دام ہے
موجِ خوں میں موت کے گرداب میں
مجھ کو بھی معلوم یہ انجام ہے
نیل چہرے پر ہوا سے پڑ گئے
کتنے رخساروں کو دیمک کھا گئی
اوس کے ناخن لبوں میں گڑ گئے
گرد و بادِ عمر سے اٹتا رہا
جسم کا ریشم الجھ کر پے بہ پے
خستگی کی دھار سے کٹتا رہا

اس تغیّر میں بھی اے آرامِ جاں
شوق کی آہٹ پہ جیسے رک گئی
شیشۂ ساعت میں خوں ریگِ رواں
اب سکون و رَم میں اک پیکار ہے
حسن ہے مجبورِ رَم ساکن خیال
آئنے میں قید اک رفتار ہے
اب خیالوں نے تجھے اپنا لیا
وقت اک طرارۂ آہو سہی
خواب نے اس جست کو ٹھہرا لیا

(۱۹۵۵ء)

چوہا

مونسِ شب رَو ، یہ دُزدانہ خرام
ریزہ ہائے نان کی پیہم تلاش
ہر نفس الجھی ہوئی فکرِ معاش
عجز ہے تیرا کوئی خالی نیام
روح کی شمشیرِ جوہر دار سے
کب سے ہیں محروم تیرے صبح و شام
روح تاریکی میں پلتی ہی نہیں
جذب کرلیتی ہے سفاکی کے ساتھ
تیرگی ادراک کا جغرافیہ
یہ ندی رخ تو بدلتی ہی نہیں

مفلسی کا سرد اندھا آئنہ
دیکھنے دیتا جو چہرے کی خراش
جسم میں مانندِ برقِ بے اماں
روح کی شمشیر کا جوہر کہیں
ٹوٹ سکتی تھیں بہت پابندیاں

تجھ سے وابستہ بلوں کی تیرگی
تیرگی میں اک گراں حبسِ دوام
جاں کنی کی گود میں سمٹا ہوا
نکبت و افلاس کا جغرافیہ
ایک خود رَو یاس میں لپٹا ہوا

(۱۹۵۶ء)

فرس ٹروجن

فصیلِ شہر کے دامن سے ایک ویرانی
لپٹ رہی تھی شکستوں کی ایک فرد لیے

دھویں میں گم تھے ہزاروں جری سرِ میداں
ابھی کھنچی ہوئی تیغیں تنے ہوئے نیزے
خدائے جنگ کی موجِ نفس کے تھے عنواں
پرے حریفوں کی جب توڑ کر نکلتی تھیں
لہو میں ڈوب کے پرچھائیاں اُچھلتی تھیں

ہجومِ شوق سے گرداب سا سپاہ میں تھا
کسی کے چاند سے چہرے کی تاب ناکی سے

سمندروں کا مد و جزر رزم گاہ میں تھا
نہ جانے کیا تھا کہ منظر بدل گیا کوسوں
غنیم پردۂ شب میں نکل گیا کوسوں

درِ حصار پہ مانندِ پاسباں آخر
فصیلِ شہر سے باہر ہے اک نشانِ بلا
کسی سوار کا اک رخشِ بے عناں آخر
یہ اجنبی ہے کوئی آسماں نژاد نہ ہو
زمیں تک آئے ہوئے دیوتا کی یاد نہ ہو

ادب کی حد سے یہ آگے نکل گیا ہوگا
یہ اسپ ہے کسی معزول دیوتا کا فرس
جو چوبِ خشک کے قالب میں ڈھل گیا ہوگا
زبانِ حال سے کہتا تھا شہریوں کا ہجوم
غریب زینتِ برگستواں سے ہے محروم

یہ نسلِ رخش بہت کم ادھر نظر آئی
یہ اُک کھلونا ہے اطفالِ شہر کی خاطر
کچھ اس کی ساخت میں سعیِ ہنر نظر آئی

عنانِ زر سے طلائی رسن سے بندھوا کر
اسے تو شہر میں لاؤ جتن سے بندھوا کر

کشاں کشاں اسے لے کر چلا ہجومِ سپاہ
حریفِ قفل ہوئی یوں کلیدِ شہر اک بار
کھلا طلسم کے مانند بابِ شہر پناہ
سوادِ شہر میں یہ چار سو میں جا پہنچا
ہجومِ ساقی و جام و سبو میں جا پہنچا

وہ رات جشن کی وہ رقص و رم کا اک سیلاب
ہوائے بے خبری سے دھواں دھواں عالم
بہ رنگِ صوتِ ہزاراں صدائے چنگ و رباب
فرس کے گرد پیالہ کشوں کو نیند آئی
نشے میں ڈوبے ہوئے مہ وشوں کو نیند آئی

فصیلِ شہر کے سایے ہوئے دراز آخر
خموش رات نے موجِ نفس سے الجھایا
خلا میں کھوئی ہوئی نیند کا گداز آخر

چراغ خلوتیاں رنگِ پردہ داری میں
بجھا کے سو گئی لَو رات کی عماری میں

بساطِ خواب سے پیکار کا جنوں اٹھا
غنیم جاگ اٹھے موجِ برق کے مانند
فرس کے خول سے طوفان کشت و خوں اٹھا
وصال و ہجر کی جنگ آزما رقابت نے
جھلس دیا ہے زمیں کو ہوائے وحشت نے

نکل رہا ہے کوئی کھول کر کواڑوں کو
گہن لگا ہے زمیں کے ہزار حصوں میں
پھلانگ جاتی ہیں پرچھائیاں پہاڑوں کو
ہر اک قدم پہ حریفانہ سایے ملتے ہیں
اسی فرس کے رقیبانہ سایے ملتے ہیں

(۱۹۵۶ء)

آپریشن تھیٹر

زخم کو آئنہ دکھاتی ہوئی
نیم گرداں ہے قرص نور افگن
جسم پر زاویے بناتی ہوئی
دستِ جراح سے لپٹتی ہوئی
محو اک انقطاعِ درد میں ہے
تیز نشتر کی رَو سمٹتی ہوئی
زخم کی تیرگی کو دھوتا ہوا
درد درمانِ درد ہوتا ہوا

زخم کے طول و عرض کے نباض
شاطرانہ ادا سے چلتے ہوئے
چند مہروں کو نشتر و مقراض

نیم سرگوشیوں میں ڈھلتا ہوا
چارہ جوئی کی تاب لانے کو
حرفِ چارہ گراں سنبھلتا ہوا
نقشِ مبہم مٹا رہا ہے کوئی
زخم کی حد ہٹا رہا ہے کوئی
وہ جراثیم ہیں ہواؤں میں
ایک رَو کرم زہر آگیں کی
تیر جاتی ہے ان فضاؤں میں
ہر شجر ہے محاذِ ہستی میں
ایک ذوقِ نمو میں ڈوبا ہوا
آپ اپنے لہو میں ڈوبا ہوا
زندگی جاں کنیِ برگ نہیں
کچھ مری جان رنجِ مرگ نہیں

ہو چکے ہیں ہزارہا ناسور
مہرِ تاریخ کا ثبات لیے
زندگانی کا بے لکھا دستور
ہر نفس اک ہدف ہے تیروں کا
یہ حدیں زخم کی یہ حدِّ حیات
سلسلہ درد کے جزیروں کا

زندگانی پہ بند ہیں راہیں
سرد کیڑے ہیں اور کمیں گاہیں

جنگ ، افلاس ، قحط ، بے کاری
بے حسی کی فصیل اور انساں
حادثوں کی یہ تنگ دیواری
دُور تک اک محاذِ خاموشی
تیر جوڑے ہوئے غنیموں کی
چار سو خندقوں میں رُوپوشی
درد کے سیلِ بے پناہ میں ہے
ہر جری ایک رزم گاہ میں ہے

تیغ کی دھار موڑ دیتی ہے
ضربِ ہر کرمِ زیر آگیں کی
آہنی ڈھال توڑ دیتی ہے
ایک ذوقِ طلب سے جلتا ہے
سینۂ زندگی کا زخم ابھی
سببِ بے سبب سے جلتا ہے
قصۂ زخم و اندمال نہ پوچھ
جنگ جاری ہے ہم خیال نہ پوچھ

(۱۹۵۶ء)

حفظِ کشت

ابر و باراں میں ایک داد رسی
ہو گیا ہے تپاک مٹی کا
محوِ صد رشتہ ہائے ہم نفسی
دم بہ دم ہے وہ اضطرابِ سفال
لہلہاتے ہیں نرم پودوں میں
حرفِ تازہ خیال کے اشکال
آج موجِ نفس میں ملتی ہے
درد کی ایک فصلِ بارآور
سردیِ خار و خس میں ملتی ہے

اک تغیّر بپا ہے کیا کہیے
آبجو میں سبیلِ گرم روی
دردِ ہجراں ہوا ہے کیا کہیے
خوشہ خوشہ میں آشنا انداز
اک وصالِ نگاہ تا بہ افق
عہد و پیماں کی اک فضائے راز
یہ نمو ہے حریفِ کم یابی
راز ہر شاخ کے گداز کا ہے
ثمرِ نیم رس کی بے تابی

وصلِ آب و ہوا کا یہ افسوں
ہو گیا اضطراب مٹی کا
بازوؤں کی تھکن کا ایک سکوں
بنجروں میں نشان چھوڑ گئیں
بیج میں سر بہ مہر فصلیں تھیں
خشکیوں کی حدوں کو توڑ گئیں
زندگی آفریدہ ہے اب تک
ریگ زاروں کے حبس میں خود رَو
سبزۂ نو دمیدہ ہے اب تک

سلسلہ کیا ہے یہ خدا جانے
صورتیں تھیں جو خاک کی پیوند
کہہ رہی ہیں گلوں کے افسانے
رات شبنم جو ہو رہی تھی نثار
جانے کس درد کا ہوا محرم
ہم کناری سے سبزۂ دیوار
خاکِ پامال سے اُگا ہوا پھول
کہہ رہا ہے کہ رنگ افشاں ہے
میرے سایے میں ایک جگ کی دُھول

اس فضا میں بھی ہے فساد ابھی
روندتا کھیتیوں کو گزرے گا
ایک انبوہِ شر نژاد ابھی
دشت و در کی فضائیں کہتی ہیں
غولِ خنزیر کھیتیوں کی طرف
بڑھ رہا ہے ہوائیں کہتی ہیں
دلِ گیتی کو چیر جاتی ہے
کوس پیلانِ مست کی آواز
کوہساروں سے لوٹ آتی ہے

مٹ نہ جائیں نمو کے یہ آثار
کم نہادانِ شوق نکلے ہیں
توڑنے خوشۂ درست عیار
آب و گل کی یہ بارگاہِ وصال
آشنایانِ عالمِ فطرت
بے سپر کھیتیوں کا کچھ تو خیال
یہ ہوا تیز تر نہ چل جائے
آدمی ہی تو ایک پودا ہے
حاصلِ کشت ہی نہ جل جائے

(۱۹۵۷ء)

تاکید

اے خبر گیرِ ناقۂ لیلیٰ
تیز چل راستہ بدل کے ذرا

کروٹیں لے رہے ہیں لیل و نہار
رخِ صحرا پہ آندھیاں ہیں ہزار

اک جفائے سموم کے مارے
بجھ گئے آسمان کے تارے

ریگِ صحرا کی ضرب ہے کاری
جل گئی پیاس سے زباں ساری

ساریاں ، غم گسار ، محرمِ راز
سخت کافر ہوا کے ہیں انداز

روئے لیلیٰ پہ گرد آنے لگی
راہ کے موڑ پر سنبھل کے ذرا

(۱۹۵۷ء)

غروب

چند چھینٹوں سے مہکی گلِ رہ گزار
دل میں اُتری سنبھلتی ہوئی دُور سے
تیز رو نیم رُخ ایک چہرے کی دھار
رات تاریک محضر میں روتی رہی
ہر ٹپکتی ہوئی بوند کچھ زخم کے
بیچ کھڑکی کے شیشوں میں بوتی رہی
اجنبیّت کے احساس سے رک گئی
ایک آہٹ ہوا میں بہت آشنا
آ رہی تھی بہت پاس سے رک گئی

تیرگی ہو گئی تیز رَو اور کچھ
صیقلِ درد ، اک آئنہ کر گیا
عافیت کے مسِ خام کو اور کچھ
سرد قالین پر غولِ خانہ بدوش
رات کی رات ٹھہرے ہوئے کارواں
گردِ اخبار تنکے پڑے ہیں خموش
بیضوی بلب پر نیم لرزاں پتنگ
دائرے حال و فردا کے ملتے ہوئے
وقت ہی روشنی وقت ہی تیرہ رنگ

ختم ہے محفلِ دوش بیٹھے ہو کیوں
نیم رخ ایک پرچھائیں آہستہ سے
پوچھتی ہے کہ خاموش بیٹھے ہو کیوں
کم کوئی دردِ ایام ہوتا نہیں
آؤ باہر چلیں حبس سے اور بھی
جی الجھتا ہے کچھ کام ہوتا نہیں
وقت کے اک کھنڈر سے ملاتا رہا

بے حسی کا خنک کوکناری دُھواں
ذہنِ بیدار میں گھر بناتا رہا

بات اب صبح تک جاگنے پر گئی
خانۂ یاس کی مہرباں داشتہ —
نیند اک نردباں سے اُتر کر گئی
کائی ہے، شاخِ مرجاں کے قطعات ہیں
اس شبِ بادہ خواری کے قلزم میں بھی
کس قدر جان لیوا نباتات ہیں
رات کی ماہی گیری بھی کیا پائے گی
چند اسپنج اُترے ہوئے نشوں کے
صبح دم جال میں لے کے آجائے گی

اے مرے دل ترا تول کب تک الگ
کوئلے کی سِلوں میں رہے موج زن
میں بھی ہیرے کی رگ تو بھی ہیرے کی رگ
چند اعداد کے سرد اوزار سے
کاؤنٹر کی پری ایک ایڈنگ مشین
کاٹ سکتی ہے ہیرے کو اک وار سے

مرکزِ ثقل ہے اک دکاں خوش غلاف
نرخِ بازار کے دائروں میں ترا
پستیوں کی طرف ہی ملے گا گراف

تیرے محور کی ساری کشش کھو چکی
میرے ننھے سے سورج تجھے کیا خبر
سلکِ نورِ ازل کوئلہ ہوچکی
گردشیں ہیں تری سب بگڑتی ہوئی
دیدۂ نم کو تاریکیاں چوم کر
بند کرتی ہیں در قفل جڑتی ہوئی
کتنے ذرّے جو سورج کی تقدیر تھے
بے ضیا درد کے نیل سے ہو چکے
لے کے داغِ غروبِ اجل آشنا
سو بھی جا اور خورشید بھی سو چکے

(۱۹۵۷ء)

جُرم

کل صبح کی تازہ دم ہوا میں
بازو پہ مرے وہ سو گئی تھی
تالیفِ خیال کر رہی تھی
اسلوبِ بدن کی خوش گواری
کیا کیا تھی نزاکتوں کی ہم راز
چادر تھی کہ نافۂ تتاری
ساحل کے سکوں میں کھو گیا تھا
ٹھہرا ہوا رودِ ہم کناری
کب سے ہیں وصال کے یہ انداز
احساسِ وجود و ضربِ کاری

جو ہاتھ اٹھے حریفِ تعزیر
اس کی تو ضرور پاس داری
اک نسخۂ کیمیائے ہستی
اے عشق تری یہ خاکساری
انساں کے قدیم جرم ہی نے
رکھ دی تھی بِنائے غم گساری

(۱۹۵۸ء)

آخری ٹرام

آخری ٹرام لڑکھڑاتی ہوئی
شل ، پریشان نیند سے بوجھل
شیڈ کے بازوؤں میں جاتی ہوئی
زنگ آلودہ بریک کی فریاد
کر گئی چند ساعتوں کے لیے
رہ گزر کے سکوت کو آباد
کاسۂ یک خیال کے مانند
نیم روشن سی ایک بالکنی
اک نشانِ سوال کے مانند
پوچھتی ہے حسابِ طرزِ معاش

اک ہوا سے جو اس اندھیرے میں
رازِ فطرت کو کر رہی ہے تلاش
دُور پرچھائیوں کا اک بن ہے
راہ کی ناف سے سرکتا ہوا
اک طرف روشنی کا دامن ہے
اک طرف عافیت کا سرد حصار
گوشۂ چشم پاسباں کی طرح
عصمتِ زر پہ بینک کی دیوار
دشت و در میں مہیب شورِ سگاں
بے ضمیری ہوا کی کیا کہیے
بے محافظ ہے عصمتِ انساں

(۱۹۵۸ء)

خود کلامی

"شہر آنکھوں کے ہیں ویرانہ اثر
رخ ہی کچھ اور ہے آبادی کا
شعلۂ جاں بھی ہوا خاک بسر
نکتہ چینوں میں سند ہے یہ خیال
دردِ مجبوری و ناکامی سے
بے یقینی ہے محبت کا مآل
کام یہ تجھ سے لیا ہے میں نے
خود پرستی کی رصدگاہوں میں
آئنہ نصب کیا ہے میں نے"

''تیرے چہرے پہ خطِ ساعتِ شام
آرزو کا ہے کوئی حلقۂ شفق
جسم و جاں زیرِ اثر اس کے تمام
آتشیں بیل ہیں زلف و موباف
تیرے احساس کی بے تابی سے
کچھ مری تازہ دمی کا ہے گراف
روحِ اسرار یہ خاموشی ہے
چہرہ و زلف کی آمیزش میں
حال و فردا کی ہم آغوشی ہے''

''سرحدیں دل کی سیاست کی نہ پوچھ
دائرے ، نکتے ، لکیریں لاکھوں
صورتیں فہم و فراست کی نہ پوچھ
خوردبیں ، دیدۂ سفّاک عمل
کھیل دانائے نباتات کا ہے
برگِ نازک پہ اک آئینِ اجل
آدمی ایک ہدف ہے مری جاں
اک ورق نبض و نفس کا پابند
دیدۂ زیست میں برگِ لرزاں''

''بے حسی سے کبھی چالاکی سے
مرتبانوں میں دلوں کے پودے
رکھ دیے جاتے ہیں سفّاکی سے
آگہی کا وہ صنم خانہ ہے
آدمی برگِ بریدہ کی طرح
معملِ زیست کا نذرانہ ہے
دل رقیبِ غمِ ادراک بھی ہے
خورد بینوں کی نگاہوں کا حریف
عشق کا دیدۂ نم ناک بھی ہے''

''زندگانی ہے تغیّر کی برات
نکتہ چینوں کو خبر کیا ہوگی
تیز تر کب سے ہے نبضِ اوقات
موجِ طوفاں کو جگا دیتی ہیں
سوئیاں سرد نشانات کی نبض
دیکھ کر حال بتا دیتی ہیں
میزبانی میں سخن دانی میں
عشق کی سانس اکھڑ جاتی ہے
اس شمارِ غمِ انسانی میں''

"نیک و بد، سود و زیاں کے انداز
لکنت آمیز مساوات میں بھی
زندگانی کے ہیں ڈھلتے ہوئے راز
ایک پیکارِ غمِ رد و قبول
عشقِ ناکام کی خودداری پر
ایک شائستگیِ غم — محصول
یہ کم و کیف کی دنیا یہ حساب
ہر صفر کی نگراں رہتی ہے
ایک اَن دیکھے محاسب کی کتاب"

(۱۹۵۹ء)

✡

ایک آدھ حریفِ غمِ دنیا بھی نہیں تھا
اربابِ وفا میں کوئی اتنا بھی نہیں تھا

لب جلتے ہیں مے خواروں کے سینے نہیں جلتے
اس درجہ خنک شعلۂ مینا بھی نہیں تھا

اک اس کا تغافل ہے وہ یاد آ ہی گیا ہے
اک وعدۂ فردا ہے وہ بھولا بھی نہیں تھا

کہہ سکتے تو احوالِ جہاں تم سے ہی کہتے
تم سے تو کسی بات کا پردا بھی نہیں تھا

اب حسن پہ خود اس کا تصوّر بھی گراں ہے
پہلے تو گراں خوابِ زلیخا بھی نہیں تھا

پہلے مری وحشت کے یہ انداز بھی کم تھے
پہلے مجھے اندازۂ صحرا بھی نہیں تھا

اب یہ ہے کہ تھمتا ہوا دریا ہے تری یاد
بے فیض یہ دریا کبھی ایسا بھی نہیں تھا

اچھا تو مروّت ہی ترا بوسۂ لب ہے
اچھا یہ کوئی دل کا تقاضا بھی نہیں تھا

مجنوں کے سوا کس سے اٹھی منّتِ دیدار
آخر رُخِ لیلیٰ تھا تماشا بھی نہیں تھا

(۱۹۵۰ء)

کبھی تسکینِ خاطر موجِ دریا ہے، کبھی شبنم
تلوّن کو غنیمت جان کر چپ ہو گئے ہیں ہم

وفا کی داستانیں سننے والا کون تھا لیکن
خدا کا شکر ہے دو چار آنکھیں ہوگئیں پُر نم

بہت نازک ہے اس نوخیز کا آئینِ آرائش
حیا پہلے سے بڑھ کر اور سرِ ناخن ، حنا کم کم

ترے ہی تذکرے دیوارِ زنداں سے بھی ہوتے ہیں
کہاں تک ہیں بتا اے فصلِ گُل آخر ترے محرم

خفا بھی بے سبب اور خوش بھی وہ بے وجہ رہتا ہے
جفا کا بھی وہی عالم — وفا کا بھی وہی عالم

ترے آنے سے غم کا کوئی عنواں تو نکل آیا
وگرنہ وقت ہی اک زخم تھا اور وقت ہی مرہم

مزاجِ عشق میں بھی ایک امکاں ہے تغیّر کا
کچھ اس کی زلفِ برہم کچھ زمانے کی ہوا برہم

کوئی یاد آخر اس ہنگامۂ شب کی بھی رہ جائے
بکھر جا صبح سے پہلے بکھر جا ، کاکلِ برہم

(۱۹۵۱ء)

سنبھل نہ پائے تو تقصیرِ واقعی بھی نہیں
ہر اک پہ سہل کچھ آدابِ مے کشی بھی نہیں

اِدھر اُدھر سے حدیثِ غمِ جہاں کہہ کر
تری ہی بات کی اور تیری بات کی بھی نہیں

وفائے وعدہ پہ دل نکتہ چیں ہے وہ خاموش
حدیثِ مہر و وفا آج گفتنی بھی نہیں

بکھر کے حسنِ جہاں کا نظام کیا ہوگا
یہ برہمی تری زلفوں کی برہمی بھی نہیں

شکستِ ساغر و مینا کو خاک روتا میں
گراں ابھی مرے دل کی شکستگی بھی نہیں

ہزار شکر کہ بے خواب ہے سحر کے لیے
وہ چشمِ ناز کہ جو جاگتوں میں تھی بھی نہیں

یہ زندگی ہی تلوّن مزاج ہے اے دوست
تمام ترکِ وفا تیری بے رُخی بھی نہیں

تعلقاتِ زمانہ کی اک کڑی کے سوا
کچھ اور یہ ترا پیمانِ دوستی بھی نہیں

کرم کی وجہ نہ تھی بے سبب خفا بھی ہے وہ
مزاجِ حسن سے یہ بات دُور تھی بھی نہیں

(۱۹۵۲ء)

کیا ہوئے بادِ بیاباں کے پکارے ہوئے لوگ
چاک در چاک گریباں کو سنوارے ہوئے لوگ

خوں ہوا دل کہ پشیمانِ صداقت ہے وفا
خوش ہوا جی کہ چلو آج تمھارے ہوئے لوگ

یہ بھی کیا رنگ ہے اے نرگسِ خواب آلودہ
شہر میں سب ترے جادو کے ہیں مارے ہوئے لوگ

خطِ معزولیِ اربابِ ستم کھینچ گئے
یہ رسن بستہ صلیبوں سے اُتارے ہوئے لوگ

وقت ہی وہ خطِ فاصل ہے کہ اے ہم نفسو
دُور ہے موجِ بلا اور کنارے ہوئے لوگ

اے حریفانِ غمِ گردشِ ایّام ، آؤ
ایک ہی غول کے ہم لوگ ہیں ہارے ہوئے لوگ

ان کو اے نرم ہوا ، خوابِ جنوں سے نہ جگا
رات مے خانے کی آئے ہیں گزارے ہوئے لوگ

(۱۹۵۴ء)

❂

ثباتِ غم ہے محبّت کی بے رُخی آخر
کسی کے کام تو آئی یہ زندگی آخر

کوئی بتاؤ کہ ہے بھی تو اس قدر کیوں ہے
ہوا کو میرے گریباں سے دشمنی آخر

تری قبا تری چادر کا ذکر کس نے کیا
مگر فسانہ ہوئی بات اَن کہی آخر

ترے خیال نے سو رُخ دیے تصوّر کو
ہزار شیوہ تھی تیری سپردگی آخر

میں اپنی بات کا اپنے خیال کا ہوں حریف
گیا نہ سر سے مرے خبطِ سرکشی آخر

ہوا نے مانگ لیا آج تار و پو کا حساب
قبا بھی کیا کوئی حصّہ کفن کا تھی آخر

حنائے پا سے کُھلا اس کا شوقِ آرائش
نکل چلی تھی دبے پاؤں سادگی آخر

ہزار اس کے تغافل کی داستانیں ہیں
مگر یہ بات کہ وہ بھی ہے آدمی آخر

وہی ہیں گیسوئے جاناں کے خم وہی ہم ہیں
وہی ہے کش مکشِ ربطِ باہمی آخر

(۱۹۵۴ء)

۞

صلیب و دار کے قصّے رقم ہوتے ہی رہتے ہیں
قلم کی جنبشوں پر سر قلم ہوتے ہی رہتے ہیں

یہ شاخِ گل ہے آئینِ نمو سے آپ واقف ہے
سمجھتی ہے کہ موسم کے ستم ہوتے ہی رہتے ہیں

کبھی تیری کبھی دستِ جنوں کی بات چلتی ہے
یہ افسانے تو زلفِ خم بہ خم ہوتے ہی رہتے ہیں

توجہ ان کی اب اے ساکنانِ شہر تم پر ہے
ہم ایسوں پر بہت ان کے کرم ہوتے ہی رہتے ہیں

ترے بندِ قبا سے رشتۂ انفاسِ دوراں تک
کچھ عقدے ناخنوں کو بھی بہم ہوتے ہی رہتے ہیں

ہجومِ لالہ و نسریں ہو یا لب ہائے شیریں ہوں
مری موجِ نفس سے تازہ دم ہوتے ہی رہتے ہیں

مرا چاکِ گریباں چاکِ دل سے ملنے والا ہے
مگر یہ حادثے بھی بیش و کم ہوتے ہی رہتے ہیں

(۱۹۵۴ء)

فراق سے بھی گئے ہم وصال سے بھی گئے
سبک ہوئے ہیں تو عیشِ ملال سے بھی گئے

جو بت کدے میں تھے، وہ صاحبانِ کشف و کمال
حرم میں آئے تو کشف و کمال سے بھی گئے

اسی نگاہ کی نرمی سے ڈگمگائے قدم
اسی نگاہ کے تیور سنبھال سے بھی گئے

غمِ حیات و غمِ دوست کی کشاکش میں
ہم ایسے لوگ تو رنج و ملال سے بھی گئے

گل و ثمر کا تو رونا الگ رہا لیکن
یہ غم کہ فرقِ حرام و حلال سے بھی گئے

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزمِ خیال سے بھی گئے

ہم ایسے کون تھے لیکن قفس کی یہ دنیا
کہ پر شکستوں میں اپنی مثال سے بھی گئے

چراغِ بزم ابھی جانِ انجمن نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو ترے خط و خال سے بھی گئے

(۱۹۵۴ء)

ہزار وقت کے پرتو نظر میں ہوتے ہیں
ہم ایک حلقۂ وحشت اثر میں ہوتے ہیں

کبھی کبھی نگہِ آشنا کے افسانے
اسی حدیثِ سرِ رہ گزر میں ہوتے ہیں

وہی ہیں آج بھی اس جسمِ نازنیں کے خطوط
جو شاخِ گل میں جو موجِ گہر میں ہوتے ہیں

کُھلا یہ دل پہ کہ تعمیرِ بام و در ہے فریب
بگولے قالبِ دیوار و در میں ہوتے ہیں

گزر رہا ہے تو آنکھیں چرا کے یوں نہ گزر
غلط بیاں بھی بہت رہ گزر میں ہوتے ہیں

قفس وہی ہے جہاں رنجِ نو بہ نو اے دوست
نگاہ داریِ احساس پر میں ہوتے ہیں

سرشتِ گِل ہی میں پنہاں ہیں سارے نقش و نگار
ہنر یہی تو کفِ کوزہ گر میں ہوتے ہیں

طلسمِ خوابِ زلیخا و دامِ بردہ فروش
ہزار طرح کے قصّے سفر میں ہوتے ہیں

(۱۹۵۴ء)

دشنۂ تیز میں جس زخم کی گہرائی ہے
میرے سینے میں وہ پہلے سے اُتر آئی ہے

پیکرِ دوست کی اک چھوٹ ہے آئینے میں
خوابِ مستی میں کوئی شعلۂ مینائی ہے

میں نے اب گھر کی بھی زنداں سے ملا دی ہیں حدیں
یوں الگ بیٹھ کے جینے میں بھی رُسوائی ہے

یہ رسائی ہے تری تجھ کو مبارک غمِ دوست
دل نے بے تابیِ دوراں سے جِلا پائی ہے

ربط یک سلسلۂ کارِ ہم آہنگی ہے
عشق کو لوگ سمجھتے ہیں کہ ہرجائی ہے

کس سے کہیے کہ عبادت گہِ اربابِ نظر
سنگِ طفلاں ہے کہ زخمِ سرِ سودائی ہے

ختم پر سلسلۂ عہدِ بہاراں آیا
گرم اک صورتِ ہنگامۂ پیدائی ہے

اس شبِ تار میں مستوں کا سبو بھی ہے چراغ
رات اک شعلۂ آفاق چرا لائی ہے

کل سے کچھ اور تھا اندازِ غبارِ صحرا
شہر میں آج کوئی تازہ خبر آئی ہے

(۱۹۵۶ء)

✡

دِلوں کی عقدہ کشائی کا وقت ہے کہ نہیں
یہ آدمی کی خدائی کا وقت ہے کہ نہیں

کہو ستارہ شناسو فلک کا حال ، کہو
رُخوں سے پردہ کشائی کا وقت ہے کہ نہیں

ہوا کی نرم روی سے جواں ہوا ہے کوئی
فریبِ تنگ قبائی کا وقت ہے کہ نہیں

خلل پذیر ہوا ربطِ مہر و ماہ میں وقت
بتا یہ تجھ سے جدائی کا وقت ہے کہ نہیں

الگ سیاستِ درباں سے دل میں ہے اک بات
یہ وقت میری رسائی کا وقت ہے کہ نہیں

دلوں کو مرکزِ اسرار کر گئی جو نگہ
اُسی نگہ کی گدائی کا وقت ہے کہ نہیں

تمام منظرِ کون و مکاں ہے بے ترتیب
یہ تیری جلوہ نمائی کا وقت ہے کہ نہیں

(۱۹۵۶ء)

✿

حرم کا آئنہ برسوں سے دُھندلا بھی ہے حیراں بھی
اک افسونِ برہمن ہے کہ پیدا بھی ہے پنہاں بھی

نہ جا اے ناخدا دریا کی آہستہ خرامی پر
اسی دریا میں خوابیدہ ہے موجِ تند جولاں بھی

کمالِ جاں نثاری ہوگئی ہے خاکِ پروانہ
اسے اکسیر بھی کہتے ہیں اور خاکِ پریشاں بھی

وداعِ شب بھی ہے اور شمع پر اک بانکپن بھی ہے
حدیثِ شوق بھی ہے قصۂ عمرِ گریزاں بھی

نہ آئی یاد تیری ، یہ بھی موسم کا تغیّر تھا
کہ کشتِ شوق تھی پروردہ ہائے باد و باراں بھی

یہ دنیا ہے تو کیا اے ہم نفس تفسیرِ غم کیجے
وہی آدابِ محفل بھی وہی آدابِ زنداں بھی

شعاعِ مہر ہے اور التزامِ زخم و مرہم ہے
یہ داغِ لالہ بھی ہے شعلۂ لعلِ بدخشاں بھی

(۱۹۵۶ء)

✡

شمارِ درد کے پیدا ہوئے ہیں کچھ امکاں
بدل کے شیشۂ ساعت ہوا ہے شیشۂ جاں

اب اس قدر نہ بڑھا دستِ چارہ ساز کی بات
رکھی تھی زخم نے بنیادِ کاوشِ درماں

خدا گواہ کہ تیرے سوا مجھے بھی نہیں
کسی سے رنجشِ بے جا کا اس قدر بھی گماں

بڑھا گئی خطِ پیمانۂ وفا دل کا
لہو میں ڈوب کے بے اختیار نوکِ سناں

مسافروں کو فقط سایۂ درخت ملا
ہزار بابِ کرم صد ہزار پرسشِ جاں

شعاعِ مہر سے اک چشمِ نیم وا کی طرح
فضائے صبح میں روشن ہے روزنِ زنداں

ہزار مہر ہیں اور اک اُفق کی بے تابی
بساطِ دیدۂ بینا ، تغیّراتِ جہاں

چراغِ خلوتِ جاناں تجھے خدا رکھّے
زمیں سے تا بہ اُفق چھا رہا ہے ایک دھواں

یہی تھی زخمۂ تارِ رگِ گُلو آخر
یہ نوکِ خار نہ تھی عندلیبِ نوحہ کناں

ترے نثار رویّے نہیں بدلتے ہیں
ہزار کوس کی منزل ہو درمیاں مری جاں

(۱۹۵۶ء)

نقشے اسی کے دل میں ہیں اب تک کھنچے ہوئے
وہ دورِ عشق تھا کہ بڑے معرکے ہوئے

اتنا تو تھا کہ وہ بھی مسافر نواز تھے
مجنوں کے ساتھ تھے جو بگولے لگے ہوئے

آئی ہے اس سے پچھلے پہر گفتگو کی یاد
وہ خلوتِ وصال وہ پردے چھٹے ہوئے

کیوں ہم نفس چلا ہے تو ان کے سراغ میں
جس عشقِ بے غرض کے نشاں ہیں مٹے ہوئے

یہ مے کدہ ہے اس میں کوئی قحطِ مے نہیں
چلتے رہیں گے چند سبو دم کیے ہوئے

کل شب سے کچھ خیال مجھے بت کدے کا ہے
سنتا ہوں اک چراغ جلا رَت جگے ہوئے

میری وفا ہے اس کی اداسی کا ایک باب
مدّت ہوئی ہے جس سے مجھے اب ملے ہوئے

اللہ رے فیضِ بادہ پرستانِ پیش رو
نکلے زمیں سے شیشۂ مے کچھ دبے ہوئے

میں بھی تو ایک صبح کا تارہ ہوں تیز رو
آپ اپنی روشنی میں اکیلے چلے ہوئے

(۱۹۵۶ء)

کرم کا بھی کوئی امکاں کُھلے تو بات چلے
اِس التفات کا عنواں کُھلے تو بات چلے

کسی سے ہم بھی کہیں اس کی داستانِ وصال
مگر وہ زلفِ پریشاں کُھلے تو بات چلے

جفا بہ سلسلۂ صد ہزار عنواں ہے
قمیصِ یوسفِ کنعاں کُھلے تو بات چلے

طلسمِ شیوۂ یاراں کھلا تو کچھ نہ ہوا
کبھی یہ حبسِ دل و جاں کُھلے تو بات چلے

سفر ہے اور ستاروں کا اک بیاباں ہے
مسافروں سے بیاباں کھُلے تو بات چلے

سلگ رہا ہے افق بجھ رہی ہے آتشِ مہر
یہ رازِ ربطِ گریزاں کھُلے تو بات چلے

کس انتظار میں تھی روحِ خود نمائیِ گل
برس کے ابرِ بہاراں کھُلے تو بات چلے

(۱۹۵۶ء)

یہ فضائے ساز و مطرب یہ ہجومِ تاج داراں
چلو آؤ ہم بھی نکلیں — بہ لباسِ سوگواراں

بہ فسونِ روئے لیلیٰ بہ عذابِ جانِ مجنوں
وہی حسنِ دشت و در ہے بہ طوافِ جاں نثاراں

غمِ کارواں کا آخر کوئی رُخ نہ اس سے چھوٹا
وہ حدیث کہہ گئی ہے یہ ہوائے رہ گزاراں

وہ تصورِ برہمن جو صنم کو ڈھالتا ہے
رخِ نقش پر بھی آیا بہ سپاسِ نقش کاراں

بہ خیالِ دوست آخر کوئی خوابِ ہم کناری
کوئی خوابِ ہم کناری شبِ خوابِ بے قراراں

سرِ کشتِ غیر کیا کیا یہ گھٹا برس رہی ہے
کوئی ہم سے آ کے پوچھے اثرِ دعائے باراں

وہ شکستِ خوابِ محفل وہ ہوا کے چار جھونکے
لگی دل پہ تیر بن کر دمِ صبح یادِ یاراں

(۱۹۵۷ء)

سمندر کا بوڑھا خدا

تیری ارضِ وطن کل سمندر کے بوڑھے خدا کا نشیمن تھی اے جانِ جاں
اور سمندر کے بوڑھے خدا کی بہت تیز موجِ نفس سے سفینے ترے ملک کے
بادبانِ گرہ خوردہ میں باندھ لیتے تھے موجِ ہوا کو
چیر جاتے تھے موجِ بلا کو
ہر دُخانی سبک سیر کشتی کی آواز پر چونک اٹھتا تھا تاریک جغرافیہ، ایشیا کی زمیں
چونک اٹھتی تھی

کل ترے ملک کی تاجری قفل گودام میں جڑ گئی تھی
دیو قامت تنومند مشرق کے پائے طلب میں
حسابات کی ایک زنجیر سی پڑ گئی تھی

آج بوڑھے خدا کے حریفوں میں موجِ ہوا ہے
کرم خوردہ سفینوں کی رَو
سرنگوں بادبانوں میں چہرہ چھپائے ہوئے محوِ شیون ہے
وہ ہواؤں کے جن جو اشاروں ہی سے کھینچ لاتے تھے تیرے وطن
تک ایک حبشی کنیز کی مانند، تاریک چادر میں لپٹی ہوئی
ایشیا کے بیاباں سے صد شیوہ و کار اشیا کی جنسِ گراں مایہ
اے جانِ جاں،
وہ ہواؤں کے جن سو گئے
کفشِ پا تھے جو طوفاں سفینوں کے اب کھو گئے
تیری ارضِ وطن روشنی کا ستوں تھی کبھی
اس کی قندیلِ گرداں سے روشن رہیں
قلزموں کی سیاہی کے اہرام میں سونے والی چٹانوں کی پیشانیاں
دور گرداب سامانِ نہنگانِ خوں ریز کے ایک انبار پر نیم پیدا سی
کچھ وقت کی جھائیاں

تیری ارضِ وطن کے دریدہ کہن بادبانوں سے ہے جانِ جاں
آج بے رَو ہواؤں کی جنگ
عرصۂ زندگی ہے سفینے پہ تنگ
ایک ننھے پرندے کی مانند تو بھی مرے ملک میں آشیاں ساز ہے

دانہ و دام کی عافیت میں گرفتار ہے
خوردہ خوردہ اجالوں میں بٹنے لگیں ساری تابانیاں
بجھ گئی مشعلِ حیلہ گاہِ فرنگ

آج دریوزہ گر ہے سمندر کے بوڑھے خدا کی بھی موجِ نفس
خانۂ مزد سے قرض لیتا ہے یہ قوتِ بازوئے بال افشاں کبھی
داد و بینش کے رمزِ کہن کے جو کاہن ترے ملک میں روحِ فردا پہ قابض تھے،
فاؤسٹ کی مشق کرتے ہیں تنہائی میں
کاسۂ رمزِ جادوگری کے لیے
روح کو تولتے ہیں ترازوئے دانائی میں
صورتِ مارِ گنجینۂ زر پہ بیٹھے ہوئے تاجروں کو
پیالہ کوئی شیر کا دے کے موجِ لہو میں سموتے ہیں زہراب کو

جانِ جاں اب ترے ملک کی دسترس سے بہت دور ہیں
چین اور ہند کے بت کدے
جاگتی ہے برہمن کی آنکھ
اس کا معبود سوتا رہے
بے خبر کچھ ہمالہ نہ برفِ کہن سالہ ہے
شعلۂ تند تریاکیاں کچھ نہ پوچھ

آج بھی کوئی سلکِ فراست زمیں دوز بارود کے خطِ آتش نفس کی طرح کر ہی
جاتا ہے

بے حس سلوں کو دو نیم

کیا نیستاں نیستاں سلگتا ہے
ایشیا کا سوادِ عظیم!

جانِ جاں اب سمندر کے بوڑھے خدا کو فراموش کرنے کی ساعت ہے
تیری ارضِ وطن کے لیے آج روزِ قیامت ہے
کوئی تازہ ہوا کوئی موجِ نفس قرض دیتا نہیں
آج بوڑھے خدا کی لہو ریز آنکھوں میں طوفاں کو طاقت کی اک رَو
کوئی دادرس قرض دیتا نہیں

میں بھی ناقد ہوں تیرے وطن کا مگر
تو مرے ملک میں ایک ہجرت زدہ طائرِ اجنبی کی طرح آشیاں ساز ہے
میں پرندے کی ہجرت کا شاکی نہیں
آشیاں کو ملیں صبح کے نور سے گرمیاں
بادِ صرصر میں تیرا نشیمن رہے
سبز و شاداب اوراق کے درمیاں
اک بئے کے سبک گھونسلے کے لیے آج بھی باغ میں کتنے اشجار ہیں

بھول جا اب سمندر کے بوڑھے خدا کو دریدہ کہن بادباں کو
ہوا کو، روحِ نیلسن پکارے تو کہنا ترے ملک کی ناخدائی کا
عہدِ گراں مایہ — ساحل پہ اک عالمِ جاں کنی میں ہے،
آج آخر سمندر کے بوڑھے خدا کو وہی قلزموں کی سیاہی سلانے لگی ہے،
— جو کل اس کا بیرق تھی!

(۱۹۶۰ء)

آبادی کے دائرے

اے برادر ، رازداں ، مکّار قاری کچھ نہ پوچھ [☆۱]
یہ سرِ قرطاس آبادی کے لاکھوں دائرے
کس کے یہ تابوت ہیں کس کی عماری کچھ نہ پوچھ

سرد تاریکی میں دھندلے دائرے کھوئے ہوئے
بے نکائی کھیتیاں تشکیک کی ہیں دُور تک
بیج چوب و دار کے الفاظ میں بوئے ہوئے

☆۱۔ نظم کا پہلا مصرع بودلیئر کی نظم To My Reader کا آخری مصرع ہے:

Oh my hypocrite reader, my twin, my brother

—***Baudleire***

دائرے تاریک ، خونیں ، آتشیں ، ژولیدہ مُو
آپ خود اپنا غیاب اور آپ خود اپنا حضور
جنبشِ پرکار کا دوڑا نہیں جن میں لہو

نیشِ عقرب کی طرح حرص و ہوا کی بے کلی
دل زدوں کے دائرے تیرہ طلب کی بارکیں
رشک کے تاریک کوچے خوف کی اندھی گلی

ٹین کے ڈبّے ، پرانی بوتلیں میراثِ جد
علم کی بے حس کمیں گاہیں کہ جن کی اوٹ سے
کاٹ دی ہے دیمکوں نے زندگی کی تازہ حد

مہ وشانِ نیم رُخ کے دائرے عصیاں کے خواب
آسیا گرداں بتول و مریمِ تنہا نشیں
آتشِ خوابِ زلیخا ، روزنِ زنداں کے خواب

اک بدن رقاصِ حبشی ، آبنوسی اک شجر
طبل کی آواز سے جفتی درندوں کی عیاں
مہ وشانِ نیم عریاں کی بلوتی ہے ، کمر

ٹینک سے دبتے ہوئے بیجوں میں فصلیں بے سبیل
رحم میں تاریخِ افلاسِ جہاں لب پر سوال
خشک سالی، خشک سالی سے زمیں کے رُخ پہ نیل

سخت تریاکی دھویں میں ضو فشاں محنت کی آنکھ
سوئیاں بے تاب ، میٹر گیج ہیں محوِ شمار
پڑھ رہی ہے ایک تحریرِ رواں میٹر کی آنکھ

ساحلوں کے جِن ہیں خوابیدہ جہازوں کی قطار
پی رہے ہیں رات کی نیلی سیاہی میں لہو
دُور تک پٹرول کے چشموں پہ گرگِ ریش دار

دائرے زرخیز چٹیل آب و روغن کے حصار
بطنِ معدن آگ دریاؤں کے چہرے آئنے
حلقہ ہائے باد و باراں کشت و خرمن کے حصار

بیمِ شب دل میں، مگر رم خوردہ سیاروں کے کھیل
بازیِ چوگاں خداؤں کی بساطِ خاک پر
خون منہ کو لگ گیا ہے ایسے اوتاروں کے کھیل

وقتِ بے تقویم کے ذوقِ جنوں کے رازداں
سر بریدہ جرأتیں روندی ہوئی لاشوں کے غم
زندگی کی دوڑ میں یک نیزہ خوں کے رازداں

اے برادر یوں نہ جا ان دائروں کے درمیاں
تیرتا ہے اس فضا میں اک ہجوم ارواح کا
اس طرف دوزخ کی آبادی کا آتا ہے دھواں

دائرے وہ زندگانی کے سفر کی راہ میں[☆۲]
راستہ کھویا ہوا تاریک جنگل کا محیط
روشنی آتی نہیں ہے علمِ بے آگاہ میں

(۱۹۶۰ء)

☆۲۔ نظم کا آخری بند دانتے کی ''ڈیوائن کامیڈی'' کا پہلا بند ہے:
In the middle of the journey of our life—
I come to myself within a dark wood where
the straight was lost
—*Dante*

کوئی شاخِ آشنا

شہر پر نیلے دُھویں کی سامری زنجیر ہے
جل رہا ہے سینۂ خورشید میں داغِ غروب
روشنی مجروح طائر کی طرح دل گیر ہے

کچھ غلامانِ کہن پرچھائیاں حبشی نژاد
کھینچنے نکلی ہیں عصیاں کا سبک رفتار رتھ
وقت کی جنبش بدی کے چاک کو دیتی ہے داد

خواب و بیداری کے تیرہ فاصلوں کے درمیاں
کتنے اندیشوں کی بے حلقہ جریبیں کھول کر
ناپتا ہے اس خلا کو ایک وقتِ رائگاں

رات کے ہاتھوں چلے جانے کو ہیں نیلام میں
شہر ، بندرگاہ ، سیّارے ، سمندر ، روشنی
دُور تک بکھری ہوئی اشیا ہیں اک گودام میں

جزر و مد کے پیچ میں ساحل کا ساکت پاؤں ہے
سو رہے ہیں جن جہازوں کے قطار اندر قطار
سینۂ قلزم میں گم ہوتی ہوئی اک چھاؤں ہے

روحِ قزاق و سکندر گفتگو میں محو ہے
ان حریفانِ تلاطم سے بھی سر ہوتا نہیں
قلزمِ بے تاب کس کی آرزو میں محو ہے

دُور تک ہے اس فضا میں خواب و بیداری کی جنگ
شہر سے گزری ہے آوارہ ہوا ترکش بدوش
جانے کس سینے میں اُترے آخرِ شب کا خدنگ

دُور تاریکی کی چادر سے شرر اڑتے ہوئے
رات کے جنگل کا جادو ریلوے کی ورک شاپ
اک دھویں میں آہنی فیلوں کے دل مڑتے ہوئے

اس فضا میں وقت دردِ ہجر و آغوشِ وصال
اک ثمر جو نصف تازہ ، نصف کرم آلودہ ہے
اک حقیقت طالبِ قرب اور اک دُوری کا جال

چشمکِ ادراک کے خوابِ جنوں کے مرحلے
طعنۂ نایافت دیتی ایک روحِ ابر و باد
مرگ کی قوسیں تغیّر کے ہزاروں سلسلے

اس فضا میں وقت روحِ جنبش و جانِ جمود
تتلیوں کے پر پہل رویوں کے نازک جسم میں
استخوانوں سے لپٹتی خستگی کی موجِ دُود

آرزوئے زندگانی اجتنابِ زندگی
کربِ تولید و فشارِ جاں کنی کی ساعتیں
درد کے اعشاریوں میں اک حسابِ زندگی

اے دل اے پامالِ جانان اے مری بے تاب روح
ڈھونڈ تو بھی درد کے تنہا نشیمن کے لیے
کوئی شاخِ آشنا بے آشیاں بے خواب روح

(۱۹۶۰ء)

قصیدۂ شب

رات اے نیلی سیاہی اے سکون و رم کے دام
تیرے بطنِ تیرہ میں ہیں نیک و بد کی کیاریاں
ہر تغیّر کو تری موجِ نفس ہے اک نیام

تیرا بطنِ تیرہ مٹی کھیت کی سیرابِ وصل
آفریدہ تیری اندیشوں کی نازک بالیاں
روحِ فردا سے ہم آغوشی کی طالب تیری فصل

تیرے چہرے سے عیاں ہے تیرے پیڑو کی چلک
ناف کی زنجیرِ جنباں وہ دمِ نو آفرید
شیشۂ جاں جاگ اٹھے درد کی ایسی چمک

سازشوں سے جلنے والی کوکھ شرمائی ہوئی
بسترِ اغیار کے بے سوز ہنگاموں کے بعد
جبر کے ہاتھوں تعلّق کی سزا پائی ہوئی

ماں تری اولاد قاتل چور مجرم داغ ، درد
ثپرکِ مارِ سیہ خنزیر ناخن ڈنک زہر
کینہ پرور سایے اک کھلتی ہوئی عصیاں کی فرد

سنگِ اسود چشم سرمہ سا ہر اک تیری مثال
تجھ سے صندل کی مہک سانپوں کی مستی جسم میں
بوئے عنبر تیری خو تیری گرہ نافِ غزال

خاک بر سر عشق کی بالینِ غم پر تیرا ہاتھ
عصمت و عصیاں کی بے ترتیب نیندوں کے لیے
ایک رمزِ پردہ داری ہے ترے دامن کا ساتھ

تیری نرمی اک کلیدِ قفل و چارہ سازِ غم
اَدھ کھلے احساس کے در پر سبک پرچھائیاں
خواب کے دامن پہ جب رکھنے کو ہوں پہلا قدم

تیری شبنم کی سبد رازوں سے پُر ہوتی رہی
نرم ہونٹوں میں محبت بوسۂ اوّل کا بیج
عہد و پیماں کی حدوں میں دُور تک بوتی رہی

تیری تاریکی میں ہے سامانِ زخم و اندمال
عصمتِ آب و ہوا تقدیسِ ہر شاخ و ثمر
سینۂ معدن سے لاکھوں جھانکنے والے سوال

تارپیڈو کی سلگتی آنکھ دیتی ہے گواہ
نیند بیداری کی یلغاروں میں ہے حدِ اماں
سو گئی ہے خندقوں میں جاگنے والی سپاہ

تو نے کم کر دی اُداسی کتنے خط و خال سے
کس قدر جلتے ہوئے زخموں کو مرہم مل گیا
اک ترے تازہ حریری اوس کے رومال سے

تیری خاموشی فشارِ حرف سے جنگاہ ہے
کچھ صفیں مجروح لفظوں کی ہیں اور معنی کی حد
استعاروں کی کوئی موجِ نفس میں راہ ہے

بطنِ مادر ایک زنداں ، زندگی خانہ بدوش
تیری تاریکی میں چھپ جاتا ہے احساسِ زیاں
حدِ نامعلوم کا جادو ہے یہ فردا و دوش

لوریاں دیتی ہے تیری تیرگی احساس کو
تیرے چشمے سے کوئی رِستی ہوئی پانی کی بوند
اک نفس کو جو بجھا دے آدمی کی پیاس کو

(۱۹۶۰ء)

درونِ خانہ

سرد نیلی اوس میں عریاں بدن
رقصِ بسمل کر رہی ہے رات آج
اک نشیبِ رہ گزر میں بے مکاں
شپرک سایوں کی بے انفاس رَو
آبنوسی بازوؤں کے درمیاں
پینگ لیتی تا رگِ جاں آئی ہے
اور اس پتھر کی سِل پر معتکف
بے حسی کی سرد بے جاں کائی ہے

• دُور کچھی بارکیں ہیں سرنگوں
آپ خود اپنی ملامت کا ہدف
خشتِ پردہ دار ہے زار و زبوں
کہنگی کی شرم پر منہ ڈھانپتی

زنگ خوردہ نیم خوابیدہ بسیں
بڑبڑاتی شکوہ کرتی کانپتی
گرد کی لرزاں فصیلوں سے اُدھر
ڈھونڈنے نکلی ہیں رمزِ زندگی
اک سوالِ غم ہے یہ سودائے سر
کس سے پوچھے کوئی راہِ استوار
وقت کی گردش ہے اک طوقِ سوال
مہر بر لب زندگی ہے سنگسار

نیم گرداں شمعیں ہیں گردابِ حال
شہر کے گوشے میں روشن ٹارمیک
اک ہتھیلی پر ہے سیّاہی کا جال
زندگی کی آرزو بازار میں
بے کرم بوڑھے یہودی کی طرح
قرض دیتی ہے جنوں کو بار میں
اک ندی بے آب فریادی حزیں
ایک شیدی ڈھول کی آواز ہے
بانجھ سناٹوں میں بے سوزِ یقیں
روح کبریتی کا آسیبی خرام

مال گاڑی کی جبیں کا چاند ہے
اوس کے آبی دُھویں میں شعلہ فام

دُور اک راڈار ہے چالاک دید
پر عقابوں کے سرِ مژگاں لیے
آنکھ کے تِل میں مسِ خام و حدید
آہنی بے اشک حسرت بے گداز
دوست ہے محروم دشمن سے الگ
خجلتِ نظارگی سے بے نیاز
دانشِ حاضر کی سفّاکی لیے
آنکھ کے ڈوروں میں روحِ مخبری
دوڑتی ہے روحِ چالاکی لیے

سایۂ زر تک گئی ہے بے پری
کھینچتی ہے ایک تازہ زاویہ
اک خطِ ساکن سے روحِ تاجری
اپنے خس خانوں میں روحِ احتیاط
نغموں کے تازہ ثمر رکھتے ہوئے
کھولتی ہے ایک بابِ ارتباط
نرم آوازوں میں دانائی کی دھار

گفتگو کی ایک تازہ قاش سے
محوِ دل جوئی سفیرانِ کبار

کس جگہ آئی ہے تو اے یادِ یار
وقت کے اس دشتِ غربت میں ابھی
تجھ سے کتنے خلوتی ہیں بے دیار
طائرِ ہجرت زدہ ہے زندگی
دشت اندر دشت قحطِ آب ہے
کچھ سرابوں سے ہے دم میں تازگی
دل کوئی حدِ وطن رکھتا نہیں
آدمی اک آدمیت کے سوا
اور کوئی پیرہن رکھتا نہیں

وقت کے ذرّے لہو میں گڑ گئے
عقربِ ساعت کی نیشِ تیز سے
نیل سے دیوارِ دل میں پڑ گئے
خانۂ تسلیمِ جاں ہے جس طرف
حرصِ قربت میں اک آوارہ ہوا
رخشِ جولاں آگئی ہے اس طرف
دل کی دیوارِ ابد پیوند میں

ہم کنارِ خشتِ پردہ دار تھی
روحِ فردا اک لباسِ گرد میں
بے عناں موجِ ہوا کو ٹوکتی
منہدم ہوتی ہوئی دیوار کو
غم کے زخمی بازوؤں سے روکتی

منّتیں کرتی کہ اے خونیں ہوا
یہ سرا پردہ ہے بے نقشِ قدم
اے ہوا اس سمت ہے سوئی ہوئی
ساعتِ آئندگانِ تازہ دم
دل کی دیوارِ شکستہ سے اُدھر
سرکشی کی بیل میں کھلتی ہوئی
نرم کلیوں میں نمو ہے کارگر
تازہ بوسوں سے لبِ پیماں ہے گرم
دل کے سایے میں کھڑی ہے شادماں
روحِ آدم لے کے اک عصیاں کی شرم
اس سوادِ وقتِ بے زنجیر میں
تو کہیں اندر نہ رکھ دینا قدم
عرصہ گاہِ خانۂ تغیّر میں

(۱۹۶۰ء)

آخری رات

آج مرے دل کی ویرانی
دھیرے دھیرے بول اٹھی ہے
میرا کام نہیں سمجھانا
لیکن کس کو راس آیا ہے
ایسی رات میں باہر جانا
راہ سوالوں کا اک بن ہے
بے مشعل بے مونس چلنا
یہ سب اک دیوانہ پن ہے
گشت میں ہے کتوال نگر کا
اس کی آنکھوں میں نقشہ ہے
سب گلیوں کا سارے گھر کا

اور تم دیوانے ہو اب تک
پاؤں کا تم کو ہوش نہ سر کا

لیکن مجھ ایسے دیوانے
بیٹھ کے کیسے جی سکتے ہیں
ایسا عشق سبق دیتا ہے
مکتب کے دروازے ہی پر
کفش و کلہ رکھوا لیتا ہے

حرفِ صداقت لکھواتی ہے
تختی لکھنا کھیل نہیں ہے
دل کی طاقت لکھواتی ہے
دل رکھّے تو ہمت رکھّے
جرمِ عشق کیا ہو جس نے
وعدۂ یار کی عزت رکھّے
عشق پہ ہے تعزیر پرانی
میرے لب سے کیوں رُسوا ہو
اندھوں میں سچ کی عریانی

رات اندھیری ہے اے دلبر
لیکن جب بھی آنکھ کھلی ہے
کوئی کرن سا نازک خنجر
دل کے اندر گھوم گیا ہے
دستِ ستم سے پہلے آ کر
میری چوکھٹ چوم گیا ہے

(۱۹۶۰ء)

بوئے گل محوِ سفر خود ہے ہوا کے مانند
کون اس راز کو سمجھے گا صبا کے مانند

کوئی افسوں نہیں اس نیم نگاہی سے سوا
کوئی جادو نہیں اس زلفِ دُوتا کے مانند

میں ترے شہر کے گردوں سے الجھتا ہی رہا
ایک رَم خوردہ ستارے کی ضیا کے مانند

اس نے کچھ پچھلے پہر گوشِ محبت میں کہا
نرم شبنم کی طرح ، شوخ صبا کے مانند

وادیِ شوق میں چپ چاپ نکل جاتی ہے
جرسِ دُور کی آواز ، ہوا کے مانند

رخِ جاناں پہ ہوا صورتِ یک موجِ خیال
ہر تغیّر کا اثر آب و ہوا کے مانند

چارہ گر عاجز و تقریبِ عیادت موقوف
درد نے کام کیا آج دوا کے مانند

کیا کہیں وہم پرستی میں یہ رنگ آتا ہے
بت کدے میں بھی کوئی ہوگا خدا کے مانند

دیکھ اس راہ میں اے زلفِ گرہ گیر نگار
اور بھی شوخ ہوائیں ہیں صبا کے مانند

یک دگر ہو کے بھی اسلوب کی خاطر آخر
کوئی مٹتا ہے حنائے کفِ پا کے مانند

خانۂ دل میں در آئی ہے تری یاد اے دوست
اک تلاطم کی طرح، سیلِ بلا کے مانند

(۱۹۵۷ء)

✡

جی ہے بہت اداس طبیعت حزیں بہت
ساقی کوئی پیالۂ مے ، آتشیں بہت

دو گز زمیں فریبِ وطن کے لیے ملی
ویسے تو آسماں بھی بہت ہیں زمیں بہت

ایسی بھی اس ہوا میں ہے اک کافری کی رَو
بجھ بجھ گئے ہیں شعلۂ ایمان و دیں بہت

بے باکیوں میں فرد بہت تھی ، وہ چشمِ ناز
دل کی حریفِ ہو کے اٹھی شرمگیں بہت

پیکار خیر و شر سے گزر آئی زندگی
تیری وفا کا دور تھا ، عہد آفریں بہت

فریاد تھی چکیدۂ خونِ گلو تمام
نغمہ بھی ہم صفیر ، تھا کارِ حزیں بہت

اے دل تجھی پہ ختم نہیں داستانِ عشق
افسانہ خواں ملے ، مژہ و آستیں بہت

ایسی ہوا میں گھر سے نکلنے کی جا نہ تھی
ورنہ تمھاری بات کا آتا یقیں بہت

اے انقلابِ رنگ طبیعت سنبھالنا
ہم بھی اٹھے ہیں بزم سے اب کے حزیں بہت

(۱۹۵۷ء)

لب کشائی سے مری جان پہ بن آئی ہے
بے نقاب آئی تو یوں روحِ سخن آئی ہے

دفترِ نامہ نویساں میں لکھی جا نہ سکی
یوں ترے کام مرے جی کی لگن آئی ہے

کل کوئی تذکرۂ زندہ دِلاں نکلا تھا
کل بہت یاد حریفانِ کہن آئی ہے

یہ بھی کم فرصتیِ دل کا فسانہ تو نہیں
یہ جو اک روزنِ زنداں پہ کرن آئی ہے

وقت کی رو جو سرِ دشتِ وفا دھندلی تھی
کس قدر صاف سرِ دار و رسن آئی ہے

سرکشی کا بھی اک انداز ہے اے پائے جنوں
اب مرے پاؤں میں زنجیرِ وطن آئی ہے

(۱۹۵۹ء)

✪

نظر میں سلسلۂ روشنیِ فردا سے
ہوئے ہیں تا بہ اُفق کچھ سواد پیدا سے

ہزار حیف کہ اب مے کشوں کو یاد نہیں
روایتیں جو عبارت تھیں جام و مینا سے

مئے کہن کو فسونِ مسیح دے ساقی
یہ گفتگو ہے حریفانِ بادہ پیما سے

کسی کی خاک سے مینا کسی کی گِل سے سبو
جو مے کدے میں تھے لوٹ آئے جا کے دنیا سے

اک اور موجِ بلا کا سرودِ غرقابی
مرا سفینۂ غم چاہتا ہے دریا سے

انھیں بھی گردشِ پرکارِ آرزو جانو
وہ دائرے جو کھنچے میری لغزشِ پا سے

اک اور مرحلۂ قرب میں ہے عشق کی رات
شبِ وصال کے بعد اب تری تمنّا سے

(۱۹۵۹ء)

۞

تازہ ہوا بہار کی دل کا ملال لے گئی
پائے جنوں سے حلقۂ گردشِ حال لے گئی

جرأتِ شوق کے سوا خلوتیانِ خاص کو
اک ترے غم کی آگہی تا بہ سوال لے گئی

شعلۂ دل بجھا بجھا، خاکِ زباں اُڑی اُڑی
وحشتِ ہزار دام سے موجِ خیال لے گئی

رات کی رات بوئے مے کوزۂ گِل میں بس گئی
رنگِ ہزار مے کدہ روحِ سفال لے گئی

تیز ہوا کی چاپ سے تیرہ بنوں میں لو اٹھی
روحِ تغیّرِ جہاں ، آگ سے فال لے گئی

نافۂ آہوے تتار زخمِ نمود کا شکار
دشت سے زندگی کی رَو ایک مثال لے گئی

ہجر و وصال و نیک و بد گردشِ صد ہزار و صد
تجھ کو کہاں کہاں مرے سروِ کمال لے گئی

نرم ہوا پہ یوں کُھلے کچھ ترے پیرہن کے راز
سب ترے جسمِ ناز کے رازِ وصال لے گئی

ماتمِ مرگِ قیس کی کس سے بنے گی داستاں
نوحۂ بے زباں کوئی چشمِ غزال لے گئی

(۱۹۶۰ء)

کچھ کرم ہم گوشہ گیروں پر بھی فرمایا کرو
شہر میں آتے ہی رہتے ہو اِدھر آیا کرو

زندگی ہے دام اندر دام دل کی کیا بساط
اک گرفتارِ بلا کو ، لاکھ سمجھایا کرو

ہم سفر بر حق مگر اک جائے رشکِ غیر ہے
آدمی کم بخت کوئی معتبر لایا کرو

ساکنانِ شہر ، میں ہی مے کدے کی جان ہوں
کچھ مرے حق میں دعائے خیر فرمایا کرو

دوزخ و جنّت ہے آپ اپنی لبِ لعلیں کی آگ
نیک و بد کی بحث میں اس کو نہ الجھایا کرو

میں تو اُس کافر کا ہو کر رہ گیا، اے ہمدمو
تم تلاشِ آدمی میں دُور تک جایا کرو

روحِ صد جاں دادگانِ ابر و باد آوارہ ہے
اس فضا میں شام سے پہلے ہی گھر آیا کرو

(۱۹۶۰ء)

وہی داغِ لالہ کی بات ہے کہ بہ نامِ حسن اُدھر گئی
کوئی کیا کہے کہ کہاں کہاں ترے خالِ رُخ کی خبر گئی

کوئی ہاتھ دشنۂ جاں ستاں کوئی ہاتھ مرہمِ پرنیاں
یہ تو ہاتھ ہاتھ کی بات ہے کوئی وقت پا کے سنور گئی

وہی ایک سود و زیاں کا غم جو مزاجِ عشق سے دُور تھا
وہ تری زباں پہ بھی آ گیا تو لگن ہی جی کی بکھر گئی

کسی ایک سلسلۂ وفا کی متاعِ زلفِ دُوتا نہیں
کوئی پیچ و تاب ہوا ملے کہ وہ زلف تا بہ کمر گئی

یہ شکایتِ در و بام کیا یہ رباطِ کہنہ کی رات کیا
کوئی بے چراغ شبِ وفا ترے شہر میں بھی گزر گئی

اسی زندگی کے ہزار اُفق اسی زندگی کے ہزار رُخ
اسی اک خیال کی رَو تھی وہ جو تری جبیں پہ بکھر گئی

وہ ہزار شوق کی لغزشیں مگر ایک لذتِ نارسی
مری آشنائے طرب نظر ترے رخ پہ آ کے ٹھہر گئی

کبھی آتشِ خس و خار سے بھی گُلوں کو ذوقِ نمو ملا
کبھی شاخِ گل سے لپک، اٹھی وہ سناں جو تا بہ جگر گئی

وہ زبانِ سرمدِ بے دلیل وہ خراشِ خنجرِ حکمراں
کوئی امتحانِ دلیل کیا کہ دلوں میں بات اُتر گئی

وہ غریبِ شہر کہے بھی کیا جو تری زباں سے ہے بے خبر
مگر ایک راہِ سخن بھی ہے کہ یہ زندگی ہے جدھر گئی

(۱۹۶۰ء)

شہر کی صبح

مضمحل تن بہ تقدیر، ٹوٹی بسوں کی قطاروں سے
شورِ فغاں
زخم آلودہ وحشی درندوں کے غوغا کے مانند اُٹھا ہے

اور کھرچنے لگی ہے کسیلے دُھویں کے سیہ لیپ کو
کوئی تازہ خنک روشنی
رہ گزاروں سے

٭

اور اُجالے کے دُھندلے کناروں سے
کچا دُھواں، کچھ مکانوں سے اُٹھا ہے
نرخِ بازار کا اونگھتا جن

نیم وا نیم بستہ دکانوں سے اُٹھا ہے
رات کی رات اک حدِ مقتل سے نکلا ہوا شہر
لوٹا ہے طوقِ گلو لے کے
اک معبدِ زندگی کی طرف
اوک میں کچھ لہو لے کے

راہ میں جاں نثاری کی شاخِ ابد آشنا سر جھکائے کھڑی ہے
اک نئے سر سے ذوقِ نمو لے کے

(۱۹۶۱ء)

اے گھومتے لمحوں کے چاک

رات کی آوارہ روحوں کا شوالہ جاگ اٹھا
اک دُھواں مجمر سے اٹھا ہے سوال اندر سوال
شبنمِ خفتہ کے مس سے داغِ لالہ جاگ اٹھا

دور اک واماندۂ شب خستہ سگنل کے قریں
اک پرانے پوسٹر سے جھانکتی ہے روحِ شہر
اک متاعِ دست گرداں بے تعلق بے یقیں

بلیک کے سودوں میں روحِ تاجری ہے بے لباس
چور دروازے حسابوں کے ہوئے ہیں نیم وا
کھنچ رہے ہیں نرخ کے فیتوں پہ کچھ خطِ قیاس

کوئلے کی روحِ تیرہ فام یا گوہر فروش
قیمتِ آخر کی رَو میں دل زدہ آبِ گہر
پوچھتی ہے کون میری اصل کا ہے پردہ پوش

مانگتی ہے روحِ شب بے خوابیاں تاروں سے قرض
بطنِ بے تقصیر کے نسیاں قبا شہری ہنوز
اک نہ اک نامِ پدر لیتے ہیں دیواروں سے قرض

مخملی و ساہی اندھیرے میں ہیں بے مہری سے داغ
سیب چاقو اکسرے پیوند اور سفّاک وقت
وقت ہی اک کشتِ نو ہے وقت ہی ویران باغ

بادباں کے تار و پو سے اک ہوا چلنے لگے
وقت کہتا ہے کہ میں ہوں وہ حریفِ زندگی
نیک و بد تشکیک کے تیزاب میں جلنے لگے

روحِ سیزر خنجرِ عریاں سے کرتی ہے کلام
اے لہو کی تشنہ نابینا اندھیرے کی زباں
زخمِ دل کا کس خطا پر قاہری رکھتی ہے نام

اک فرازِ نارسا سے روحِ انکارِ سجود
کہہ رہی ہے یہ فضا، یہ نردباں یہ جستجو
یہ مرا افسوں ہے میری آتشِ جاں کا ہے دُود

آگہی کی نرم جاں میزاں پہ کہساروں کا بار
روحِ آبا طفلِ حیرت آشنا کی آنکھ سے
دیکھتی ہے اب سرِ مژگاں ہے دیواروں کا بار

آگ پر رکھتی ہے بیکر روحِ ایجادِ نوی
مہر و مہ کے درمیاں کرتی ہے اک مشقِ خرام
وقت کی زنجیر پر ذرّات کی تازہ روی

دشت و در کے فاصلے مانگے ہیں قربت کی پناہ
اجنبی ہے آدمی کی ذات اے شہرِ گماں
نرم و نازک ہے گِلِ آدم ہوائے اشتباہ

عدل کے خواہاں ہیں فریادی اندھیری رات میں
ابر و باراں کو پکارا ہے زمیں کی پیاس نے
محوِ شیون ہیں نباتاتِ جہاں آفات میں

ساعتِ جولاں ہے گویا فرصتِ تعبیرِ وقت
اک صفر ناطاقتی کا اک صفر پیدائی کا
اک تغیّر اک اجل اک درد اک تقدیرِ وقت

چاہتے ہیں اک نہ اک دستِ تغیّر کا گداز
آدمی کے چہرۂ آتش زدہ کے زاویے
ایک پیوندِ گلِ درد آشنا اک فردِ راز

زندگی کو ہے متاعِ نارسیدہ کی تلاش
روحِ فردا کو ہے اندیشوں کی اس پہنائی میں
اک سہی قد پیکرِ ناآفریدہ کی تلاش

ڈھونڈتی ہے حیلۂ پیدائی روحوں کی برات
اک تماشائی کے غم میں ہے رخِ بالائے بام
خود نمائی سے نمو اندر نمو ہے کائنات

اے دمِ آفاق و بالِ آتشیں و روحِ خاک
زندگی محوِ تغیّر ہے تو کیا خطِّ اجل
جانِ جنبش تو ابد، تو گھوم اے لمحوں کے چاک

(۱۹۶۲ء)

ایئرپورٹ کی رات

یہ زمیں اے جاں ہوا بازوں کے بازو کا سواد
تازہ تر دشتِ جنوں سود و زیاں کی مملکت
رخصتوں کا حلقۂ آغوش جادو کا سواد

ذوقِ خود بینی سے پیدا آئنوں کی ایک جھیل
نیم خوابیدہ سی پریاں نیم آسودہ سے جن
سرخ ہونٹوں میں لرزتا کچھ غمِ منزل کا نیل

پائلٹ کاریں نقیبِ آہنِ تازہ خرام
شہر کی چادر پہ لرزاں ایک شورِ بے کراں
نیند کر دیتا ہے دوشیزہ زمینوں پر حرام

موش دشتی تارمیک میں ہے چراغوں کا اسیر
بے گناہی پر بھی یہ محرومِ نان و آب ہے
روشنی کی رَو میں اک بے آبرو زنگی سفیر

کچھ مسافر کوئیر کچھ دُور کے جاسوس سے
ایک تنہا طالبہ بارش میں ایک ننھا پرند
اور محرابِ ہوا لرزاں غمِ ناموس سے

بین قومی بے نسب ہر رنگ کے اجسام کا
اک خیاباں نیم روشن رات ہے کھلتا ہوا
نیم رس پیرس کے لب حلقہ سا زلفِ شام کا

ذی نفس اک شہرِ بے خوابی اک آسیبی دیار
کوئے عشّاقِ بتاں اک جادۂ خوابِ جنوں
نیک و بد میں گھومتی ہے ساعتِ آئندہ کار

فلسِ ماہی تازہ جلدیں شارک کی رکھتی ہیں دھار
لکنت آمیزی سیاست کی شکستہ پر صدا
فکرِ ساقط سے پریشاں مو سفیرانِ کبار

وحشتِ رم کا صداؤں کے بگولوں کا سواد
تاجری کی تیسری آنکھ اس کی محرم ہر نفس
دل زدہ کسٹم کی چوکی ہے رسولوں کا سواد

نبضِ رَم ہے خاکِ نوحہ گر کو کب سے ٹوکتی
ڈال کر رفتار کی زنجیر ساکت پاؤں میں
غم کے آبِ گم کو باہر ہی دلوں سے روکتی

زندگی اے جانِ جاں آخر ہے سیلِ بے پناہ
آدمی کے دل کی لاکھوں وادیوں میں گھوم کر
خانہ ویرانی کے در تک آگئی ہے جس کی راہ

خستگانِ رہ میں یہ صدیوں سفر کی یادگار
یہ سوادِ ابر یہ جولاں گہِ موجِ ہوا
بال و پر کے سلسلوں میں بال و پر کی یادگار

کچھ نہیں تو چادرِ گل میں چھپا کر لے چلیں
موم کے پر کے خدا کی میّتِ بے نام کو
اس سوادِ تیزگامی سے اٹھا کر لے چلیں

(۱۹۶۲ء)

✡

ز فرق تا بہ قدم ، خواب آشنا کہیے
حدیثِ خال و خطِ دوست اور کیا کہیے

کبھی تو ذکرِ حریفانِ خوش نظر کیجیے
کہیں تو قصۂ یارانِ بے ریا کہیے

کسی کے سلسلۂ غم کی لاگ رہ جائے
حدیثِ گل نہ سہی قصۂ صبا کہیے

نظر ہے سلسلۂ خوابِ صد ہزار اوراق
کہاں کہاں سے گزرنا پڑا ہے کیا کہیے

اسی کی راہ گزر پیچ پیچ آتی ہے
کہیں سے قصّۂ عمرِ گریز پا کہیے

کچھ ایسے سوگ میں ڈوبا ہوا ہے پیکرِ دوست
کہ اس کے بعد غمِ ہجر و وصل کیا کہیے

نوائے شوق کو زنجیرِ در گلو لکھیے
سخن کو طائرِ مجروح کی صدا کہیے

یہ تیرے دور کا اک عہدِ خوش نوائی ہے
مگر سکوت ہے ایسا کہ مرحبا کہیے

(۱۹۶۱ء)

✧

جویانِ تازہ کاریِ گفتار ، کچھ کہو
تم بھی ہوئے ہو کاشفِ اسرار کچھ کہو

شیشہ کہیں سے لاؤ شرابِ فرنگ کا
باقی جو تھی حکایتِ دلدار کچھ کہو

جانے بھی دو تغیّرِ عالم کی داستاں
کس حال میں ہے نرگسِ بیمار کچھ کہو

بادل اٹھے ہیں چشمکِ برق و شرار ہے
منہ دیکھتے ہو صورتِ دیوار کچھ کہو

مطرب کو تازہ بیت سکھاؤ ہوا ہے نرم
گزرے کسی طرح تو شبِ تار کچھ کہو

ٹھہرا ہوا ہے وادیِ غم میں رمیدہ وقت
سمجھو بھی کچھ نزاکتِ بسیار کچھ کہو

زندہ دلانِ شوق نے رکھا بہار نام
اک موجِ خوں گئی سرِ گلزار، کچھ کہو

آغاز ہر تغیّرِ عالم کی حد ہوا
اُس کی گلی کا سایۂ دیوار کچھ کہو

الجھے گا آج جی کہ ہوا پیچ پیچ ہے
بنتا نہیں کوئی رخِ گفتار کچھ کہو

(۱۹۶۱ء)

۞

سب پیچ و تابِ شوق کے طوفان تھم گئے
وہ زلف کھل گئی تو ہواؤں کے خم گئے

ساری فضا تھی وادیِ مجنوں کی خواب ناک
جو روشناسِ مرگِ محبت تھے ، کم گئے

اب جن کے غم کا تیرا تبسّم ہے پردہ دار
آخر وہ کون تھے کہ بہ مژگانِ نم گئے

اے جادۂ خرامِ مہ و مہر ، دیکھنا
تیری طرف بھی آج ہوا کے قدم گئے

وحشت سی ایک لالۂ خونیں کفن سے تھی
اب کے بہار آئی تو سمجھو کہ ہم گئے

میں اور تیرے بندِ قبا کی حدیثِ خاص
نادیدہ خوابِ عشق کئی بے رقم گئے

ایسی کوئی خبر تو نہیں ساکنانِ شہر
دریا محبتوں کے جو بہتے تھے، تھم گئے

(۱۹۶۱ء)

ہوا آشفتہ تر رکھتی ہے ہم آشفتہ حالوں کو
برتنا چاہتی ہے دشتِ مجنوں کے حوالوں کو

نہ آیا کچھ ، مگر ہم کشتگانِ شوق کو آیا
ہوا کی زد میں آخر بے سپر رکھنا خیالوں کو

خدا رکھے تجھے اے نقشِ دیوارِ صنم خانہ
کہیں گے لوگ دیوارِ ابد تیری مثالوں کو

اندھیری رات میں اک دشتِ وحشت زندگی نکلی
چلا جاتا ہوں دامانِ نظر دیتا اُجالوں کو

بجھا جاتا ہے دل سا ایک لعلِ شب چراغ آخر
کہاں لے جاؤں اس کے ساتھ کے صاحب جمالوں کو

کھڑی ہے تاج پہنے شہر میں خارِ مغیلاں کا
جوابِ تازہ دینے زندگی کہنہ سوالوں کو

خیاباں خندقوں میں کھل گئے وہ موجِ خوں گزری
ہوائے زخمہ ور نے ساز سمجھا ہے نہالوں کو

نکلنے ہی نہ پائے حلقۂ دشتِ تمنّا سے
ملی تھی گردشِ پرکار ایسی کچھ غزالوں کو

سبو میں موج زن آبِ ضمیرِ مے گساراں ہے
طلوعِ صبح تک روشن رکھیں گے ہم پیالوں کو

کبود و سرخ میں تھی ، نیک و بد میں ، داغ و درماں میں
ہوا سیّاح تھی دیکھ آئی سب غم کے شوالوں کو

تغیّر کی زمیں پر آدمی کا تیز رَو پرتو
گیا ہے صورتِ مشعل لیے آئندہ سالوں کو

(۱۹۶۲ء)

نم خوردہ بہت شعلۂ جاں ہے کہ نہیں ہے
ہر موجِ نفس آج دھواں ہے کہ نہیں ہے

نازک ہیں بہت اس کے خط و خال کی باتیں
محضر بھی کوئی پردگیاں ہے کہ نہیں ہے

احوال بھی پوچھا تو حریفانِ جنوں نے
اب داد طلب وحشتِ جاں ہے کہ نہیں ہے

ویسے تو یہ فردِ غمِ جاں جل نہ سکے گی
شعلہ کوئی نوخیز و جواں ہے کہ نہیں ہے

مجھ کو تو ہے بے خواب ہواؤں کو پرکھنا
آپ اپنی جگہ یہ غمِ جاں ہے کہ نہیں ہے

خوابِ در و دیوار لیے تیز ہوا میں
جاتی ہوئی شب عمرِ رواں ہے کہ نہیں ہے

ٹوٹا ہوا دل جادۂ دریافت پہ رکھنا
بنیادِ تغیّر مری جاں ہے کہ نہیں ہے

ویسے تو محبّت میں بہت جی کا زیاں ہے
بے دورِ محبّت بھی زیاں ہے کہ نہیں ہے

جی سن سے ہوا بادہ کشو مے کی طلب سے
اس میں بھی کوئی شرطِ دکاں ہے کہ نہیں ہے

محرابِ چراغِ رخِ ایّام ہے دنیا
ماتم گہِ چشمِ نگراں ہے کہ نہیں ہے

(۱۹۶۲ء)

✡

زمزمہ پیرا کوئی خونیں نوا ہو جائے گا
جب بہار آئے گی زخمِ دل ہرا ہو جائے گا

زندہ باد اے دل کہ تو نے پائی آخر دادِ شوق
ہم گئے جی سے مگر ذکرِ وفا ہو جائے گا

وہ لہو اُچھلا بہارِ تیز رَو کی راہ میں
رقصِ بسمل اب کے خود رقصِ صبا ہو جائے گا

اس فضا میں ہیں دریدہ بادباں جن کو نصیب
ان سفینوں کا بھی کوئی ناخدا ہو جائے گا

اک ہوا ایسی ہے شہرِ غم میں ناخن درگرہ
دور تک افسانۂ بندِ قبا ہو جائے گا

شکر کے دو چار عنواں لطف کا ایک آدھ باب
کارِ غم خواری ، نگاہِ آشنا ہو جائے گا

اڑ گئے سازِ ہوا طائرِ خزاں کی چاپ سے
باغ ویرانی کا اک پردہ سرا ہو جائے گا

محرمانِ دوست کیا کیا ہیں بیانِ رنگ رنگ
اس کا جرمِ بے گناہی ماجرا ہوجائے گا

(۱۹۶۲ء)

✪

نرمی ہوا کی موجِ طرب خیز ابھی سے ہے
اے ہم صفیرِ آتشِ گل ، تیز ابھی سے ہے

اک تازہ تر سوادِ محبّت میں لے چلی
وہ بوئے پیرہن کہ جنوں خیز ابھی سے ہے

اک خوابِ طائرانِ بہاراں ہے اس کی آنکھ
تعبیرِ ابر و باد سے لبریز ابھی سے ہے

شب تاب ابھی سے اس کی قباؤں کے رنگ ہیں
اک داستاں جبینِ گہر ریز ابھی سے ہے

گزری ہے ایک رَو مژۂ خواب ناک کی
دل میں لہو کا رنگ بہت تیز ابھی سے ہے

آئینہ لے کے گھوم گئی عمرِ نو خرام
تازہ رُخی کا موڑ، بلا خیز ابھی سے ہے

مبہم سے ایک خواب کی تعبیر کا ہے شوق
نیندوں میں بادلوں کا سفر تیز ابھی سے ہے

اک تازہ مہرِ لب سے جنوں مانگتا ہے نقش
جنبش لبوں کی سلسلہ آمیز ابھی سے ہے

شاید کہ محرمانہ بھی اٹھے تری نگاہ
ویسے تری نگاہ دل آویز ابھی سے ہے

(۱۹۶۲ء)

وداع

رات آدھی ہوئی نیتِ شب حرام
بوئے گل ، حرفِ پیماں سلامت رہے

رات کی نم ہواؤں کی زنجیر میں
کاکلیں کھل گئیں شوقِ تقصیر میں
رکھ دیے آئنے کوئے تعبیر میں
خواب نے دستِ عشّاق نے رات نے
عشقِ بے ساز و ساماں سلامت رہے

کِھل اٹھے موجِ خوں میں گُل و یاسمن
سلسلہ یاد کے رشتہ ہائے کہن

مارِ خفتہ نفس کوئی جی کی لگن
درد کے زہر کا اک پیالہ پیے
جاگ اٹھی ہے غمِ جاں سلامت رہے

خواب کے دائرے ساعتوں کا دُھواں
مہرِ آتش زدہ بوسۂ نرم جاں
نیند کے کوئے ویراں کی خاکِ زیاں
داغ در داغ اُڑتی ہوئی آئی ہے
پردۂ کنجِ ارماں سلامت رہے

زندگی پا برہنہ اکیلی اداس
دیدۂ نم سے مانگے ہے تازہ لباس
اور محبت کے ویران معبد کے پاس
اوّلیں جرم کے پھول چنتی ہوئی
محوِ رم، روحِ عصیاں سلامت رہے

زانوؤں پر نشاں حلقۂ دام کے
زاویے کچھ نکل آئے ہیں کام کے
روئے قاتل میں روئے دلِ آرام کے

نیک و بد ایک محور کے طالب ہوئے
زیست کا رمزِ پنہاں سلامت رہے

داغِ لالہ میں سمٹا سوادِ نگاہ
درد کی تیز سفّاک موجِ سیاہ
دل کی دیوار تک آگئی گاہ گاہ
زیرِ آب آگیا شہر اے ساکنو
بیم شب موجِ طوفاں سلامت رہے

زمزموں کے کئی گھومتے چاک سے
رک گئے منہ پہ آتی ہوئی خاک سے
اُڑ گیا طائرِ مے رگِ تاک سے
شمعِ بالیں بجھی خواب صورت گیا
حلقۂ دُود پیچاں سلامت رہے

(۱۵؍ جون ۱۹۶۲ء)

ناوکِ تازہ دل پر مارا جنگ پرانی جاری کی
آج ہوا نے زخمِ کہن میں ڈوب کے تازہ کاری کی

جس کیاری میں پھول کھلے تھے ناگ پھنی سی لگتی ہے
موسمِ گل نے جاتے جاتے دیکھا کیا دشواری کی

ایک طرف رُوئے جاناں تھا جلتی آنکھ میں ایک طرف
سیاروں کی راکھ میں ملتی رات تھی اک بیداری کی

کوئے بیاں کی ویرانی سے میرا بھی جی بیٹھ گیا
معہ موڑے آواز کھڑی ہے سازِ راہ سپاری کی

(۱۵ر جون ۱۹۶۲ء)

پہلی اشاعت: جنوری ۱۹۸۳ء

حبیب تنویر اور
علیم غزنوی کے نام

جدید افکار کی اُن پہلی بحثوں، تجربوں، آغاز و انجام کے
ان سلسلوں کی یاد میں جو آج بھی عزیز ترین خواب ہیں

There are New fires of colours Never seen
A thousand imponderable phantasma
To which reality must be given.

—Guillaume Apollinaire

گوشۂ ویرانہ را آفتِ ہر روزہ ام
منزلِ جانانہ را فتنۂ ناگاہیم
بندۂ دیوانہ ام مخطی و ساہی خوشم
حکم ترا مخطیم ، قہر ترا ساہیم

غالبؔ

فہرست

نظمیں

عزیز حامد مدنی

غزلیں

نظمیں

غزلیں

نظمیں

غزلیں

نظمیں

غزلیں

نظمیں

غزل

○○○

رُخِ تحریر

یہ چند نظمیں اور غزلیں اُسی سلسلۂ کلام کی ایک کڑی ہیں جو ''چشمِ نگراں'' اور ''دشتِ امکاں'' کے اوراق میں موجود ہیں۔ ان کے بنیادی عناصر میں کوئی فرق نہیں۔

آج کی دنیا میں تغیرات کی وہ رو جو ایک معاشرے کے ظاہر و باطن کو ایک دوسرے معاشرے سے مختلف یا مماثل کر رہی ہے، فکر کے لیے ایک نیا موڑ پیش کرتی ہے۔ پوری دنیا اسی آمیزش اور اختلاف کی پیکار میں منہمک ہے۔ آج کا موضوعِ شعر یہی ہے اور اس کی تہوں میں مثبت انسانی کردار کی تلاش جاری ہے۔ ویسے بھی دیکھیے تو یہ صدی ہزار داماں جستجو کی صدی ہے۔ یہ ایک آتش بیں قومی سیاست کا دور بھی ہے اور سائنس اور ٹیکنولوجی کی حیرت انگیز وسعتوں میں انکشافات کا ایک عظیم تر دور بھی۔ ان کا تأثر، ان سے پیدا ہونے والے نتائج وہ مایوسیاں اور اُمیدیں، وہ حیرت و استعجاب، وہ عجز اور بے تابی جو اس صدی کو پرانی تہذیبی قدروں سے الگ کر رہی ہیں، فرد اور معاشرے کے لیے فکر کا سامانِ نو ہیں۔ ان کی بستگی سے ایک نئی روحانیت کا اظہار ہو رہا ہے۔ یہ ایک عظیم عقلی انسانیت پرستی کا دور ہے— Scientific Humanism جس کی بنیادیں فلسفے کی منزلوں مذاہب کے اعلیٰ ترین نصب العین سے جدا نہیں ہیں۔ ساری دنیا کے ادیبوں اور شاعروں

کے کام میں اس کی پرچھائیاں ہیں۔ اردو شعر و ادب بھی اسی فکر سے وابستگی کا ایک سلسلہ ہے۔

ہر زبان کے ادب کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ محاورہ، عروض، صرف و نحو، مروّج اصنافِ سخن کے اسالیب اور ان کی تقسیمِ کار کے وہ اجزا جو ایک تاریخی شعور اور روایات کا لازمی جزو ہیں، بہت نازک اوزار ہیں۔ شعرا انھیں سے کام لیتے ہیں۔ ہر نوع کی رمزیت و اشاریت اور اسالیبِ سخن کا نیا پیرایہ کسی فکری تصادم یا نزاع کی بنیاد نہیں ہے۔ وہ آج کے تخلیقی تقاضوں کا امتیازی پہلو ہے جو اپنی معنویت کے لیے فکر کے ادراکِ نو کا خواہاں ہے۔ اس کی آگہی سے مرتب ذہنوں کے لیے زندگی کی کلّیت کے نئے زاویے نمایاں ہوتے ہیں۔

عزیز حامد مدنی

موجِ نفس

مایۂ اقلیمِ جاں رازِ سخن
اے مری موجِ نفس سازِ سخن
تیرے نم سے تازہ برگِ گفتگو
بار آور تجھ سے شاخِ آرزو
لطف تیرا اک طلوعِ آفتاب
بے رُخی تیری شبِ ژولیدہ خواب
تیری رَو میں سیکڑوں نادیدہ جن
بے لکھے الفاظ کے خوابیدہ جن
محوِ خود بینیِ شب و روزِ حواس
غولِ صحرا کی طرح دھندلے قیاس
اندک و بسیار تجھ سے سب نہال

رودِ دریا تجھ سے ہر موجِ خیال
تجھ سے کھِل اُٹھتا ہے دانائی کا رنگ
کنجِ خاموشی میں گویائی کا رنگ
حرف کی اشکال ، معنی کا وجود
شعلۂ جاں سوختہ جانی کا دُود
عدل کی میزان ، خط انصاف کا
صیرفیِ جاں سواد اعراف کا
کیف و کم کے دُور تک اٹھتے غبار
دم بہ دم تجھ سے تغیّر آشکار
شاخِ گل ہے خشک چوبی میں نہاں
چشمۂ آبِ خنک ، ریگِ رواں
شیشۂ ساعت میں گردِ موج زن
یک دگر تارِ قبا تارِ کفن
داستاں انگیز تیری ساعتیں
عشق سے لبریز تیری ساعتیں
اے چراغِ طاقِ ایوانِ سلف
نسخۂ صد کیمیائے بے تلف
آج اے طبعِ رواں اتنا برس
رنگ پھولوں میں رچا میووں میں رس

خشک سالی کی تلافی کچھ تو ہو
بے نمو غم کے منافی کچھ تو ہو
موتیوں کی اک لڑی ایسی اچھال
جس طرح جوبن پہ ہو گیہوں کے بال
ہے تغیّر کے ورق پر دُور دُور
قرض کب سے تازہ اندیشوں کا نور
یہ زمیں ہے گوئے میدانِ حیات
شش جہت میں ایک چوگانِ حیات
ساعتوں کے چاکِ گرداں بے قیام
بے خطِ فاصل ، سوادِ صبح و شام
زندگی لیکن غنودہ سوگوار
بام و در پر موجِ دودِ کوکنار
دورِ کبریتی میں اجزائے جہاں
اک دھواں اک آگ فردائے جہاں
کب سے ہے روئے زمیں پامال سا
کوئلے کا ڈھیر بے اشکال سا
یہ قفس یہ خاک دانِ خاکیاں
صحنِ ویراں میں ہے شورِ ماکیاں
پھر سوادِ شرق ہے تاریک بن
دودھ کے پیالوں پہ ہیں سانپوں کے پھن

روغنوں کے چاہ پر ہے راہ تنگ
تیل کے چشموں پہ زرداری کی جنگ
ایک سیلِ بے کراں تھمتا ہوا
اک گرہ خوردہ دھواں جمتا ہوا
سر نگوں جذبے سرشتِ خاک کے
نقش سے عاری طبق افلاک کے
مایۂ اقلیمِ جاں رازِ سخن
اے مری موجِ نفس سازِ سخن
کوئی افسانہ سنا جمہور کا
تیرگی میں ساز اٹھا لے نور کا
ہوگیا ہے سن مرے سینے کا داغ
روشنی دے کچھ تو لعلِ شب چراغ
علم کے ترکش کے اے تیرِ اماں
جہل کی یلغار میں تعویذِ جاں
حرفِ حق کی کوئی تابندہ دلیل
تازہ تر سقراط کے ہونٹوں کا نیل
بے سخن کیوں ہے لبِ خاموش جاگ
بیتِ نو آغاز و چشمِ ہوش جاگ

(۱۹۸۳ء)

سمندر

قلزمِ نیلگوں ترے گرداب
رقص فرمائیں تیز تر ہو جائیں
اک ذرا اور بے خبر ہو جائیں
تیری موجوں کے پیچ و خم کا شباب
مہ جبینوں کے جسم کے آداب
موج پابندِ پیرہن کب ہے
یہ کنارا ترا وطن کب ہے
ایک طفلِ شریر کے مانند
تو نے پہنچائی کشتیوں کو گزند
بھینچ کے مٹھیوں میں چھوڑ دیا
اک کھلونا سمجھ کے توڑ دیا

کتنی پتواروں کے کھلے بازو
جذب کرتے رہے تری خوش بو
موج در موج تیری بے تابی
لم یزل بے کراں یہ بے خوابی
روحِ شام و سحر سنورتی رہی
تجھ سے سرگوشیاں سی کرتی رہی
گیت ملّاحوں کے ہواؤں کے راگ
منزلوں کی حدیں سفر کا سہاگ
زہ کمانیں سی بال افشاں تیر
تیری آبی ہتھیلیوں کی لکیر
منتشر ہیں کہانیاں کیا کیا
وقت کی بے کرانیاں کیا کیا

قلزمِ نیلگوں ترے گرداب
رقص فرمائیں تیز تر ہو جائیں
اک ذرا اور بے خبر ہو جائیں
متھ رہا ہو تجھے کوئی طوفاں
جزر و مد کے ہزار ہوں عنواں

نیم جنبش میں ہوں بہ اذنِ وجود
وقت کی انگلیاں حنا آلود
ابروؤں پر شکن سی ڈالے ہوئے
آب گوں پیرہن سنبھالے ہوئے
نیم عریانیوں میں جسم چرائے
وقت کی روح سامنے آجائے
تیرے گرداب تیز تر ہو جائیں
اک تغیّر کے بال و پر ہو جائیں

(۱۹۵۰ء)

ماہی گیروں کی ایک بستی

بے خوف بستی الجھن سے آزاد
طوفاں سرشت اور ساحل پہ آباد
اشکالِ خود رو صف ہے گھروں کی
اک نقش رمّال صورت دروں کی
دیوار خستہ، بے رنگ اینٹیں
افسوں سا پڑھتی قلزم کی چھینٹیں
چوکھٹ کے دستے سب الٹی مت کے
جادو کی مالائیں، کھپریل چھت کے
آندھی نے ان میں دروازے چیرے
سنکل بجاتی خونی مجیرے

سب لالٹینیں ایسی دُھویں میں
بلّی کی آنکھیں اندھے کنویں میں
مچھلی کی بُو میں دھونی رماتے
جاگے مچھیرے نیندوں کے ماتے
جالوں کا اک پال قلزم کی تہ میں
مچھلی کا انبار ہے ان کی زہ میں
چلتی ہوا کے منہ زور کوڑے
نکلے ہیں یہ بھی دریائی گھوڑے
پانی کے سیّاح طوفان زادے
پُرپیچ موجیں ان کے لبادے
کشتی ہے ان کی خود فلسِ ماہی
طوفاں گزیدہ ، قلزم کی راہی
جالوں کو کستا لوہے کا چھلّا
جالوں میں لڑتیں ، روہو و پلّا
ہے ان کا سکّہ ان کی صلابت
فرمانِ محنت بازو کی قوت
کشتی میں جلتا بجھتا دیا ہے
چہروں پہ نیلم پگھلا ہوا ہے
کیسا عقابی ہر بادباں ہے

موجِ ہوا کا خود ہم زباں ہے

اے موجِ قلزم یہ خانوادہ
تجھ سے تعلق رکھتا ہے سادہ
بازوئے شل اور قلزم کا کس بل
حفظِ مراتب ثانی و اوّل

طوفاں بہ طوفاں شام اور سویرے
تو بھی ہے ان کا یہ بھی ہیں تیرے
گیت ان کے سارے تُو نے سنے ہیں
ان کے سُروں نے طوفاں بُنے ہیں
تیرے قدیمی ہم راز ہیں یہ
سب سے پرانی آواز ہیں یہ

(۱۹۸۲ء)

ایک پرانی ٹائی کو دیکھ کر

اے کہن سال زرد رُو ٹائی
تُو ہے طوقِ گلوئے سودائی
جانے کب سے ترا پریدہ رنگ
راہ کی گرد سے ہے محوِ جنگ
تو ہوا کی زباں سمجھتی ہے
نبضِ طوفانِ جاں سمجھتی ہے
گل کے انداز خار کے اطوار
عالمِ کم عیار کے اطوار
دستِ محبوب کی حنا کا رنگ
ہم کناری میں کچھ حیا کا رنگ
یہ تری دھاریاں یہ تیرے پھول

پا چکے اوج گاہِ حسنِ قبول
تجھ میں لرزاں ہے ایک خوش بو بھی
نگہِ ناز ہے ترازو بھی
اے رفیقانِ راہ کی محرم
اے گلے سے لپٹنے والے ستم
اے تعلّق کے حلقۂ زنجیر
وقت کے خواب گوں دھویں کی لکیر
کیا ہوئے کچھ بتا وہ فرزانے
آتشیں فکر ، چند دیوانے
کیا ہوئے طائرِ شکستہ پر
یونین ہال ، درس گہ ، تھیٹر
لبِ مے گوں چشیدہ ، نم دیدہ
تجھ میں بوسوں کی روح خوابیدہ
اے ہزاروں نزاکتوں کے امیں
قلوپطرہ کے مارِ زہر آگیں
بقچۂ ناز کی تجھے سوگند
افعیِ بے مثال کے مانند
عشق کو آخری سزا ہی سہی
بوسۂ مرگ آشنا ہی سہی

تم سلامت رہو

تجھ سے بھی میرے دیدۂ پُرنم
آبیاریِ درد کیا ہوگی

روز و شب کے ہزار دُکھڑوں میں
رہ گئی ہے الجھ کے موجِ نفس
راہ کا سدِّ باب کرتی ہے
ہر پلٹتی ہوئی صدائے جرس
عندلیبِ جگر فگار کے آج
رازداں ہوگئے ہیں مور و مگس
رفتہ رفتہ اُتر گئی دل میں
تنگیِ دام و تیرگیِ قفس

خطِ فاصل کہ درمیاں تھا کبھی

نہ رہا درمیانِ عشق و ہوس

انقلابِ جہاں کے ہیں وہ امیں

جن کو اپنے پڑوس سے نہیں مس

نکتہ دانِ خرد کتاب فروش

اہلِ علم و کمال ہیں بے بس

زندگی کے خطوطِ کج مج سے

کھو گئے ہیں حواسِ اقلیدس

بیمِ جاں کے ہیں برگ و ساز ابھی

رسنِ شہریار و چوبِ عسس

ہمتِ بازوئے جواں کیسی

اک کفِ جو جہاں پڑے فی کس

داشتہ ہے اجل کی حسنِ جہاں

شاخِ گل ہے کنیزِ خار و خس

ناشگفتہ ہیں غنچہ ہائے چمن

کِرم خوردہ ہے میوۂ نورس

نبضِ موسم کے دیکھنے والو

کم نہیں ہے ابھی فضا میں اُمس

انقلابِ زمیں کے افسوں سے

گردشِ آسماں ہوئی بے بس
جرأتِ زندگی کا مجرم تھا
کام بھی وہ کیا تھا دل نے کہ بس
ہم تو رخصت ہیں بندگانِ خدا
''تم سلامت رہو ہزار برس''

بُندو خاں کی سارنگی

تجھ کو تو نصیب بھی تھی اے ساز
اُڈی ہوئی جوئے غم گساری
تیری ہی لگن میں نغمہ گر نے
ہر شامِ وصالِ دوست ہاری
لے کر یہ چراغِ زیرِ داماں
طوفان کی رات بھی گزاری
پردے میں ہی دل کے تجھ کو رکھّا
کم کم ہے یہ رسمِ پردہ داری
ناخن کے لہو سے ساز کے تار
کرتا بھی ہے کوئی آبیاری
تاریک گھروں میں دل کے پربت

پربت پر بنی تری اٹاری
راگوں کا جبیں پہ تیری صندل
باندھے ہے کمر میں سُر کٹاری
سنگیت سبھا کے منڈپوں نے
اکثر تری آرتی اُتاری
مانوس ہتھیلیوں کی رانی
پی بِن تو ہے، رات تجھ پہ بھاری
زانو کی وہ پالکی نہیں ہے
شانوں کی نہیں رہی عماری
نرکل میں چھپی ہوئی سی رادھا
تو بھی کوئی برہ کی ہے ماری
گوکل کو قدم جو تیرا نکلے
در پر ہے کھڑی ہوئی سواری
چنگھاڑ رہی ہے شہر کی رات
کہتی ہے کہ ہمدمی ہے خواری
بستی پہ کلنک کا یہ ٹیکا
گانٹھے ہے ہر ایک ہی سے یاری
آیا تھا گلی گلی سے ہوتا
جاں دادۂ کوئے بے قراری

دستک ہی سنی نہ کوئی تو نے
بجھتے ہیں شرارِ ہم کناری

لاچار کھڑی ہے در پہ تیرے
دنیا کی حریف جاں نثاری

پتھر ہی کوئی نہ تجھ کو لگ جائے
لڑکوں کا ہے دورِ سنگ باری

قربِ مرگ

(ایک موٹر ایکسیڈنٹ کی یاد میں)

کس اُفق سے جانے آج آئی ہوا
کچھ کفن کے تار و پو لائی ہوا
اک تصادم سے دبی یوں نبضِ ہوش
آگئی اک ساعتِ میّت بدوش
ذہن میں سایہ سا اک پھرنے لگا
ربط کا پُل ٹوٹ کر گرنے لگا
جسم میں اک نم سرایت کر گیا
ذہن اس آبِ خنک میں مر گیا
کتنی تصویروں سے اُترے رنگ آج
بے حسی سے ہو رہی ہے جنگ آج

تھے خیالوں میں کبھی دل شاد شہر
ہوگئے ویران وہ آباد شہر

سامنے ہے اک غبارِ ماہ و سال
سانس لیتے ہیں شکستہ پر خیال
ہوش کی مشعل بجھانے آگئی
موت اک نشتر چلانے آگئی
بیش و کم کا مٹ گیا چیزوں سے گھیر
حافظہ ہے اک ردی کاغذ کا ڈھیر
کھل گیا کوئی جنوں خانے کا در
مار و شاہیں گھٹ گئے دیوار پر
ہے عناصر میں یہ کیسی ابتری
اک رصدگاہِ جنوں دانش وری
آئنہ لے کر کسی تنہائی کا
جو ملا ، چہرہ ملا سودائی کا
اب اُترتی ہی نہیں آفاق سے
آگ جو جلتی تھی اک چقماق سے
بے فرس ہو کر گرا اک شہسوار
کون ہے تیغ و سپر کا پاس دار

وقت کو کیا کیا تپایا خون میں
موت نے لوہا بجھایا خون میں

آشیاں تارِ نظر ہے زاغ کا
روشنی کے پھل میں کیڑا داغ کا
ختم ہے سب کھیل پھاٹک بند ہے
زندگی اب تیرا ناٹک بند ہے

(۱۹۸۰ء)

کتاب کا کیڑا

دِق تجھ سے کتابیں ہیں بہت کِرم کتابی
تُو دشمنِ دُزدیدہ ہے خاکی ہو کہ آبی
الفاظ کی کھیتی ہے فقط تیری چراگاہ
معنی کی زمیں تیرے سبک سایوں نے دابی
ہونے کو تری اصل ہے صیّادِ کمیں گاہ
کہنے کو فقط تیری حقیقت ہے سرابی
تُو نے تو ہر اک سمت لگائی ہیں سرنگیں
پارینہ ہو فرمان کتابیں ہوں نصابی
بادامی ہو کاغذ تو مزہ اور ہی کچھ ہے
لُقمہ ہوا تحریر کا ہر مغز شتابی
کیا خوب ہے یہ مجلسِ اوراقِ کہن بھی
خاموش کتب خانوں کی دیمک تری لابی

گھن ساتھ ہی گیہوں کے ہے پِستا ہوا دیکھا
برگشتہ ورق لا نہ سکا تجھ پہ خرابی
فردوسی و رومی کی کتابیں ہیں ہراساں
وہ قلعۂ معنی ، ترا حملہ ہے جوابی
پردہ ہے خموشی تری آہنگِ فنا کا
بھونرا ہے فقط کنجِ گلستاں کا ربابی
تو چاٹ گیا دانشِ کہنہ کی فصیلیں
بنیادِ عمارت کو ہے ڈھانا تری ہابی
اعداد کے قالب میں ہے تو صفر کی طاقت
صفحات کے سوراخ کا بے نام حسابی
تاریخ کے اس سیل میں انسان نے پائی
ایک آدھ کوئی موجِ نفس وہ بھی حبابی
بکتے سرِ بازار ہیں مانندِ زغال آج
جو تازہ نفس خوابِ تغیّر تھے شہابی
کھا جاتی ہے اک دن اسے سب گردِ زمانہ
مٹّی کی وہ صحنک ہو کہ چینی کی رکابی
بدلی ہوئی دنیا میں تغیّر کا عمل ہے
تو کِرمِ کتابی نہیں اک کِرمِ خلل ہے

(۱۹۸۰ء)

زمیں

گنبد گرے پرچم جلے
گھوڑوں کی ٹاپوں کے تلے
سب میر و سلطاں آ چلے

برسے ہتھوڑے پے بہ پے
آتش نفس گیتوں کی لَے
اک سیج پر شمشیر و نَے

زنجیر کے آہنگ سے
رخسارِ طبلِ جنگ سے
ٹوٹے شرارے سنگ سے

چیں بر جبیں آفاق ہیں
محلوں کے سُونے طاق ہیں
سہمے ہوئے قزّاق ہیں

سنکی ہوا آفات کی
اک بات ہے سو بات کی
پیکار ہے ذرّات کی

دل کے خزانے تُل چکے
بیڑی کے حلقے کُھل چکے
چہرے لہو سے دُھل چکے

اب سرحدیں غم کی ہٹیں
ملتی ہیں کس کی آہٹیں
گھونگھٹ کُھلا بکھری لٹیں

آ چوم لیں تیری جبیں
ہم رقص مہرِ آشتیں
اے جاگتی سوتی زمیں

پائندہ باد، اے نازنیں
پائندہ باد، اے نازنیں

(۱۹۵۰ء)

شہیدانِ بیروت

لہو سے تر یہ قمیصیں گواہ ہیں اب تک
کہیں بھی راہِ وفا بے جنوں نہیں رہتی
حریف ہو کے کسی بسملِ شناور کی
ہزار موج ہو یک نیزہ خوں نہیں رہتی

سروں پہ جال سا ہو آتشیں ہواؤں کا
اسی کو اہلِ وفا سائباں سمجھتے ہیں
اجل سے دور جو گزرے تو زندگانی کو
حقیر جانتے ہیں رائگاں سمجھتے ہیں

وہ آگ وادیِ سینا بھی جس سے شرماتی
چلی تھی شہر میں جیسے کسی بیاباں میں
بکھر کے دامنِ مادر میں بین کرتی ہے
جمی جو راکھ گہر ہو کے روئے طفلاں میں
ہوئی ہے جبرِ سیاست کی آگ کا ایندھن
مسافروں کی قناتوں میں کارگاہِ خیال
یہ کس کا ہاتھ پسِ پردۂ ہلاکت تھا
جلاوطن تھیں جو نیندیں وہ ہوگئیں پامال

دو نیم خواب بھی ان کے ہوئے دو نیم بدن
اب آنسوؤں کا کفن بھی ہے بار ان کے لیے
نہ دے سکے گا انھیں کوئی بڑھ کے توشۂ راہ
عرب کا خرما، عجم کی بہار ان کے لیے

اُڑی ہے راکھ سی کچھ خیمہ گاہِ ہجرت سے
کھڑی تھی آگ جہاں لے کے آنسوؤں کا چلن
بہت ہے محضرِ صد پارہ اور روئے وفا
اسی فضا میں ہوئے یک دگر قبا و کفن

ہوا پہ قرض ہے خونیں کفن فضاؤں کا
پلٹ کے وادی و کہسار سے جو آتی ہے
لپٹ کے شہر کی خاکسترِ فروزاں سے
زمیں پہ مشعلِ جمہوریت جلاتی ہے

(۱۹۸۳ء)

زمزمۂ کارواں بھی بوسہ ہے

چلے چلو کہ ہے چلنا غبارِ عالم میں

سوادِ غولِ بیاباں قریب ہو بھی تو کیا
کلاہِ خارِ مغیلاں نصیب ہو بھی تو کیا
مسافروں کا ہوا جشن جب مناتی ہے
جو خاکِ پا تھی وہی گرد منہ پہ آتی ہے
یہ نازِ گرد ہے کاکل پہ ایک افشاں ہے
سفر میں ربط کی زنجیر کا یہ عنواں ہے

طلب کی خو ہے ابھی تک کنارِ عالم میں
چلو کہ آبِ گہر سی ہے دیدۂ نم میں

گلوں کی آگ سلگتی ہے روحِ شبنم میں
پیام لے کے چلی ہے جو رازدار ہوا
پہنچ ہی جائے گی، منزل پہ نَے سوار ہوا
لبوں پہ زمزمۂ کارواں بھی بوسہ ہے
خیالِ چشمۂ آبِ رواں بھی بوسہ ہے

ملیں ملیں نہ ملیں رہ گزارِ عالم میں
چلے چلو کہ ہے چلنا غبارِ عالم میں

(۱۹۷۹ء)

اے سمندر کی ہوا

اے سمندر کی ہوا کس کو جگاتی ہے بتا
رات کی روح تو خوابیدۂ آلام ہوئی
تیری فریاد کے آہنگ سے جی ڈوب گیا
سعیِ غم خواریِ دل موردِ الزام ہوئی

اجنبی بن کے بہت شہر کا احوال نہ پوچھ
کیا کوئی غم تری پریوں کے سفینوں میں نہیں
اے سمندر کی ہوا فرصتِ آزادیِ شوق
جز غمِ ضبط کنارے کے حسینوں میں نہیں

اے ہوا ساحلِ خفتہ کے مقدر کو نہ پوچھ
نیند افلاس ہے احساس کی نایابی کا
پیش گویانِ تغیّر کی زباں پر اب تک
نام آتا ہی نہیں عالمِ بے خوابی کا

کس قدر فطرتِ آزاد کے آئیں کے خلاف
حرف ہر جزر و مدِ شوق پہ آتا ہی رہا
اے ہوا پوچھ نہ کچھ میرے سکوتِ دل کی
حبس اک دام رگ و پے میں بچھاتا ہی رہا

اے ہوا ناخنِ صد گرہ کشائے طوفاں
بادبانوں میں چھپائے ہوئے منہ رو بھی چکی
ایک مدّت سے یہ فریاد ہے آوارۂ گوش
داستاں غرق سفینوں کی بہت ہو بھی چکی

اے سمندر کی ہوا میں بھی تو تیرے مانند
ہجر کی شب میں ہوں فریاد کناں برسوں سے
یوں تو ہر لمحہ بہ اندازِ وصال آتا ہے
اک تغیّر ہے کہ بے تابیِ جاں برسوں سے

(۱۹۷۵ء)

آخری سفر

طلوعِ مرگ ہے ہر لمحۂ گریزاں سے
لپٹ رہی ہے کوئی دھند مطلعِ جاں سے

سفر نصیب ہے یہ مشتِ خاک ہم نفسو
ہزار کوس کی منزل بھی ہو تو طے ہو جائے
مگر جو باگ اٹھانے میں دیر ہو تو ذرا
اک اور دورِ وفا اور دورِ مے ہو جائے

سلگ رہی ہے برابر دلوں میں آتشِ شوق
کوئی جو سکّۂ مقلوب ہو پگھل جائے
یہ زندگی کا مسِ خام کیمیا نہ بنے
دمِ جنوں سے ذرا ماہیت بدل جائے

بجھی نہ پیاس تو کیا زندگی کا مے خانہ
کسی پہ قرض کی اک داستاں سناتا رہے
اسی کے نام سے زندہ ہے روحِ تشنہ لبی
جو اس فسانے میں ٹکڑا کوئی بڑھاتا رہے

مثالِ انجمِ گرداں ہے رہ نوردیِ شوق
سفر کی گرد جبیں پر ہے کہکشاں کی طرح
رخِ حیات پہ دشتِ بلا کا دامن ہے
زمیں کا دور ہے بے مہر آسماں کی طرح

ہمیں پہ عشوہ و ناز و ادا کی یورش ہے
ہمیں پہ عشق کا الزام ہے، ہمیں پہ رہے
کرم کے رُخ سے ملی ہے جو زندگی کی سزا
کسی کا دورِ کرم تا ابد، زمیں پہ رہے

(۱۹۸۶ء)

خرام

کوئے بے تابی کی نیلی اوس میں محوِ خرام
دودھیا چادر میں اک نازک پری آہستہ گام

نرم دوشیزہ سبک تلووں کا رکھ دیتی تھی بار
رات کی زنجیر پر چلتی تھی کیا دیوانہ وار
جنبشِ دل کی طرح تھا وہ خرامِ تازہ کار
صبح تک اس کے پروں کی جنبشیں تھیں خواب میں
اک ہوا تھی زندگی کے گوشۂ محراب میں

مجھ کو بے حد چھیڑتا تھا اس کی پرچھائیں کا چھل
میری آنکھیں تھیں تعاقب میں بہت پہلے پہل
وہ یہ کہتی تھی ٹھہرنے کا نہیں کوئی محل
پا برہنہ دشت و در میں دور تک جاتا تھا میں
دل کی کانِ زر کا سونا دے کے ٹھہراتا تھا میں

ایڑیاں وہ بیضوی آتش اثر ہوتی گئیں
نرمیاں تلووں کی سب برق و شرر ہوتی گئیں
خنجروں کی دھار سے بھی تیز تر ہوتی گئیں
میں نے بھی آنکھیں بچھا دیں رات کی زنجیر پر
اس کے تلووں کی لگن میں سو گیا شمشیر پر

رہ گزر اس کے دمِ رفتار سے ہے شعلہ فام
کٹ گئے دوشیزہ تلوے بجھ گئی نبضِ خرام
کوئلہ سی ہوگئیں وہ ایڑیاں آخر تمام
خاکِ دامن گیر سے لیکن یہ رَم رُکتا نہیں
ربط کی زنجیر سے اس کا قدم رُکتا نہیں

(۱۹۶۷ء)

سفینہ

سوادِ شہر کو ساحل کی روشنی کو سلام
رواں ہے فن کا سفینہ شکستہ و بے نام
اٹھا سکا نہ شبِ غم میں بھی کسی عنواں
ستونِ روشنیِ شہریار کے احساں
ہوا نے، ابر نے، موجوں نے اس کو گھیر لیا
کئی غنیموں کی فوجوں نے اس کو گھیر لیا
خدائے بحر نے غصّے میں جال ڈال دیا
نحیف جان کے ترشول پر اچھال دیا

اِدھر پہاڑ سی موجیں تھیں اور ہوا کا جنوں
اُدھر ہے زور پہ کچھ اس کے ناخدا کا جنوں
دعائے ردِّ بلا دو کہ آسرا رکھّے
حصارِ خود نگہی میں اسے خدا رکھّے
اندھیری شب میں کوئی خطِّ راہ داں رہ جائے
ستارے ماند نہ ہوں اور بادباں رہ جائے

(۱۹۸۰ء)

بھائی کی وفات پر

(۲۹ مئی ۱۹۷۵ء)

گھر میں کیا رہیے کہ ویرانی سی ویرانی ہے
صاحبِ خانہ کا سایہ تھا جہاں، ساتھ نہیں
وہ قناعت کہ جو سیرابِ امارت تھی بہت
ریگِ صحرا میں وہی موجِ رواں ساتھ نہیں
وہ دیانت جو امینِ سخنِ آبا تھی
جب ضرورت ہے مری خود وہ یہاں ساتھ نہیں
اب اندھیرا ہے بہت راہ میں اے پائے جنوں
روشنی دیتی ہوئی شمعِ نہاں ساتھ نہیں
وہ رفاقت جو گھنے سایے کے مانند رہی
تیری رفتار ہو کچھ عمرِ رواں ساتھ نہیں

ساتھ ہیں قافلۂ نو کے درخشندہ جبیں
نرم رَو صبح کے تارے کا سماں ساتھ نہیں
سودمندانِ خرد پیشہ رفیقوں کا ہے ساتھ
محرمِ پردگیِ کارِ زیاں ساتھ نہیں

موسمِ گل کی خبر وحشت اثر ہوتی گئی
اک نہ اک موجِ ہوا زنجیرِ سر ہوتی گئی

سیکڑوں پیکار کے آئیں تھے لیکن ہر مہم
ایک خوابِ خود فراموشی سے سر ہوتی گئی

شہر کی آئینہ بندی کو بھی کل تم دیکھنا
خاکِ دل میری اگر یوں در بہ در ہوتی گئی

غیر کے خیموں میں جا نکلا ہے وہ صاحب جمال
جو بھی کشتِ گُل اِدھر تھی سب اُدھر ہوتی گئی

حفظِ جاں کا دل سے جاتا ہی رہا آخر خیال
زندگی لمحہ بہ لمحہ مختصر ہوتی گئی

وہ شکستِ دل جو تھی تہذیبِ جاں کی روشنی
ہم جدھر نکلے چراغِ رہ گزر ہوتی گئی

صحبتِ یاراں سلامت نامِ ساقی زندہ باد
زندگی کی شب بہ اندازِ سحر ہوتی گئی

(۱۹۵۵ء)

نثار یوں تو ہوا تجھ پہ نقدِ جاں کیا کیا
مگر رہا بھی ترا حسن سرگراں کیا کیا

الگ الگ بھی بہت دل فریب نکلے گی
کہیں گے لوگ ابھی تیری داستاں کیا کیا

حسابِ مے ہے حریفانِ بادہ پیما سے
اٹھے گا اب کے رگِ تاک سے دھواں کیا کیا

نفس کی رَو میں کوئی پیچ و تابِ دریا تھا
گیا ہے وادیِ جاں سے رواں دواں کیا کیا

وفا کی رات کوئی اتفاق تھی لیکن
پکارتے ہیں مسافر کو سائباں کیا کیا

ہزار شمعیں جلائے ہوئے کھڑی ہے خرد
مگر فضا میں اندھیرا ہے درمیاں کیا کیا

(۱۹۵۵ء)

یک دگر ہو کے بکھرتا ہے سخن کیا کہیے
قصۂ یادِ حریفانِ کُہن کیا کہیے

ہر تغیّر ہے کسی قافلۂ دُور کی گرد
پردہ دارِ غمِ منزل ہے وطن کیا کہیے

کُھل کے بکھری بھی بکھرنے میں بھی اے زلفِ دراز
کس قیامت کی رہی تجھ میں شکن کیا کہیے

دیکھنے میں تو وہ جیسا بھی نظر آتا ہو
لیکن اس شوخ کا اسلوبِ بدن کیا کہیے

ایک دو شب سے مرا خوابِ جنوں ایسا ہے
ٹوٹ جاتی ہے کوئی دل میں کرن کیا کہیے

(۱۹۵۵ء)

٭

فغاں کہ رسم و رہِ عاشقی بھی خام ہوئی
جبینِ شوق تری بندگی بھی عام ہوئی

قفس میں ذکرِ غمِ بال و پر کی بات نہ پوچھ
عیاں بھی جرأتِ پرواز زیرِ دام ہوئی

ترے کرم کا زمانہ ارے معاذ اللہ
نگاہِ شوق اٹھی داستاں تمام ہوئی

وہی جو محرمِ رازِ وفا بھی تھے ہمدم
انھیں پہ زندگیِ عشق کچھ حرام ہوئی

حدیثِ لالہ و گل کا جب اختصار ہوا
بہار تیرے تصوّر کا ایک نام ہوئی

سکوتِ عشق کا اک تار بھی نہ ٹوٹ سکا
ہزارہا نگہِ حسن ہم کلام ہوئی

کس احتیاط سے کتنے جتن سے اٹھی تھی
وہ اک نگاہ جو بیگانۂ پیام ہوئی

فضا ہی گزرے ہوئے کارواں کی یاد میں ہے
مسافرو! یہ کہاں آ کے آج شام ہوئی

(۱۹۵۶ء)

محفلِ شب کا سماں صبح کے آثار کے بعد
دودِ یک شمع ہے خوابِ در و دیوار کے بعد

ہم نہ کہتے تھے محبت میں زیاں ہے اے دوست
کوئی حاصل نہیں اس حاصلِ دشوار کے بعد

بڑھ گیا خوابِ زلیخا سے ذرا قصۂ حسن
سلسلہ ختم ہی تھا گرمیِ بازار کے بعد

دل کو احسانِ وفا یاد دلانے کے لیے
ایک دنیا ہے ترے سایۂ دیوار کے بعد

غم اسی وقفۂ بے نام کو کہتے ہوں گے
آپ جس سوچ میں ہیں کاوشِ اظہار کے بعد

ہر تعلّق میں ہے زنجیرِ گراں کا حلقہ
یعنی اک مژدۂ آزادیِ گفتار کے بعد

تھا بھی کچھ ذکرِ حریفاں سے طبیعت میں سرور
گفتگو آئی بھی اک ساغرِ سرشار کے بعد

(۱۹۵۶ء)

جنوں کے دور نے دیوانگی کے اک تسلسل نے
مجھے آشفتہ سر رکھا ترے سودائے کاکل نے

نکلنے ہی کو تھا اک قصۂ اسبابِ محرومی
دلِ رنجور کی کایا پلٹ دی ساغرِ مُل نے

پسِ خوابِ جنوں بس اک ہوا ہے، سر پٹکتی ہے
اڑا دی نیند ہی آنکھوں کی اس زنجیر کے غُل نے

بگولا ہو کہ محمل وحشتِ دل کم نہیں ہوتی
کہاں پہنچا دیا اے دوست اک تیرے توسُّل نے

بہ قیدِ رسم کردی کوہ کن نے عشق کی دنیا
اٹھا لی منّتِ تیشہ بھی شوقِ بے تائل نے

مگر موسم بھی ہے من جملۂ آدابِ بیداری
جگایا شاخِ گل کو خواب سے آوازِ بلبل نے

مزاجِ عشق پر کب تھی گراں یوں تیری دُوری بھی
ملا دیں خام کاری سے حدیں تیرے تغافل نے

صبا کو آ گیا افسانہ در افسانہ ہو جانا
بڑھا دی داستاں دستِ جنوں کی تیرے کاکل نے

ہوا ایسی نہ وقت ایسا مگر کوئی تغیّر ہے
کہ آپ اپنی جگہ لَو تیز کردی شعلۂ گُل نے

(۱۹۵۶ء)

دمِ سحر نہ کیا وا لبِ سخن ہم نے
بجھا کے دل میں رکھی شمعِ انجمن ہم نے

ہزار چشمۂ حیواں کی آبرو دے دی
ترے سوادِ بیاباں کو اے وطن ہم نے

وہی معارفِ پیشیں ابھی ہیں محوِ فروغ
لبِ صنم سے سنی خوئے برہمن ہم نے

گیا جو کام سے دستِ جنوں بلا سے گیا
تجھے بھی دیکھ لیا زلفِ پُر شکن ہم نے

کبھی کبھی کفِ مارِ سیہ میں دیکھا ہے
جنوں کی آنکھ سے اک برگِ یاسمن ہم نے

درونِ خانہ ترے خال و خط کی رَو آئی
جلائی شمع سرا پردۂ سخن ہم نے

نگاہِ نرم میں فردِ بہار لرزاں ہے
کھلا دیے سرِ مژگاں گل و سمن ہم نے

متاعِ دید تری برقع افگنی پہ نثار
اُفق پہ دیکھ لی اک وقت کی کرن ہم نے

نوا کہ جرم و سزا آپ خود تھی اپنے لیے
رگِ گلو میں رکھا حلقۂ رسن ہم نے

زمینِ حشر چھپا کر رکھی ہے تیرے لیے
جو بے دیار تھی وہ نعشِ بے کفن ہم نے

(۱۹۵۹ء)

غلط بیاں یہ فضا مہر و کیں دروغ دروغ
شراب لاؤ غمِ کفر و دیں دروغ دروغ

ہزار نخلِ گماں ہیں ابھی نمو آثار
ازل کے دن سے ہے کشتِ یقیں دروغ دروغ

حدیثِ رشکِ رقیباں ہوئی ہے جس کی نظر
میں اور اس کی لگن ہم نشیں دروغ دروغ

خود اپنی مستیِ پنہاں سے ہاتھ آتا ہے
شکارِ نافۂ آہوئے چیں دروغ دروغ

میں اور شکوہ سرائیِ زخم بے سببی
تو اور دشنہ تہِ آستیں دروغ دروغ

ضرور کوئی نظر ہے حریفِ خود نگری
وہ اور بزم میں چیں بر جبیں دروغ دروغ

ملول کچھ غمِ بالیدگی سے ہے ورنہ
سرشتِ گل کو ملالِ زمیں دروغ دروغ

صدائیں دیں تجھے خلقِ خدا نے مقتل سے
تری گلی میں خبر تک نہیں دروغ دروغ

(۱۹۵۸ء)

حساب ہائے غمِ چشم و گوش نکلے ہیں
ہزار طرح کے قصّہ فروش نکلے ہیں

وہ لوگ جن کی زباں خود تھی سازِ صد آہنگ
رہینِ مے کدۂ بے خروش نکلے ہیں

جنوں کے بعد یہ خوابِ جنوں نہ ہو یا رب
یہ مرحلے جو بہ عنوانِ ہوش نکلے ہیں

کبھی تھی ظلمتِ شامِ وطن فزوں جن سے
چراغ لے کے وہ آئینہ پوش نکلے ہیں

زمیں پہ کب سے ترے نام کے ہیں ہنگامے
کہاں کہاں کے پیامِ سروش نکلے ہیں

جبینِ ناز کے وہ زاویے نظر میں نہ تھے
جو خوابِ صنعتِ گوہر فروش نکلے ہیں

اُسی گلی میں سنا ہے کہ شورِ محشر ہے
اُسی گلی سے تو ہم بھی خموش نکلے ہیں

اک اور دورِ وفا خوابِ خود فراموشی
ہزار عشق کے نکتہ فروش نکلے ہیں

(۱۹۵۹ء)

پہلے پہر جو تیری حکایت صبا سے تھی
دستک سی در پہ ایک برابر ہوا سے تھی

اوروں میں جا کے رمزِ محبت نہ بھولتی
یہ بھی اُمید اک نگہِ آشنا سے تھی

آخر مجھے جنوں بھی نہیں ہمرہانِ خام
کیوں ناخدا سے ہو جو شکایت خدا سے تھی

وہ دن کہاں گئے کہ محبت کے نام سے
پیدا ہزار رُخ کی اشارت ہوا سے تھی

فریاد کے سوا سرِ گل صوتِ عندلیب
ہدیہ سا اک قبیلۂ خونیں نوا سے تھی

(۱۹۵۹ء)

سوغات

But an autobiography can only
Survive in asbes.
Persistence is extinction

— **Montale**

تعارف

دامنِ شہر میں تھی چاند کی قندیلِ کہن
رات کے نم سے حریری تھا ہوا کا دامن
دور میداں میں قناتیں تھیں کہ اک ناگ پھنی
سایۂ خیموں پہ لرزتے تھے اٹھائے ہوئے پھن
رقصِ بسمل سا ہوا کرتی تھی بے تابی میں
نیم شب تھی کہ رُکا آ کے کوئی برقع فگن
آئنہ گاہِ محبت میں تھا پرتو جس کا
اس کی تقدیر تھی بجھتی ہوئی شمعوں کا لگن
موجِ خوں دل سے اٹھی صورتِ آئنۂ جاں
مانگنے عرض چلا گوہرِ خوبی سے پھبن
اس کا چہرہ تھا کہ اک چاند پہ بکھرے گیسو
اک خطِ دید پہ ٹھہری تھی ابد ساز کرن

زلف میں ابرِ سیہ، پشت پہ اک برق کی رَو
قد و گیسو میں زمانے کے لیے دار و رسن
کیمیا گر کے طلسموں کی جلائی ہوئی آگ
جسم کے شعلۂ عریاں میں نکھرتا کندن

نسلِ خوباں قدِ بالا میں سناں تولے ہوئے
روم و یونان کے لشکر ہوں محافظ وہ بدن
کاٹ کرتی ہوئی آپس میں سنہری قوسیں
مرمریں شانوں پہ اُلٹے ہوئے پیالوں کا ساکن
مہرِ زنگی تھی کہ سینے کے خزانوں پہ کوئی
مارِ دم بستہ کبوتر کی لیے تھا گردن
ناف کی رو میں گرہ خوردہ تھی موجِ دریا
شکمِ صاف تھا اک موجِ بلا کا دامن

خوں بہا مستیِ پنہاں کی تھی خوش بو اس کی
دشت میں دام گزیدہ تھا اک آہوئے ختن
میں نے پوچھا کہ ترا رم جو ہے زنجیر بپا
گردشِ وقت کی شورش ہے کہ خوفِ رہزن

کیوں اندھیرے کی تو آسیب زدہ قید میں ہے
جرم کیا تجھ سے ہوا مشعلۂ طاقِ زمن
سن کے اس نے یہ کہا، رہروِ خواب آلودہ
اس گزرگاہ میں ملتا ہے کسے اذنِ سخن

کون ہوں میں یہ مرے حسن کا پرتو کیا ہے
کارِ تخلیق میں اک بے خبری کا ہے چلن

کوزہ گر چاک کی گردش سے یہی کہتا ہے
نقشِ نو کی تری گردش ہے فقط پیراہن
ٹوٹ جائے جو کوئی ظرف تو آتی ہے صدا
گِلِ کوزہ کی خرابی تھی کہ رکھتی تھی شکن
زندگانی کے درِ بازِ بیاباں میں کوئی
نہ کہیں چشمۂ حیواں نہ کوئی نہرِ لبن

جادہ پیمائے بیابانِ وفا میں بھی ہوں
زندگی میرے لیے خود ہے سوالات کا بن

(۱۹۷۶ء)

قرب کی ایک شام

دامنِ جاں سے لپٹتا ہے غبارِ سرِ شام
ترک کر آئنۂ خود نگری قالبِ خام
استخوانوں سے لپٹتی ہوئی اک درد کی رُو
ڈھونڈتی ہے کسی ناسور کی نادیدہ نیام
ساعتیں ہیں کہ کسی آتشِ سوزاں کا ہیں طشت
اس سے بڑھ کر ہے کہاں جرمِ محبت انعام

نفسِ تازہ کہ ہے کوئے وفا میں گرداں
کیا ہوا حسن سے کہتا ہے ترا اذنِ خرام
مدتیں ہوگئیں ویرانیِ طاقِ جاں کو
کیوں ہوئی تیری ضیا پوش قبا دودِ تمام

سن کے اس نے یہ کہا، وقت کی تقدیر ہے یہ
یہ سیہ پوشی فقط حسن کا کب ہے انجام
میں نے جب گھر سے نکالا تھا قدم پہلے پہل
رات کے خواب تھے نوعمر ہوا میں نیلام

گوئے نوخیز تھی چوگانِ بقا میں مسرور
موجِ انفاس کا تھا اوجِ ثریّا پہ مقام
عہدِ گل پوشی و دستورِ حنا بندی سے
موجِ خوں تھی کہ بپا گوشِ وفا میں کہرام
محرمانہ بھی نگاہوں کے کئی دائرے تھے
ورنہ بے مہریِ دوراں کو کیا کس نے رام
سارباں مجرمِ گم کردگیِ ناقہ ہوئے
شہر سے سارق و قزاق کا اٹھتا تھا قوام
بیج پلتا ہو اگر خوف کی تاریکی میں
ریزہ ریزہ ہے سرِ شاخ ہی مغزِ بادام
میں نے اس ماہ رُخِ صلح چشیدہ سے کہا
کیا تجھے یاد نہیں مرگِ محبت کی وہ شام
دل زدہ ہو کے مرے شوق کی بے تابی سے
جرم کی فرد پہ جب تو نے لکھا تھا مرا نام

بجھ رہی تھی شفقِ شام کہ تو نے مجھ کو
رمز در رمز سنائے تھے غمِ جاں کے پیام

یوں سرِ راہ گزر میں نے پکارا تھا تجھے
ٹھہر اے آہوئے وحشی میں بگولا ہوں نہ دام
ہمرہی میری فقط پردۂ غم کی ہے گواہ
شرفِ ذات کی طالب ہے تری بوئے مشام

ہم اکیلے بھی نہ تھے شاہدِ عینی تھا کوئی
شک نے اس بات کو بھی جبر کا سمجھا اقدام
نیند سی غم کو جو آئی تو جواب اس نے دیا
روحِ عصمت ہے وہی مجھ میں جو تھی آئنہ فام
اب ہنسی آتی ہے آئینۂ دل پر مجھ کو
اس کے چٹخے ہوئے شیشے پہ رہی گرد مدام

ایک تجدیدِ ملاقات کا دل تھا منکر
سکۂ عشق ہے جس طرح بخیلوں پہ حرام
وقت کے دشنۂ پنہاں نے جگر چاک کیا
زخم میں سوختہ ریشم نے کیا ہے ابرام

شک کا خنجر بھی ترا سوزِ یقیں بھی تیرا
تیری تخلیق کے رُخ دیکھ لیے ربِّ انام
شرفِ ذات میں غلطیدہ ہے نورِ عصیاں
روحِ عصمت کو ملا روزِ ازل ہجرِ دوام
دستِ نادیدہ میں رومال تھی جو موجِ ہوا
دے گئی دور سے کچھ دل کے سفینے کو پیام

میرے دروازۂ دل پر ہے کھڑی شمع بکف
نیم رخ ہو کے پشیمانِ جفا قرب کی شام

(۱۹۷۸ء)

بدگمانی

آگہی جسم کی رکھتی ہے اک اپنی نسبت
تھا اسے حسن کا احساس سزائے فطرت
گرد آشفتہ خیالوں کی تھی بوجھل دل پر
نیند پر سایہ فگن کب سے تھا ابرِ وحشت
کب سے تھا اک ہدفِ آب و ہوا پیکرِ ناز
کُشتہ شمعوں کا دُھواں طوقِ گُلو کی صورت
ایک آتش زدہ مفلوج پرندے کی طرح
بدگمانی سے تھی کچھ اس کی زباں میں لکنت
دل کے گوشے میں تھی اک ناگ پھنی کی مانند
کسی بے نام سی تحقیر سے اُگتی نفرت

زندگانی تھی کہ گرتی ہوئی دیوار کوئی
روشنی سکّۂ مقلوب تھی ، حاصل ظلمت
پھینک دے گوہرِ یک دانہ کو دلدل میں کوئی
کارِ دنیا سے تھی یوں پاسِ وفا کی قیمت
میں نے پوچھا کہ ترے عکس سے آئینوں میں
پا چکی ذوقِ جنوں کتنے دلوں کی حدّت

کیوں لرزتے ہیں تری آنکھوں میں ایسے سایے
جو زباں پا کے بنیں رمزِ چراغِ خلوت
کچھ بتا مُہر بہ لب کیوں ہے تو اے پیکرِ ناز
کچھ تو ہے شیشۂ ناموس کی آخر قیمت
سن کے اس نے یہ کہا ، مہر و وفا کے قصّے
تابِ گویائی جو ملتی تو میں کرتی جرأت
صدرِ یک مسندِ عشرت، گہِ خسرو ہونا
رات کی رات ہے اک حدِّ سرابِ الفت
یوں تو کھونا بھی ہے اک خرمنِ حاصل لیکن
ایسے حاصل کے سکوں کی نہیں مجھ میں قدرت
دور کی بات نہیں میرے رخِ تازہ نے
پائی تھی وقت سے اک کشتِ ابد کی مدّت

آب اندام جوانی تھی کہ زیرِ چادر
عود مجمر سے طلب کرتا تھا فردِ حرمت
جیسے آہوئے رمیدہ کو ہو صیّاد کا غم
چشمِ خود بیں میں تھی یوں ایک تماشا عصمت
ناگہاں راہ میں رخ آ کے ہوا نے بدلا
زندگی ہوگئی اک خوابِ جنوں کی صورت
شمعِ خلوت بھی ہوئی میرے لیے آخرِکار
مشعلِ قافلۂ دور بہ دودِ ہجرت

میں ہوں تشکیک کے سایوں میں گرفتار اب تک
ہجر میں غم، نہ رہی وصل میں کوئی لذّت
کس سے کہیے کہ ہوئی خاک بسر میرے لیے
بانکپن میں جو حریفانہ تھی میری سطوت
ہر تغیّر کی زمیں رکھتی ہے اپنا افسوں
دل اگر دے بھی کسی چال کی مجھ کو فرصت

میں کہ محور بھی ہوں اور گردشِ پرکار بھی ہوں
ایسے حلقوں سے نکلنے کی نہیں مجھ میں سکت
خود مرے حسن کی اس آتشِ پندار سے کاش
مجھ کو مل جائے کوئی حسنِ عمل کی ساعت

(۱۹۷۸ء)

حسن اور شبِ ہجراں

شمع رُو حسن سے کرتی تھی شبِ ہجر سوال
کیوں مرے نام کی تقدیر ہے یہ قرعۂ فال
کس لیے میری رقیبانہ ہوا کی زد میں
اک جگر چاک ہے عشاقِ جہاں کا احوال
جا چکے ہیں ترے فتراک کے نخچیروں میں
تیر سب میری کمانوں سے ، یہ کیسا ہے کمال
کس مروّت سے ٹپکتا ہے تری آنکھ سے زہر
جس کی اک بوند سے جل اُٹھتے ہیں سرسبز نہال
تیری بے مہری کا دامن ہے سمومِ صحرا
تیری سفّاکی سے ہے روحِ زماں بے اشکال

کب سے طالب ہیں حریفانہ جگرداری کی
تیرے ابرو کی کمانیں ترا آئینِ جلال
فرق ہے تیشۂ فرہاد و لباسِ مجنوں
شہر ویراں کیے تُو نے تو گلستاں پامال
آرزو تیری قبا ، تیرا گلوبند فریب
معصیت ہے ترے آئینے کو زنگار مثال
آبِ خنجر بھی ترے مکر سے اک سلکِ گہر
زہر بھی شہد ہے حیلہ ہے ترا وہ سیّال
کیوں تری آگ کی لَو نرم ہوئی ماند پڑی
جب کبھی لعل و جواہر نے کیا استقبال

سن کے یہ حسن نے اک آہ سی کی اور کہا
کیوں تجھے ہے شبِ ہجراں مرے ہونے کا ملال
یہ نمِ گِل مرا زیور مری سوغات ہوا
تحفۂ مادرِ گیتی ہیں یہ میرے خط و خال
اس نمِ گِل سے مرا بطن ہے اک جائے پناہ
خاندانوں کی بِنا رسمِ جہاں کا احوال
دستِ قدرت نے ضدیں ساری بہم کیں مجھ میں
خیر مانندِ دعا ، فطرتِ شر ، مکر کا جال

آبیاری کی صفت ہے مرے پیکر میں نہاں
پیچ و تاب اس کا مقدّر ہے نشہ ہو کہ ملال
کچھ نمِ گِل صفتِ آب کی پیکاروں میں
زندگی کو بھی کروں شکل کوئی میں ارسال
ایک چشمہ سا اُبلتا ہے مرے سینے میں
آبِ گم اس کو سمجھ لو کہ رسائی ہے محال
وہ طلسمات ہیں اس ذہن کے بجلی گھر میں
وصل میں ہنس ہے گردوں کا جلائے پر و بال
ابدی آگ ہے میرے رگ و پے میں جاری
ماہ و انجم کی حریف آج بھی ہے میری سفال
قربِ عشّاق سے بڑھ کر مجھے اس کی ہے لگن
ان کے سینوں میں رہوں آتشِ سوزاں کی مثال
استخوانوں میں جلے مغز، دُھواں دل سے اُٹھے
روحِ عصمت کا وہ پردہ ہو کہ عصیاں کا جلال

(۱۹۷۸ء)

حدِ عصیاں

اے بہ رخ شعلۂ مینا و بہ قدِ سروِ سہی!
آئنہ تیرا سنبھالے ہے مری بے نگہی
دشتِ دل میں بھی ذرا آہوئے آسودہ خرام
ایک دو دن کے لیے فرصتِ آماج گہی

سن کے اس نے یہ کہا، تجھ کو بھی۔ ہے ربط کا شوق
میں اترتی ہوں کسی دل میں تو مانندِ وحی
لعبتِ خاک سہی روحِ محبت میں ہوں
اور سینہ ہے ترا صدرِ کشادہ سے تہی
خاک چمکے گی سکونت سے مری شب تیری
ہاں مگر ربط کے خنجر کا کوئی زخم سہی

جزر و مد میرے بدن کا ہے کہ ہنگامِ وصال
سلکِ قلزم میں ہے بے تابیِ ماہی و مہی
اک مہم عصمت و عصیاں کی ہے آئینِ وجود
گفتگو آئی مگر گوشِ محبت میں رہی
ماند پڑنے لگی جب شمع کی لَو اس نے کہا
کیا سرِ شام ہی اس شمع کی تقدیر گہی
آپ ہی آپ کئی شکر کے پہلو نکلے
زاویے رُخ کے جو بدلے تو ہوا تیز بہی
کچھ مروّت کی جو سوجھی تو مثال ایسی تھی
پابرہنہ ہو گزرگاہِ غلاماں میں شہی
ہاتھ سینے پہ رکھا دل کی جو دھڑکن دیکھی
ایک آفت زدۂ سلسلۂ امر و نہی

ہنس کے فرمایا کہ تو محرمِ اسرار نہیں
ورنہ عصیاں کی حدوں میں ہے تری بے گنہی

(۱۹۷۵ء)

۞

کوئی قرار کا باعث نہ وجہِ تسکیں ہے
مگر وہ جب سے گیا ہے وداعِ تمکیں ہے

کہاں کے تنگیِ بندِ قبا کے افسانے
ز فرق تا بہ قدم وہ نگاہ خود بیں ہے

سنبھل کے اے نگہِ اوّلیں کی گیرائی
کچھ اب کے مرحلۂ جانِ زار سنگیں ہے

بکھر گئی ہے کسی خوابِ ہم کناری میں
دُھواں دُھواں جو بہت آج زلفِ مشکیں ہے

ان آہوانِ رمیدہ کو کیا خبر اس کی
ہوائے تیز میں رُسوا جو نافۂ چیں ہے

کچھ اب کے کفرِ خداداد کی وہ شورش ہے
اُسی گلی میں چلا ہے جو صاحبِ دیں ہے

طلوعِ صبح کے مانند ہے وہ پیکرِ ناز
جوابِ شاخِ گل و دادِ اشکِ خونیں ہے

(۱۹۵۹ء)

میں اب کے گرفتار ہوں جس کا وہ اگر آئے
ایسا تو کوئی شہر میں شاید ہی نظر آئے

جس خوابِ نیستاں میں شراروں کی چمک تھی
کچھ لوگ تو اس خواب کی تعبیر بھی کر آئے

اے خلقِ خدا جس کا امکان نہیں ہے
وہ زلف کبھی کھل کے ذرا تا بہ کمر آئے

نکلے بھی تھے سیرِ گل و گلزار سمجھ کر
اے وادیِ غم تجھ سے گزرنا تھا گزر آئے

کچھ دن سے ہے اس نیم نگاہی کا یہ عالم
اک صبح کا بھولا ہوا جو شام کو گھر آئے

وہ جا بھی چکا تیز ہواؤں میں کبھی کا
بیٹھے رہے کچھ لوگ کہ نیّت کی خبر آئے

بخشی ہے مجھے مجمعِ صاحب نظراں نے
خاکِ درِ مے خانہ کہ تحقیقِ ہنر آئے

(۱۹۵۹ء)

معاشرانِ جنوں جب بہار آتی ہے
ضرورتِ سخنِ پردہ دار آتی ہے

کوئی وطن ہے نہ سرحد کوئی محبّت میں
اک اس میں بے وطنی بے شمار آتی ہے

جو زندگی میں ادھوری ہی رہ گئی وہ نیند
جب آگئی تو سرِ نخلِ دار آتی ہے

صدائے وحش و طیور اور تازیانہ ہوئی
بہارِ تازہ سے کیا ہم کنار آتی ہے

نہ ذوقِ وصل کچھ ایسا نہ دردِ ہجر ایسا
تجھی سے مل کے نظر شرمسار آتی ہے

وفورِ سینہ شگافیِ سنگ سے کیا کیا
زمینِ صد گہرِ آب دار آتی ہے

اک آدمی سے محبّت کے نام پر برسوں
جو گفتگو تھی وہی بار بار آتی ہے

(۱۹۵۹ء)

۞

آئنہ گاہِ رخِ پرتو فگن مانا گیا
دل سے ویرانے کو تیری انجمن مانا گیا

جو بھی نکلا میرے رد کردہ صنم کا معتقد
ہر شوالے میں بزرگِ برہمن مانا گیا

پردۂ غم میں بھی کرتی ہے خرد سفاکیاں
میرا چپ رہنا جوابِ ہر سخن مانا گیا

ڈھونڈتا ہے آج اس میں خود کو اک صاحب خرام
اب زمینِ دل کو بھی ارضِ وطن مانا گیا

نرگسِ بیمار رسوا ، سرو نادم ، گل نثار
جس چمن میں وہ گیا رشکِ چمن مانا گیا

کس قدر خوں ریز نکلی کارگاہِ ابر و باد
شاخِ گل پر ابر کو سایہ فگن مانا گیا

یک دگر ہو کر ضدیں کچھ آب و گِل میں کھل اُٹھیں
رنگِ عریاں کو گلوں کا پیرہن مانا گیا

کس سے کہیے اب کہ تازہ تر بھی ہے اک رمزِ یار
نیند کو وحشی کبوتر کا چلن مانا گیا

(۱۹۵۹ء)

وہ آئنوں سے بھی چیں بر جبیں ہوئے ہوں گے
بغیر اس کے یہ تیور نہیں ہوئے ہوں گے

مزاج دانِ تغیّر کو تا بہ منزلِ شوق
ہزار وہم و گماں بالیقیں ہوئے ہوں گے

وفا کے باب میں یہ شک ابھی غنیمت ہے
کہ بدگماں بھی ہوئے تو ہمیں ہوئے ہوں گے

وہ تیری بزم اور افسردۂ غمِ دنیا
خدا گواہ وہاں ہم نہیں ہوئے ہوں گے

ترے سوا بھی تو عنوانِ قصّہ ہائے وفا
ہزارہا مژہ و آستیں ہوئے ہوں گے

سنا ہے وہ نظر انداز کر گیا ہم کو
تو مصلحت کے تقاضے یونہیں ہوئے ہوں گے

حدیثِ نامہ نویسانِ شہریار نہ پوچھ
صریرِ خامہ پہ وہ نکتہ چیں ہوئے ہوں گے

مرے لبوں پہ نہ رودادِ زخمِ سر آئی
دبی زباں سے یہ قصّے کہیں ہوئے ہوں گے

(۱۹۵۹ء)

تلخ تر اور ذرا بادۂ صافی ساقی
میرے سینے میں خس و خار ہیں کافی ساقی

ظلمت و نور کو پیالوں میں سمو دیتی ہے
شام پڑتے ہی تری چشمِ غلافی ساقی

زہر کا جام ہی دے زہر بھی ہے آبِ حیات
خشک سالی کی تو ہو جائے تلافی ساقی

نشۂ مے سے ذرا زخم کے ٹانکے ٹوٹے
تا ابد سلسلۂ سینہ شگافی ساقی

زندگانی کا مرض کم نہیں ہونے پاتا
یہ مرض کم نہ ہو اللہ ہے شافی ساقی

کاٹ دی گردشِ ایّام کی زنجیر اس نے
کون ہے گردشِ مینا کے منافی ساقی

اک کفِ جو ہے متاعِ خرد و سکّہَ ہوش
جامِ مے دے کہ یہ عالم ہے اضافی ساقی

(۱۹۵۹ء)

✲

سکوتِ نغمۂ جاں روحِ ساز تک پہنچے
متاعِ غم سخنِ دل نواز تک پہنچے

ہوا کے غم سے سلگتا رہا ہے سینۂ گل
کوئی تو سینۂ گل کے گداز تک پہنچے

اُٹھی ہے صیقلِ دیوانگی کے بعد نگاہ
یہ آئنہ بھی اسی محوِ ناز تک پہنچے

بلائے جزر و مدِ جاں ہے دل کی بے تابی
یہ سلسلہ تری زلفِ دراز تک پہنچے

چمک گئے مہ و انجم سے زیرِ پیراہن
رموزِ وصل حدِ امتیاز تک پہنچے

کوئی تو فرصتِ نظارہ نیم رخ پرتو
نظر کبھی تو درِ نیم باز تک پہنچے

بہت اداس گئی آ کے دل زدوں میں صبا
خبر یہ تیرے شبستانِ ناز تک پہنچے

(۱۹۵۹ء)

✡

بے خبر کیوں خطبۂ منبر کو تُو دیتا ہے طول
اس قدر آساں کہاں ہیں آدمیت کے اصول

زخمہ ور کے ہاتھ کا اک معجزہ آہنگ ہے
آسیا کی گردشیں ہیں نغمۂ سازِ بتول

کب سے پامالِ ہوا ملتے ہیں اے نکتہ فروش
حرفِ قرآں ، چادرِ زہرا ، قدم گاہِ رسول

نرخِ بالا مانگتا ہے کلمۂ گفتارِ صدق
قیمتِ آخر سرِ ابنِ علی پر تھا قبول

اے مرے دل شہر کی شمعوں کے اے گرداں لگن
کیا چٹک کر گر رہے ہیں تجھ میں ان شمعوں کے پھول

رنگ کچھ لائی ہے آخر آئنہ بندیِ شہر
منہ پہ جب آنے لگی ہے رہ گزر کی سرد دھول

میں گدائے حرفِ تازہ اور مرے کاسے کی بھیک
خار اندر خار چبھتی بے زبانی کی ببول

(۱۹۵۹ء)

۞

وہ ایک رو جو لبِ نکتہ چیں میں ہوتی ہے
سخن وہی دلِ اندوہ گیں میں ہوتی ہے

کوئی وہ شک کا اندھیرا کہ جس کی جست کے بعد
چمک سی سلسلہ ہائے یقیں میں ہوتی ہے

بہار چاکِ گریباں میں ٹھیر جاتی ہے
جنوں کی موج کوئی آستیں میں ہوتی ہے

وہ خاکِ انجم و مہتاب کو نصیب نہیں
جو موج مرگ و نمو کی زمیں میں ہوتی ہے

غنودہ دینِ بزرگاں میں اب وہ لَو نہ رہی
جو عہدِ نو کے غمِ آتشیں میں ہوتی ہے

یہ رات طائرِ ہجرت زدہ غنیمت ہے
طلوعِ صبح سوادِ کمیں میں ہوتی ہے

کبھی کبھی تو حریفانہ کوئی آتشِ سنگ
فروغ پا کے لباسِ نگیں میں ہوتی ہے

(۱۹۵۹ء)

آتشِ مینا نظر آئی حریفانہ مجھے
اک تغیّر کی خبر دیتا ہے پیمانہ مجھے

تشنۂ نازک مزاجانِ کنشت و دیر کا
برہمن کہنے بھی دے ایک آدھ افسانہ مجھے

کس قدر حیرت اثر نکلی ہے مرگِ عندلیب
اس سپاسِ جاں سے گُل لگتا ہے بیگانہ مجھے

اک خیالِ زلفِ جاناں اک ہوائے پیچ پیچ
اک نہ اک زنجیرِ سر رکھتی ہے دیوانہ مجھے

بوسۂ جاناں میں تھی یوں تو حدِ شکر و سپاس
چاہیے اک لرزشِ لب بھی رقیبانہ مجھے

اس کے پیکر کی جھلک راہوں پہ تھی نزدیک و دُور
کل غروبِ مہر تھا اک آئنہ خانہ مجھے

شہر جن کے نام سے زندہ تھا وہ سب اُٹھ گئے
اک اشارے سے طلب کرتا ہے ویرانہ مجھے

(۱۹۵۹ء)

آغاز

خانہ بربادوں کی وادی میں تری خاک اے دل
اک تبرّک ہے ابھی
تو نے سرگشتہ و بے نام مسافت میں بھی رہ کر رد کی
دور سے کاذب و بے جان، انا کی وہ فضا
جس کے نم خوردہ فیتلوں کا دھواں
کتنے بے سوز دماغوں پہ ہے زنجیرِ طلسم
یہ انا ظلمتِ بے نام کے ان طوق و سلاسل سے گراں
جن میں جکڑے ہوئے جسم
زیرِ سر خشت کو یاقوت و زمرّد کا ورق جانتے ہیں
ایک خود ساختہ بینائی کو
مالِ مسروقہ سی دانائی کو

زندگانی کا اُفق جانتے ہیں
تُو نے سرگشتہ و بے نام مسافت میں بھی رہ کر رد کی
کہنہ آثار حدیں
شرح کرتی ہیں جو نیک و بد کی
تو نے صف بستہ گروہوں میں مری رسوائی
اس طرح کی ہے کہ میں
دُور کا مجرمِ رُوپوش ہوں اور ان کی پناہ
خطرۂ جادہ و منزل کا تدارک ہے ابھی
خانہ بربادوں کی وادی میں تری خاک اے دل
اک تبرّک ہے ابھی
کیسی بے سود اماں پا کے بھی میں تیرے نثار
خُو تری دشت کے آوارہ بگولوں کی طرح
سخت قاطع ہے مقام و حد کی
تو نے سرگشتہ و بے نام مسافت میں بھی رہ کر رد کی
دُور سے کاذب و بے جان انا کی وہ فضا
جس میں آوازِ عنادل ہے نہ بوئے گل ہے
نہ طلسمات ہیں اجزا میں نہ سحرِ کُل ہے
نہ اذانیں رہیں ایسی کہ صف آرا ہوں بہ یک نانِ جویں
چترِ دارا کے حریف

کوئی ایسا کہ سفارت جس کی
سر بکف تیغ لیے بر سرِ دربار آئے
جس کے اک پاؤں میں موزہ ہو، قبا میں پیوند
زنگ آلودہ زرہ میں خورسند
اور پوچھے جو کوئی رمزِ مصاف
اس کے اک وار سے زنجیرِ گراں کٹ جائے
رمزِ ''لا'' سارے حریفوں پہ ہویدا ہو جائے
نہ صدائیں رہیں ناقوسِ برہمن میں کوئی
جن کے جادو کے تلے
وردِ یک حرف سے اصنام کی خاموشی میں
اک رمِ نطق سا پیدا ہو جائے

نہ وہ اجداد کی جرأت نہ وہ آبا کا تصوّر نہ لگن
نہ ہوا سوزِ یقیں کی ایسی
جس نے مغرب کو ہے صدیوں رکھا
کارفرمائے تلاش
بندگی تھی جو خدائی کے لیے جادہ تراش
شکرِ ایزد کہ تری خاک کی بے نامی نے

کچھ نہ کچھ نسبتِ آبا پائی
منتظر راہ میں دنیا پائی

شکرِ ایزد کہ تری راہ میں آئی تو کہیں
بے یقینی کی کوئی رات کوئی شک کی زمیں
جس میں اک بیج بھی گر جائے تو اک نخلِ گماں
آنچ یوں دے کہ یقیں جل جائے
وہم سے سجدہ گزاری کی جبیں جل جائے
شکرِ ایزد کہ تری راہ میں دستِ امروز
زخمِ بازو کے سوا
ذوقِ نمو دیتا ہے
زہر کے جام
تغیّر کے سبو دیتا ہے
شکرِ ایزد کہ ہر اک لمحۂ تازہ اب تک
چشمِ خوں بار کو اک مژدۂ حیرانی ہے
شکرِ ایزد کہ تری خاک میں باقی اب تک
طفلکِ سادہ کی نادانی ہے
وہی رفتار وہی سودا ہے

اور نئی ساخت کے اک تازہ کھلونے کی طرح
آتشِ مہر و رخِ فردا ہے

کوئی درماں نہ سہی، کوئی تدارک نہ سہی
خانہ بربادوں کی وادی میں تری خاک اے دل
کوئی سوغات کوئی رمزِ تبرک نہ سہی
اس میں اک آن ہے اک روح ہے بے تابی کی
اک تپک صدق کی اک شان ہے سرتابی کی
کہنہ اقوال سے افلاسِ سخن سے غم سے

خیر کی مملکتِ بے رم سے
جس نے تشکیک کا سایہ کبھی دیکھا نہ طلوع
یہ نہ دیکھا کہ ہر اک قافلۂ نو کا سفر
اک نئے دشت سے ہوتا ہے شروع

ہر نئے موڑ پہ اک گردِ بلا اُٹھتی ہے
کہنہ اوراق کے تاریک حجابات کی تختی پہ کوئی
خطِ تنسیخ سا کھنچ جاتا ہے
سامنے ــــ مُہر زدہ ــــ

دائرے — اسما و اشکال کے آجاتے ہیں
اس طرف اک نگہِ نیم رسا اٹھتی ہے
آگہی — آئنہ گاہیں لے کر
نصب کرتی ہے مقابل سرِ دشت
اور آغاز کے اس پرتو میں
نیلگوں صدیوں کا افشردہ عرق نوش کیے
کیمیا گر کی طرح
دزدِ یک آتشِ دریافت کوئی روحِ قدیم
صورتِ دستِ دعا اٹھتی ہے
قرنِ تابِ مسِ خام سے باتیں کرتے
قرنِ آہن و سنداں سے گزرنے کے لیے
قرنِ سنگ کے پردوں کو ہٹاتی ہوئی آہستہ خرام

ایک ہم پیشہ سے انساں کی جگر داری پر
ہم بغل ہونے، نکھرنے کے لیے
مسکراتی ہے تو آغاز کے اس پرتو میں
تیرہ غاروں کے لبوں سے پیدا
ایک گم کردہ سی گویائی میں
قرنِ کہنہ سے ایک آدھ صدا اٹھتی ہے

ایک ''لبیک'' کی بیدار صدا
ایک لبیک بہ لبیک صدا کی محراب
جس میں بکھرے ہوئے حرف
علم کی صبحِ سعادت کی طرح ہوتے ہیں
گوشِ آئندہ، نگاہِ فردا
ہر تغیّر میں امانت کی طرح ہوتے ہیں

(۱۹۵۸ء)

رات اندھیری تھی

رات اندھیری تھی اور زار کے محل کی کھڑکیاں بند تھیں
دھندلے فانوس، مدھم رواں قہقہے
کچھ حسیناؤں کے نیم عریاں بدن
اور بدخشاں کے لعل و گہر بے وطن
سیکڑوں پھول اور میوہ ہائے لذیذ
نرم گیتوں کی لے، مشعلوں کی لویں
کھڑکیوں کے خنک برف آلودہ شیشوں کے اُس پار تھیں
ایک جامد سیاہی میں خود آنے والے ستاروں کے مانند تھیں
ایک جامد سیاہی میں ڈھلتا ہوا کربِ بے نام آنکھوں میں تھا

اذنِ رفتار کی آہٹیں ڈھل گئیں تیری آواز میں
ایک موجِ بلاخیز کی کروٹیں ڈھل گئیں تیری آواز میں
تیرے ہاتھوں نے جادو گہن کی نیامِ سیہ سے
ایک تیغِ برہنہ کے مانند
کھینچ لی سارے محنت کشوں کی صلابت

زورِ بازو — محبت
اور خونیں کفن شعلہ خُو چادریں اوڑھ کر
صبحِ نو بستیوں سے گزرنے لگی
ایک تازہ ہوا
جس کے دل میں آخر اُترنے لگی

(۱۹۵۰ء)

کاکلِ وقت

اس صدی کی فکر اور انکشافات نے تمام دنیا کے معاشروں میں تبدیلی پیدا کی۔ شعری فکر میں بھی اس کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ اردو میں اس کی عظیم ترین مثال اقبال کا ''ساقی نامہ'' ہے جس میں اس مصرعے کی اشاریت اپنی جگہ ایک تکمیل ہے:

زمانے کے انداز بدلے گئے

اس نظم کا موضوع یہی بدلے ہوئے انداز ہیں۔ نظم کی آسان ساخت کے لیے عہدِ گزشتہ کی آہستہ روی اور آسائش اور عہدِ نو کی تعمیر اور تیز رفتاری کی جھلکیوں کو چار آوازوں میں تقسیم کیا گیا ہے — دو نسوانی آوازیں اور دو مردانہ آوازیں، سن رسیدگی اور نوعمری کی نمائندہ۔

سن رسیدہ نسوانی آواز:

رات کی آنکھ نم ہے
حسابِ مہ و سال لیتی ہوئی تیز رو ہر گھڑی

دل پہ دستک سی دیتی ہے

بھولے بسرے فسانوں کے عنوان چبھتے ہیں

تیر چبھتے ہیں پیکان چبھتے ہیں

میرے بالوں کی ہلکی سپیدی

میرے احساس میں گھُل رہی ہے

آج میرے لیے کاکلِ وقت یوں کھل رہی ہے

گرد آلودہ سی میز پر آئنہ میرا منہ تک رہا ہے

لاکھ خود بینیوں کے اندھیرے اُجالے میں اس نے کئی

عہد و پیماں کیے تھے

مگر میرے چہرے کی شکنوں سے عہدِ وفا باندھنے والوں پر

مجھ کو اک مستقل شک رہا ہے

آئنہ دیکھنا ہے تو آخر مہ و سال کا آئنہ سامنے ہے

مہین اس کے چہرے پہ ہے دھول ایسی

کہ جیسے ہو رُخ پر نقاب

اس کے پردوں میں یوں مل رہے ہیں

ابھی زندگانی کے افکارِ آسودگی اور بے خوابیاں

جیسے نیند اور خواب

نوعمر مردانہ آواز:

نیند اور خواب ہیں یک دگر، یک لباس آپ کے واسطے

صاف کمرے کی آسودہ دامن فضا
آنچ انگیٹھی کی بھی لطف دیتی نہیں
یہ ہوا خون میں کشتیاں آج کھیتی نہیں
سخت ویراں یہ دیوار و در ہیں
کوئی دستک ہو گزرے ہوئے سال و سن کے مقفّل دروں پر
ہی دستک ہے
کوئی خوش بو ہو گزرے ہوئے سال و سن کے ہی برباد نافوں
کی خوش بو ہے
آپ کے واسطے برگ و سازِ دو عالم بھی ہیں آج مبہم
سامنے آئنوں کے ابھی
زندگی محوِ ترتیبِ گیسو ہے

سن رسیدہ نسوانی آواز:

محوِ نظارہ رہتی ہیں آنکھیں
پھول کھلتے ہیں شاخیں لہکتی ہیں
وقت کی کھیتیاں خوش بوؤں سے مہکتی ہیں
تم بتاؤ کہ محرم ہو تم زندگی کے
کہیں تم کو ایسے دھندلکے میں بھی زندگی کے خط و خال
اب بھی نظر آ رہے ہیں

کہیں آئنے پر مہ و سال کے
چھوٹ سورج کی بھی پڑ رہی
ہے

نوعمر نسوانی آواز:

نام کو یہ دھند لکے ہیں
نقش بے تاب ہیں سیکڑوں
ایک تابِ دروں سے نکھرنے کو ہیں خط و خال
اک تغیّر سے دست و گریباں
خواب ہیں سیکڑوں
آج بھی جاں فزا یہ مناظر
کتنے جوہر لیے عرض کے
مسکراتے ہیں
ایک نکتے میں پنہاں کئی سلسلے طول کے
اک عماری میں موسم کے ہیں
پھل کے اشکال بنتے ہوئے نقش سے پھول کے
آدمی اپنے خوابوں میں کتنا مگن
ہے
لیب میں زہر و تریاق کی ماہیت کو پرکھتا ہوا
بیکروں کے عرق
نلکیوں کے سفوف

جن کے سم میں دواؤں کے نسخے چھپے ہیں
ان کو چکھتا ہوا
آج کتنا مگن ہے
آج کتنا مگن ہے کہ اس کے تجسّس میں اک بانکپن ہے
آدمی چاہتا ہے کہ افلاس و تحقیر کے سارے سایے سمٹ جائیں
دور تک ساری فاقوں سے ویران روحیں
جو تاریک داغوں کو اپنا نشیمن سمجھتی ہیں
چھٹ جائیں
یہ بساطِ زمیں ملک در ملک
کام کی منزلوں سے ہے آباد
رخ بھی ہر منزلِ شوق کا ہے نیا
شوق بھی کارگر ہے
ابھی زندگی ان دھندلکوں میں بھی عشوہ گر ہے
اس کے آئینہ خانوں میں اکثر سنورتے ہوئے آپ نے بھی
تو دیکھا ہے لاکھوں کو
آپ کی ان حزیں یادگاروں میں بھی زندگی کے کئی رنگ ہیں
ان کا افسانہ کہیے
آپ نے سانس میں موسموں کا تغیّر سمویا ہے

آج اسی کو ترازوئے صد کیف و کم کا بدلتا ہوا ایک پیمانہ کہیے
زندگانی کا افسانہ کہیے

سن رسیدہ نسوانی آواز:

زندگی اک کہانی ہے اک خواب ہے
دور تک جیسے ایّامِ رفتہ کی پرچھائیاں پھیلتی جا رہی ہیں
اور خنک سال وسن کی فضاؤں سے رِستا ہوا رنگ بھی
ارغوانی ہے
آج سے کوئی پچپن برس سے بھی پہلے کی اک بات ہے
میرے ایّامِ طفلی کی صبحیں اُفق سے ہویدا ہوئی تھیں
شہر کے خوب صورت مرقّع تھے

زلفِ پُرپیچ کی طرح مڑتے ہوئے راستے
تنگ گلیاں تھیں
اک غنودہ فضا میں کہیں
نیم روشن محلکوں سے کھلتی ہوئی کھڑکیوں سے
مہ رخوں کی ہنسی دم بہ دم خود چھلکتی تھی
ہر شکن وقت کے آئنے میں جھلکتی تھی
حسن کی شوخیاں عشق کا بانکپن

شمعِ سوزاں کی بڑھتی ہوئی لَو سے رخشاں لگن
اور پروانوں کی انجمن
آج افسردہ پاتی ہوں جتنے مکاں
کل وہاں بزم آرائیاں رنگ رَلیاں تھیں
درد درماں سے آسودہ تھا
جاگنا خواب آلودہ تھا
غم میں بھی ضبط تھا شادمانی میں بھی ضبط تھا
مگر آج گزرے ہوئے وقت سے وہ اداسی ہے دل
میں جو ویران باغوں میں ہوتی ہے
خواب بن کر گزر جانے والی ہر اک ساعتِ تیز رو ایک
نشتر ہے
آج نس نس میں چبھنے لگی وقت کی دھار
ہڈیوں میں تپک اس کی گھلتی چلی
ہے
ہر گھڑی درد کی اک گرہ خود ہی کھلتی چلی ہے
بال کھولے ہوئے روحِ مستی
آج خالی ایاغوں کو روتی
ہے
آنکھ بجھتے چراغوں کو روتی
ہے
آج بجھتے چراغوں میں کتنی تھکن
ہے
کاکلِ وقت کی برہمی کا فسانہ

شکن در شکن ہے
آج بھی میری بیٹی
میرے خوابوں میں ہیں
نرم دوشیزہ صبحوں کے لاکھوں دھندلکے
اوس کے بے در و بام لاکھوں محل
جن کی لرزاں حریری قناتوں میں
لالہ و نسترن کر چکے ہیں بسر
ہر گھڑی وارداتوں میں
آج بھی میرے تارِ نظر سے الجھتی چلی ہیں
دھوپ میں لہلہاتی ہوئی کھیتیاں
گاؤں کی بستیاں
گاؤں کی بستیاں دور کہرے کی بے تار و پو چادروں
میں چھپائے ہوئے خود کو
کیا کیا بلندی پہ ہنستی تھیں
خاک کی ظلمتیں آسماں کے ستاروں پہ آوازہ کستی تھی
دور ٹیلوں پہ ٹھنڈی ہوائیں
سیکڑوں اجنبی داستانوں کے عنواں چھڑکتی تھیں
اور نکائی ہوئی کھیتیوں کے کنارے
گاؤں کی لڑکیاں آرزوؤں کی افشاں چھڑکتی تھیں

اجنبی دیس کے گیت گاتی تھیں
دُور تک وادیوں میں تھیں شادابیاں
تازہ فصلیں کھڑی تھیں
لہلہاتی ہوئی نرم و شاداب بیلیں
زلف کی طرح بکھری پڑی تھیں
اور بکھرے پڑے ہیں اِدھر سب مرے خواب،
مایوسیاں، آرزوئیں
وقت کی زلف بکھری پڑی ہے
اس کے موباف کے پیچ و خم کھل رہے ہیں
ہر نفس دم بہ دم کھل رہے ہیں

نوعمر نسوانی آواز:

وقت کی زلف برہم ہے آج
وقت کی زلف بکھری پڑی ہے
اس کے موباف کے پیچ و خم کھل رہے ہیں
وقت کی زلف برہم ہوئی

سن رسیدہ مرد کی آواز:

وقت کی زلف برہم ہوئی

سیکڑوں بار یہ زلف برہم ہوئی
سیکڑوں بار اس کے بکھرنے میں رنگِ ثباتِ جہاں
منتشر ہوگیا
سیکڑوں بار گردِ بلا خیز اٹھی
سیکڑوں بار خود اپنی رفتار میں محوِ منزل نشاں وقت کا قافلہ
کھوگیا
مگر زندگی اک مسافر ہے
سیکڑوں سال سے بے نیازانہ چلتی رہی ہے
میل و فرسنگ سے بے نیاز
کوئی ہمدم نہ مونس نہ کچھ برگ و ساز
مگر زندگی اس صعوبت میں بھی راہ و منزل بدلتی رہی ہے

نوعمر مرد کی آواز:

ہر نفس محوِ تغیّر ہے زندگی
آپ کے دور سے آج تک
کس قدر اس نے عنوان بدلے ہیں
ہر مؤرّخ کے نوکِ قلم پر
گزشتہ سن و سال کی چند پرچھائیاں ہیں
ایسی پرچھائیاں جن کے دامن میں اک حسن ہے سادگی ہے

سن رسیدہ مرد کی آواز:

یاد آتا ہے اب بھی جو انداز تھا زندگی کا
یاد آتا ہے ہر لمحۂ زندگی عافیت کی پنہ گاہ تھا
سادگی اور کتنی حسیں سادگی تھی
سادگی جو مکانوں میں تھی
وہ مکینوں میں تھی
اک ناخوردہ سی موجِ صہبا جو رگِ تاک میں تھی وہی
آبگینوں میں تھی
لوگ کہتے ہیں اک حبس تھا تنگیاں تھیں
مگر دہشت افزا جنوں خیز شر کی فضا میں بھی ہم رنگیاں تھیں
ایک ایسا سکوں تھا جو دل میں اُتر جائے
لَو میں تیزی نہ تھی اور چراغوں میں بھی تیل تھا
رنج و راحت کے سایوں میں، کروٹ بدلنا
سیکڑوں بار گر کر سنبھلنا
آدمی کے لیے کھیل تھا
یاد آتا ہے مجھ کو اسی دور کے ایک پچھلے پہر کے
دھند لکے سے ہوتا ہوا
کارواں زندگی کے نئے موڑ پر آگیا تھا
ایک نبّاض کی دور اندیش اور وقت پر دام افگن فراست
کا سایہ ہے

ڈارون کی ذہانت کا سایہ ہے
اَن گنت سال وسن کی خنک جھیل میں نرم پودوں کے جال
ایک دلدل میں ننھے سے کیڑے کی موجِ نفس پر
رواں زندگانی کی تاریخ کا وہ سفینہ
جسے آج تک وقت کے دُور تک پھیلتے ساحلوں کی کہانی
سناتے ہی گزری

زندگی کا وہ ننھا سفیر
زرد سنگین صدیوں کا آوارہ سیّاح
دلدلوں میں رہی داستاں جس کے عزمِ سفر کی
اک شبِ بے سحر کی
شجرۂ زندگی استخوانوں پہ ہے
دُھوپ اور چھاؤں میں محوِ یلغار
ہونکتے شیر، ڈستے ہوئے مار
وہ بیاباں کی تاریکیوں میں سیہ جن
وہ درندے مہیب اور خوں خوار
ہوگیا ہے گراں خواب صدیوں کا پیمانہ جن کے لیے
عمر کا ایک دن
استخوانوں میں لپٹے پڑے ہیں
زندگی کی طنابوں کو کھینچے ہوئے
وقت پر جن کے پنجے

میخ کی طرح اب تک گڑے ہیں
ڈارون کی کتابوں کے اوراق سے بول اٹھتی ہیں
محوِ تغیّر سونی فضائیں
قدِ آدم خنک گھاس کو کاٹتا تیز پانی
وقت کی کھلنے والی کمانی
اس کی محراب میں طائرِ زندگی کی
اوّلیں پُر فشانی
اک اسی دیدہ ور کے تپاں خواب سے
در کھلے جستجو کے
راہ کے موڑ پر
علم کے باب سے
یہ گزشتہ صدی جب گزرنے لگی تو لرزتا ہوا ہوگئی اک
نشاں اک سوال
سیکڑوں دامِ مرگ و نمو
تیز نبضیں — اُچھلتے لہو
آرزو اور غمِ آرزو سے اُلجھتا ہوا ہوگئی اک خیال

نوعمر مردانہ آواز:

ٹھیک کہتے ہیں آپ
زندگی وہ مسافر ہے جو میل و فرسنگ سے بے نیازانہ چلتی رہی ہے

میل و فرسنگ سے بے نیاز
آزادِ ہر برگ و ساز
دشت و صحرا کے عنواں بدلتی رہی ہے
رات کے پھیلتے سایے کے قلب سے قافلے لے کے یہ صبح
کے دامنوں تک نکلتی رہی ہے
آج بھی روز و شب کے نقابوں سے
نور چھنتا ہے لاکھوں حجابوں سے
آپ اُکساتی رہتی ہے یہ زندگی
ہر نفس خاکیوں کو
گنگ ہو کر بھی ہے اک صدائے جرس

سن رسیدہ مرد کی آواز:

محوِ پیکار ہے آدمی
اس کی تابانیوں کا ہے مخزن
دورِ اوّل ہی اپنی صدی کا
مارکس کی فکر کے سایے گہرے ہوئے تھے زمیں پر
پا بہ زنجیر
اک مزدِ کم مایہ کروٹ بدلنے لگی تھی
ریستوراں قہوہ خانوں میں پیرس کے روحِ تغیّر نے

قہقہوں، گفتگو اور شب خیزیوں سے نکل کر
جیبِ خالی سے
فاقوں سے لینن کے سرگوشیاں کیں
اور ذہنوں کے اوراق الٹتے ہوئے اک ہوا
تیز چلنے لگی تھی
اور اسی عہد میں اک نیا در کھُلا
فرائڈ نے کچھ تہِ خواب دیکھا
اک جنوں خانۂ زندگی
سخت تیرہ بیاباں کے حلقوں میں پنہاں
آپ اپنا ہی قفل و کلید
یک دگر ایک قالب میں ملتے ہوئے اک گہن اور خورشید
عکسِ پدری سے سرگشتہ روح
ہوگئی، کچھ خلل سا دماغوں کا

اور خوابوں میں لاکھوں مریضوں کے اُترا
ایک بڑا سا کچھ تشنہ زاغوں کا
اور اسی عہد کی داستانِ مہ و سال میں
چند جنباں پر وبال موجِ ہوا کے حریفوں میں شامل ہوئے
''رائٹ برادرز'' کے خواب، اور تعبیرِ خواب ایک تاریخ میں

فاصلوں کے سمٹنے کی کہنہ حکایات
مسافت کا چارہ ہوئی
صرف موجِ ہوا پر وہ رقّاص جس کے نرت کے
بحر و بر خود تماشائی ہیں
بے عناں قوتوں کی وہ تسخیر
وہ مچلتی ہوئی ندیوں کی روانی کو روکے ہوئے بند
جن کے بازو سے لپٹی ہوئی تیز و طرّار موجِ رواں
ایک محبوبِ گستاخ و خلوت نشیں کی طرح خود پشیماں ہے
اور اپنی پشیمانیوں ہی سے دست و گریباں ہے
ان پشیمانیوں اور گستاخیوں میں بھی تعمیر کی رَو رواں ہے
بجلیوں کا تنفّس جواں ہے
جن کے لمسِ طرب ناک سے
وقت کے ساتھ ہم رقص ہیں آہنی چاک اور گھومتے تیز پنکھے
دورِ صنعت کا افسوں
دُور تک وہ مشینوں کی آنکھیں
سرخ و بیدار آنکھیں
سینۂ ارض میں جھانکنے والے اوزار
صنعتی ماہی گیروں کے پھینکے ہوئے جال
زندگی کے سمندر سے بے نام اشیا کو کرتے رہے ہیں شکار

صرف محنت کشوں کے کڑے بازوؤں کی صلابت سے
ہے یہ بہار
آبروشیوۂ کوہ کن کی یہی ہے
کاٹ کر جوئے شیر اک اسی نے نکالی ملوں کے دھڑ کتے
ہوئے بے ستوں سے

دور تک شرق سے غرب تک
کوہساروں کے گھونگھٹ میں یہ کوئلے اور لوہے کی کانیں
ایسی کالی حسیناؤں کی چتونوں کی کمندیں
ان کے سفّاک اشارے
ان کے ابرو کی کھنچتی کمانیں
سینۂ آدمی ہی کو اپنا نشانہ بناتی رہی ہیں
سیکڑوں نوجوانوں کو
کرین کے پینگ لیتے ہوئے بازوؤں میں جُھلایا
اور کڑے بازوؤں پر سُلایا
خود جبیں کے عرق سے
پاؤں کی گرد کے ہر نشاں کو مٹایا
ان کے کالے بدن کی چمک میں
گم ہوئیں کتنے انجینئر کتنے معمار کی کاوشیں

کیسے کیسے کلاکار کے خواب انگڑائیاں لے رہے ہیں
ان کی محنت کے مستول سے
سارے تعبیر کے پال باندھے گئے ہیں

نوعمر نسوانی آواز:

محوِ پیکار ہے آدمی
ایک روحِ ثباتِ دو عالم ہے
مگر علم و دانش کی بخیہ گری آدمی ہی کے ناخن سے لرزاں رہی ہے
مدّعا کیا ہے اس کا
جہاں سوز صدیوں سے اس کے قدم ڈگمگاتے نہیں
یہ لپکتا ہے
تاریکیوں کے ان اہرام میں بار پاتا ہے
آج بھی جن میں صدیوں کے بے خواب سنّاٹے اپنی آہٹ
بھی پاتے نہیں

نوعمر مرد کی آواز:

مگر آج بھی اس زمیں پہ ہیں دانائے راز
ایسے انجینئر ایسے معمار جو دیکھتے ہی رہے ہیں
ہر رگِ سنگ میں ایک رقصِ بتاں

تخمِ خوابیدہ میں گلستاں
بنجروں میں لپٹتی ہوئی ایک ناآفریدہ بہار
ایک فصل
اک جفاکوشیِ ابنِ آدم
اور جواں سال مٹّی کا وصل
رنگ رس پھول پھل آرمیدہ بہار
تنگ داماں خزاں
ایک بیداری و خواب کے درمیاں اک حریفِ اجل زندگی کی حسینہ
کا اک رقصِ بے ساز و آہنگ جاری رہا ہے
فضاؤں پہ اک نشہ طاری رہا ہے

نوعمر نسوانی آواز:

فضاؤں پہ اک نشہ طاری رہا ہے
اک حریفِ اجل زندگی کی حسینہ کا اک رقصِ بے ساز و آہنگ
جاری رہا ہے
یہ حریفِ اجل زندگی کس طرف ہے
مرے سامنے تو ہر اک شہر ہر قریۂ نیم جاں ایک اندھی سیہ کوکھ ہے
جس کی تاریخ مدقوق اطفال کی سرد سانسوں پہ لرزاں ہے
رات کی تیرگی میں ابھی شہر کا شہر ہی ایک زخمی سپاہی کے مانند

خوابوں میں نادیدہ دشمن پہ یلغار کرتا ہے
اپنے خوابِ پریشاں کی تعمیر میں آپ اپنے ہی پہ وار کرتا ہے

نو عمر مرد کی آواز:

یہ اداسی جو دل میں ہے دُکھتا ہوا گھاؤ ہے
شہر اندھی سیہ کوکھ ہرگز نہیں
یہ تو آغوشِ مادر ہے
سیکڑوں آرزوؤں کا اک پالنا ہے
دور پھیلی ہوئی روشنی میں اسی شہر کے خاک آلودہ جسمِ حسیں میں
نیلی نیلی رگوں کے یہ بکھرے ہوئے جال سے
ٹرام کی پٹریاں ریل کی پٹریاں
تیز نبضیں دھڑکتی ہوئی
راہ کے موڑ پر قینچیوں کے بدلنے میں اکثر انھیں پیکروں میں
کسی نازنیں کی کمر کا سبک خم
نگاہوں میں لَو دے اٹھا ہے
عہدِ حاضر سے مایوس ہو
مگر اس صدی کے ہزاروں چراغ
آسماں کے ستاروں پہ ہنستے رہے ہیں
اس صدی کے ہزاروں دماغ

تابِ دُر لے کے خود ابرِ نیساں کے مانند
زمیں کے صدف پر برستے رہے ہیں
کتنے در اس کی دستک سے کھلتے رہے ہیں
اس صدی کے ستونوں پہ ہیں آئن اسٹائن، ردرفورڈ، کیوری
کے بت
فرائڈ اور فلیمنگ کی پرچھائیاں
محرمانِ جہاں
مشعلیں لے کے تاریکیوں میں کھڑے ہیں
اسی کارگاہِ الم میں
آدمی نے
وقت پر اس صدی کی انگوٹھی میں کیا کیا نگینے جڑے ہیں

نوعمر نسوانی آواز:

مگر ان نگینوں کی ضو آدمی کے لیے نور کا کوئی پیغام بن نہ سکی
حسن برباد ہوتا رہا
عشق برباد ہوتا رہا
علم برباد ہوتا رہا
زندگانی کے ان لق و دق ریگ زاروں میں اک چشمۂ آب کی
طرح ہر شے تصرّف میں بدّو امیروں کے ہے

کتنے سیّاح کتنے مسافر
راہ کو تختۂ گل بناتا رہا جن کے تلووں کا بہتا لہو
تشنہ لب رہ گئے
ان نگینوں کی لو وقت کی ظلمتوں کی کہاں تاب لائے گی

نوعمر مرد کی آواز:

وقت کی ظلمتوں میں حریفانہ بھی مسکراتی رہی زندگی
ہر تبسّم میں سو راز تھے
آئن اسٹائن کے وجدان سے اک گرہ راز کی کھل گئی
فصل و ساعت کے محور پہ تھا محوِ گردش ابھی زندگانی کا اک خواب
اور اس کی تعبیرِ خواب
خطِ فاصل کی پابند تھی زندگی
رفتہ رفتہ مگر اک تغیّر کا امکاں اسی دیدہ ور کو ہوا
اور اس دیدہ ور نے بتایا کہ بے حد و بے خطِ فاصل ہے یہ زندگی
یہ مکاں پا بہ گل خود نہیں ہے
وقت اک گوشۂ دامنِ زندگی ہے
گھٹتے بڑھتے ہوئے فاصلوں کی نگاہوں میں پرچھائیاں وقت
کی قید سے دور ایک اپنے تسلسل کی نبضِ رواں ہے
منزلیں خود ہی محوِ سفر ہیں

کارواں ایک رفتار کا زاویہ ہے
راہ کی گرد اک فاصلے کے تصور کا پیمانہ بن کر
اک طوافِ مسلسل میں خود ڈھونڈ لیتی ہے خود کو
یہ ازل اور ابد کی امیں زندگی
دوش و فردا میں
معلول و علّت میں
جامۂ بے حسی اور ملبوسِ سرعت میں
تخریبِ ساماں ہے اور بزم آرا ہے
خود ہی منزل ہے خود کارواں خود ہی بانگِ درا ہے
کوئی ظلمت اسے روک سکتی نہیں
کوئی طاقت اسے ٹوک سکتی نہیں
دورِ حاضر سے مایوس ہو تم
اور اسی دور کے ایک معمل میں دیکھی ردرفورڈ نے اور کیوری نے
اور فرمی نے
ذرّے ذرّے میں اک روحِ بیدار
پردہ نشیں لیلیِٰ سوگوار
آدمی کے لیے خاک بر سر ہے
کتنی صدیوں سے بے خط و خال اس کی پرچھائیں اوٹ سے
کوہساروں کی

روحِ آدم کو آواز دیتی رہی ہیں
تیرہ و تار عریاں سلگتے ہوئے خام ذرّات کے جامد و بے حواس
عرض میں قید
جوہروں کے سفینوں کو کھیتی رہی ہے
ذرّے ذرّے میں اک روحِ بیدار پردہ نشیں لیلیٰ سوگوار
روح ایٹم کی چھائی کبھی رات کا نشہ بن کر شبستان یونانیاں کے
چراغوں کی لَو میں
اور خیالوں کے وہ فاصلے آ گئے راہ میں
ہوگئی رفتہ رفتہ فراقِ دوام
اور کبھی یہ عرب کے بہت تیز جلتے ہوئے ریگ زاروں سے اٹھتے
سرابوں کے مانند
کسی کیمیاگر کی خاکِ زر افشاں میں لودے کے دشتِ تجسس کی
پنہائی میں ہوگئی ہے
جدائی کی شام
اک سلگتے ہوئے لمس کی
مگر منتظر تھی اسی خاک کے سرد سینے میں اک لمس کی
آج یہ لیلیٔ عشوہ گر چشمِ آدم سے خود چشمکیں کر رہی ہے
ہ ذرّے ذرّے کے آئینہ خانے میں چھپ کر سنورنے لگی ہے

نوعمر نسوانی آواز:

ذرّے ذرّے کے آئینہ خانے میں یہ زندگی محوِ حیرت ہے
موت ہے بے نقاب
زندگانی کا چھپ کر سنورنا ہے پیدا عتاب
میں نے اکثر زندگی کی بساطِ طرب خیز پر شمع اور پھول
بربط و جام دیکھے ہیں
مگر شمع گل ہوگئی
پھول مرجھا گئے
ساز پر دھول سی جم گئی ہے
جام ٹوٹے تو بس ہوگئے کاسہ ہائے سوال
دلہنوں کے سہاگ اور گھروں کی دمکتی ہوئی رونقیں سب اُجڑتی
رہی ہیں
برگ آور درخت سوکھ کر رہ گئے
خیر و برکت کے سارے خزانوں کو بس ریت کی اک پرت
ڈھانپ دیتی ہے
آئنہ خانہ ہے یہ زمیں
آئنہ خانہ بھی خوب ہے
اُف یہ نقش و نگار
جسم پر زخم —— چہروں پہ شکنیں

نوعمر مرد کی آواز:

قحط ہے خشک سالی ہے امراض ہیں
خیر یہ وجہِ غم زندگی پر اجل کی بڑی جیت ہے
موسموں کا تغیّر کچھ بدلتا ہی رہتا ہے عنوانِ ہستی
محوِ پیکار ہے آدمی
آدمی ہی نے صدیوں کی کاوش کے بعد
زخم کو ایک مرہم بنایا
ایک خفّاش کی طرح لٹکی ہوئی یہ زمیں تو مہ و مہر سے کھیل میں
محو ہے
اس زمیں کے اندھیرے میں گھر کر کہیں
ہار مانی بھی ہے آدمی نے
چشمِ آدم ہوئی وا
جہاں سے اشارہ کیا روشنی نے
سائنس دانوں نے ڈھونڈے ہیں سیارہ ہائے فلک سیر کے
داغِ دل آج
دور بینوں کی آنکھوں میں ہے
صد ہزار آفتابوں کا ایک خطِ نور
کیسے کیسے مکانوں کے نقشے مکینوں کی آنکھوں میں ہیں

سیکڑوں سال سے ایک رم خوردہ آتش قبا کائنات
ایک ژولیدہ سی زلفِ اعصار و آنات
آدمی کی نظر اس کے افکار اس کی خرد کی فسوں ساز مشّاطگی
سے سنورتی رہی ہے
قحط و امراض سے
خستگی سے جہالت سے اس دور کے مرد و زن مستقل جنگ
کرتے رہے ہیں
ان کی ایجاد
ان کے علوم
ان کا فن
نو بہ نو قافلے جستجو کے — گزرتے رہے ہیں
وقت کی لوح پر نقش در نقش اُبھرتے رہے ہیں
سائنس داں، ڈاکٹر
نقش گر، ماہرانِ نباتات، بینائے انجم
شاعر و مطرب و فلسفی
ہر نفس زیست کو پیار سے نرمیوں سے جگاتے رہے ہیں
اس زمانے کی باتیں سنو
ایجاد اک پنسلین کی ہی دیکھو
جسم کی کشتیاں تہ نشیں تھیں کبھی موت کی لہر میں

کتنے امراض کے نیلگوں زہر میں
کتنے زخموں کا سنگین درد اس سے ڈھلتا رہا ہے
کتنے امراض کا قفل توڑا ہے
زخم سے دردِ جاں دنچوڑا ہے
آخرش ان طبیبوں کی محنت، محبت کو دیکھو
یہ صدی کیمیاگر کے آلات کی چھاؤں میں
نلکیوں کے سبک صاف پردوں میں
آج بھی کتنی دوشیزہ اشیا کے اجسام کے مس سے بے تاب ہے
تم کہ اس دور کی اک نگہبان ہو
وقت کا بار ان ابروانِ خمیدہ پہ جمنے نہ دو
جنبشِ مژہ کے سامنے اس زمانے کو تھمنے نہ دو
آنکھ اوجھل کناروں کے دامن
سوئیاں سرد آلات کی بڑھ کے چھونے لگی ہیں
چشمِ بیدار کے سرخ ڈوروں میں بھی
ہر تغیّر سمو لو
اک تمھارے لبوں میں مہ و سال کی کتنی شادابیاں بس چکی ہیں
شوخ بوسوں کی اک فصل خوابیدہ ہے
ان لبوں پر تو پت جھڑ کا افسانہ آنے نہ دو
آنے والی سحر تو تمھارے ہی آنچل کے سایے میں آئے گی

آنے والی سحر میں
تمھاری ہی گودی میں دھرتی کے لال، آنے والی سحر کے امیں
آئیں گے

وقت کی گردشیں تیز ہیں
جنبشیں ابروؤں کی بھی رکنے نہ پائیں

سر بہ زانو ہے ہر سو ہدف
ناوک افگن جہاں کے کہیں اس طرح بھی
ہوئے ہیں اُداس
غم گساری کے آئیں نئے ہیں
زندگانی کے بھی رزم آرا کہیں
آستینیں الٹ کر ہوئے بدحواس
منزلِ مرگ پر جو ہنسے
اک اسی کی ہنسی زندگی کی جزا ہے
ربِّ آدم کی سوگند

روزِ اوّل سے یہ کارواں شوق کا اک تمھاری طرح ہی کی آوازِ پا
پر چلا ہے
(۱۹۵۰ء)

✡

ایک ہی شہر میں رہتے بستے کالے کوسوں دُور رہا
اس غم سے ہم اور بھی ہارے وہ بھی تو مجبور رہا

کال تھا اشکوں کا آنکھوں میں لیکن تیری یاد نہ پوچھ
کیا کیا موتی میں بھی فراہم کرنے پر مجبور رہا

وہ اور اتنا پریشاں خاطر ربطِ غیر کی بات نہیں
لیکن اس کے چپ رہنے سے دل کو وہم ضرور رہا

ہم ایسے ناکامِ وفا کے غول میں آکر بیٹھے ہو
دنیا کی تقدیر بدلنا جن کا اک دستور رہا

حسن کی شرطِ وفا جو ٹھہری تیشہ و سنگِ گراں کی بات
ہم ہوں یا فرہاد ہو آخر عاشق تو مزدور رہا

وقت کی بات ہے یاد آجانا لیکن اس کی بات نہ پوچھ
یوں تو لاکھوں باتیں نکلیں تیرا ہی مذکور رہا

اے میرے خورشیدِ شمی کیا، وہمِ طلوع و غروب تجھے
ایک تری گردش ایسی تھی خانۂ دل بے نور رہا

عشق بھی مُہر بہ لب گزرا ہے دنیا کی کیا جرأت تھی
اُس کی نیچی نظروں میں بھی ایسا سخت غرور رہا

ہم سے اس کا ربطِ جنوں تھا ایک ہنسی کی بات سی تھی
ہم کو آخر کیوں یہ خبطِ سعیِ نامشکور رہا

صبح سے چلتے چلتے آخر شام ہوئی آوارۂ دل
اب میں کس منزل میں پہنچا اب گھر کتنی دُور رہا

(۱۹۴۹ء)

کون کہے کدھر چلا یہ تو ندی کا ہے بہاؤ
وقت پہ کیا کسی کا بس دور رہو کہ پاس آؤ

نیتِ عاشقاں کی خیر ہم نفسو ہوا ہے تیز
ہم سے نہ جل سکے چراغ کوئی دیا تمھیں جلاؤ

قصّۂ دوستی نہ پوچھ قصّۂ دوستی میں ہیں
چبھتے ہوئے ہزار درد دُکھتے ہوئے ہزار گھاؤ

قید ہے موسموں کی بھی اور یہ قید بھی نہیں
خونِ دل و جگر سے ہے کشتِ وفا کا سب رچاؤ

گھر کی وہی زمین ہے دُور جو کردے خستگی
چھاؤں کسی درخت کی راہ میں ہو تو بیٹھ جاؤ

دشمن و دوست ہیں ہزار اے مری وسعتِ خیال
دل کا بُنا ہوا یہ جال نازک و نرم ہے لگاؤ

ڈھونڈ کے مرگِ ناگہاں وقت پہ آج آگئی
ہم بھی تھکے ہوئے تھے کچھ تھا بھی یہ آخری پڑاؤ

ایسی بھی ضد کی بات کیا وہ بھی تو آدمی ہی ہے
آؤ ہمیں نکل پڑیں سوچ میں کیا پڑے ہو آؤ

(۱۹۶۲ء)

بیٹھو جی کا بوجھ اُتاریں دونوں وقت یہیں ملتے ہیں
دُور دُور سے آنے والے رستے کہیں کہیں ملتے ہیں

وہم بھی ہو جاتا ہے دل کو لیکن اس میں تعجب کیا ہے
ایسے دشت کہ جن میں شمعیں آپ ہی آپ جلیں، ملتے ہیں

گہرے سرخ گلاب کا اندھا بلبل سانپ کو کیا دیکھے گا
پاس ہی اُگتی ناگ پھنی تھی سارے پھول وہیں ملتے ہیں

کان میں موتی ہاتھ میں کنگن پھول چنبیلی کا جُوڑے میں
کیا کیا رنگ جمانے والے آنکھیں جن سے بسیں، ملتے ہیں

تیرے جسم کی دھار کٹار سی آنکھ کے پردوں میں تڑپی تھی
خاکستر آنکھوں میں کیا کیا ان لمحوں کے نگیں ملتے ہیں

تم کو جھوٹا ٹھہرا سکتا کس میں اتنا جَس ہے لیکن
ایسے لوگ بہت ہوتے ہیں وعدہ کرکے نہیں ملتے ہیں

کہنہ سرائے کی روشنیوں نے کہہ ہی دیا دیوٹ کے دیوں سے
آؤ آؤ ٹھہرو ٹھہرو ، مہماں روز نہیں ملتے ہیں

سر کا سودا، پاؤر، کی گردش جو بھی سبب ہو نہ ملنے کا
تم تو صاحب کیا ملتے ہو ملتے ہیں تو ہمیں ملتے ہیں

(۱۹۶۸ء)

جی دارو، دوزخ کی ہوا میں کس کی محبّت جلتی ہے
تیز دہکتی آگ زمیں پر خندق خندق چلتی ہے

آسیبی سی شمعیں لے کر سیّاروں میں گھوم گئی
کوئی ہوا ایسی ہے کہ دنیا نیند میں اُٹھ کر چلتی ہے

کہساروں کی برف پگھل کر دریاؤں میں جا نکلی
کچھ تو پاسِ آبِ رواں کر نبضِ جنوں کیا چلتی ہے

رات کی رات ٹھہرنے والے وقتِ خوش کی بات سمجھ
صبح تو اک دروازۂ غم پر دنیا آنکھیں مَلتی ہے

خوش بو شہرِ بدی کا جادو ایک حدیثِ طلسم ہوئی
حوض میں کِھلتا گُلِ بکاوَلی خوش بو اس میں پلتی ہے

قندیلِ راہب کا جادہ آسیبی تاروں کے موڑ
کاٹ کے وقت کی اک پرچھائیں خواب نما سی چلتی ہے

شمس و قمر کی خاکستر میں روح تھی اک آرائش کی
دنیا بیچ میں جا کے کھڑی ہے اور لباس بدلتی ہے

خاکستر دل کی تھی آخر ملتی راکھ میں تاروں کی
آتشِ مہر سا جست سا کرتی بجھتے بجھتے جلتی ہے

مطربِ خوش آواز ہوئی ہے زخم آور آہنگِ بلا
وہ جو مرے حصّے کی لَے تھی، تیرے گلے میں ڈھلتی ہے

(۱۹۷۰ء)

مری آنکھیں گواہِ طلعتِ آتش ہوئیں جل کر
پہاڑوں پر چمکتی بجلیاں نکلیں اُدھر چل کر

زباں کا ذائقہ بگڑا ہوا ہے مے پلا ساقی
سمومِ دشت نے سب رکھ دیے کام و دہن تل کر

رموزِ زندگی سیکھے ہیں میرے شوقِ وحشت نے
کئی صاحب نظر زندانیوں کے بیچ میں پل کر

یہ کس ذوقِ نمو کو آج دُہرانے بہار آئی
لہو ہم سرفروشوں کا جبینِ ناز پر مل کر

وہ جن کی خُو سے کل اک ابرِ تر خوابِ محبّت تھا
انھی کو رکھ دیا پھر کیوں کُھلے ہاتھوں سے مَل دل کر

رُخِ دوراں پہ ہے اک نیل سا کربِ تغیّر سے
ورق تانبے کا کھو دیتا ہے رنگت آگ میں گل کر

ہری شمعیں سی انگوروں کی بیلوں میں جو چمکی تھیں
وہی اب سرخ رنگوں میں جلی ہیں جام میں ڈھل کر

وہی اک رُوئے آتش رنگ ہے ہلکی سی دستک ہے
سمندر پار کی موجِ ہوا جاتی نہیں ٹل کر

جب آئی ساعتِ بے تاب تیری بے لباسی کی
تو آئینے میں جتنے زاویے تھے رہ گئے جل کر

مہک میں زہر کی اک لہر بھی خوابیدہ رہتی ہے
ضدیں آپس میں ٹکراتی ہیں فرقِ مار و صندل کر

شبِ افسانہ خواں تو شہر کی آخر ہوئی مدّت
کہاں جاتے ہو تم نکلے ہوئے یوں نیند میں چل کر

(۱۹۷۳ء)

اس گفتگو سے یوں تو کوئی مدّعا نہیں
دل کے سوا حریف کوئی دوسرا نہیں

آنکھیں ترس گئیں تمھیں دیکھے ہوئے مگر
گھر قابلِ ضیافتِ مہماں رہا نہیں

ناقوس کوئی بحر کی تہ میں ہے نعرہ زن
ساحل کی یہ صدا تو کوئی ناخدا نہیں

مانا کہ زندگی میں ہے ضد کا بھی اک مقام
تم آدمی ہو، بات تو سن لو ، خدا نہیں

لطفِ سخن یہی تھا کہ خود تم بھی کچھ کہو
یہ وہم ہے کہ اب کوئی گوشِ وفا نہیں

میری وفا برائے وفا اتفاق تھی
میرے سوا کسی پہ یہ افسوں چلا نہیں

اس کی نظر تغیّرِ حالات پر گئی
کوئی مزاج دانِ محبّت ملا نہیں

(۱۹۷۷ء)

۞

زنجیرِ پا سے آہنِ شمشیر ہے طلب
شاید تری گلی میں نہ پہنچے یہ شور اب

آخر جھلک اٹھی وہ گریباں کے چاک سے
جس انتظارِ صبح میں گزری تھی میری شب

یاد آئی دل کو تیرے درِ نیم وا کی رات
رُکنے لگے قدم جو سرِ راہ بے سبب

یہ شانِ دلبری ہے کہ وہ جب بھی مل گیا
پایا مزاجِ دوست کو آسودۂ طرب

اس تازہ دم ہوا میں مرے ماہِ نیم ماہ
اس بام سے جدا نہ کبھی ہو طلوعِ شب

آنکھیں تو کھول دورِ تغیّر ہے ہم نشیں
کچھ کھڑکیاں تو کھول گئی ہے ہوائے شب

چلنے کو ہے ہوائے گل و لالہ کی جگہ
اک نقب سی لگاتی ہوئی صرصرِ عقب

آنکھوں پہ ایک جادوئے ظلمت سا چھا گیا
ہول آفریں ہیولوں کے جنبش میں آئے لب

کاذب صحافتوں کی بجھی راکھ کے تلے
جھلسا ہوا ملے گا ورق در ورق ادب

دنیا بدل گئی ہے حساب اور ہو گئے
رمزِ تغیّرِ رخِ عالم ہوئے ہیں سب

صدیوں میں جا کے بنتا ہے آخر مزاجِ دہر
مدّتی کوئی تغیّرِ عالم ہے بے سبب

(۱۹۷۸)

اے شہرِ خرد کی تازہ ہوا وحشت کا کوئی انعام چلے
کچھ حرفِ ملامت اور چلیں کچھ وردِ زباں دُشنام چلے

اک گرمیِ جستِ فراست ہے اک وحشتِ پائے محبت ہے
جس پاؤں کی طاقت جی میں ہو وہ ساتھ مرے دو گام چلے

ایسے غمِ طوفاں میں اکثر اک ضد کو اک ضد کاٹ گئی
شاید کہ نہنگ آثار ہوا کچھ اب کے حریفِ دام چلے

جو بات سکوتِ لب تک ہے اس سے نہ الجھ اے جذبۂ دل
کچھ عرضِ ہنر کی لاگ رہے کچھ میرے جنوں کا کام چلے

اے وادیِ غم یہ موجِ ہوا اک سازِ راہ سپاراں ہے
رُکتی ہوئی رَو خوابوں کی کوئی یا صبح چلے یا شام چلے

تجھ کو تو ہواؤں کی زد میں کچھ رات گئے تک جلنا ہے
اک ہم کہ ترے جلتے جلتے بستی سے چراغِ شام چلے

جو نقشِ کتابِ شاطر ہے اس چال سے آخر کیا چلیے
کھیلے تو ذرا دشوار چلے ہارے بھی تو کچھ دن نام چلے

کیا نام بتائیں ہم اس کا، ناموں کی بہت رسوائی ہے
کچھ اب کے بہارِ تازہ نفس اک دورِ وفا بے نام چلے

یہ آپ کہاں مدنی صاحب کچھ خیر تو ہے مے خانہ ہے
کیا کوئی کتابِ مے دیکھی دو ایک تو دورِ جام چلے

(۱۹۶۸ء)

✿

لکھی ہوئی جو تباہی ہے اس سے کیا جاتا
ہوا کے رُخ پہ مگر کچھ تو ناخدا جاتا

جو بات دل میں تھی اس سے نہیں کہی ہم نے
وفا کے نام سے وہ بھی فریب کھا جاتا

کشیدِ مے پہ ہے کیسا فساد حاکمِ شہر
تری گرہ سے ہے کیا بندۂ خدا جاتا

خدا کا شکر ہے تو نے بھی مان لی مری بات
رفو پرانے دکھوں پر نہیں کیا جاتا

مثالِ برق جو خوابِ جنوں میں چمکی تھی
اس آگہی کے تعاقب میں ہوں چلا جاتا

لباسِ تازہ کے خواہاں ہوئے ہیں ذرّہ و سنگ
اک آئنہ ہے کوئی دُور سے دکھا جاتا

عجب تماشۂ صحرا ہے چاکِ محمل پر
غبارِ قیس ہے پردہ کوئی گرا جاتا

جو آگ بجھ نہ سکے گی اسی کے دامن میں
ہر ایک شہر ہے ایجاد کا بسا جاتا

(۱۹۶۹ء)

حکایتِ حسنِ یار لکھنا ، حدیثِ مینا و جام کہنا
ابھی وہی کارِ عاشقاں ہے سکوتِ غم کو کلام کہنا

افق تغیر کی تیز لَو سے پگھل رہا ہے ، بدل رہا ہے
مگر اس احوالِ واقعی کو لکھیں نہ وہ میرے نام کہنا

ہزار ہاتھوں سے میں نے جس کو سنبھال رکھّا تھا زندگی میں
چراغ برکف بساطِ دل پر کھڑی ہوئی ہے وہ شام کہنا

اگر بتری آستینِ تر کو خبر نہیں داستانِ غم کی
زمانہ عنوانِ تازہ تر سے سنا گیا ناتمام کہنا

دُھویں میں اک طائرِ نوا گر نے آتشِ گُل پہ جان دے دی
رگِ گلو میں جلی ہوئی لَے چمک گئی زیرِ دام کہنا

ہم ایسے جادہ طرازِ صحرا نکل ہی آتے ہیں چند آخر
سخن کو اسلوبِ زندگی کا دیا ہے ہم نے ہی نام کہنا

کبھی کبھی تو لپک سا اٹھتا ہے برق و باراں کی چشمکوں میں
کسی ادائے وصال ساماں کا خنجرِ بے نیام کہنا

اُتر گیا دل میں زہرِ کاکل نثار اک سروِ دل ستاں کے
فسونِ چارہ گری سے گزرا محبتوں کا پیام کہنا

خیالِ یارانِ کُو بہ کُو سے نظر ہے اک ماتمِ نظارہ
دمِ حریفانِ بے سبو سے نفس ہے بے ننگ و نام کہنا

ابھی تو کچھ لوگ زندگی میں ہزار سایوں کا اک شجر ہیں
انھیں کے سایوں میں قافلے کچھ ٹھہر گئے بے قیام کہنا

خدا تجھے عافیت کی آبادیوں میں نورس سفیر رکھے
ادھر کے دیوار و در سلامت مری طرف سے سلام کہنا

(۱۹۶۷ء)

تازہ تر

سرودِ راہ سپاری یہ تازہ تر آہنگ
تجھے خبر ہے مری جاں کہ وادیِ غم میں
چھڑی ہوئی ہے نوائے گلو سے جس کی جنگ

خطِ نفس ہے حسابِ تغیّراتِ جہاں
شمارِ درد سے رُکنے لگی ہے جنبشِ دل
بدل کے شیشۂ ساعت ہوا ہے شیشۂ جاں

کسی تلاش میں ہے خود طوافِ ذرّات
اُفق پہ دُور تغیّر نے باندھ رکھی ہے
ہر ایک رُخ پہ کوئی رمزِ تازہ تر کی قنات

اُڑی ہے خاک سی ظلمت بہ کف مسافت میں
کبھی جھلک بھی اُٹھے حرفِ نیم رُخ لے کر
وہ آگہی کہ جو پنہاں ہے کارِ فطرت میں

(۱۹۷۳ء)

مارچ کی ہوا

مارچ کی تازہ سبک نرم ہوا کا رومال
گر رہا تھا کبھی پتّوں کبھی دیواروں پر
زلفِ شب رنگ کے پُر پیچ خنک تاروں پر
کشتۂ بوسہ و خوابیدۂ آئینِ وصال
ساعتیں ڈھونڈ کے اک نیند سے بوجھل پلکیں
یوں اُتر آئی تھیں خوابوں میں مثالِ زنگار
آپ ہی آپ جھلک اُٹھیں بہ رمزِ تکرار
زاویے جسم کے دیتے ہوئے خود اپنی مثال

ربط کے آئنۂ نو پہ جِلا ہو جائے
صیقلِ وقت سے اک بات ادا ہو جائے

(۱۹۸۳ء)

کمرہ

کمرے میں سکون رچ گیا تھا
آہستہ خرام ساعتیں تھیں
نیندوں کا اثر تھا قربتیں تھیں

چادر کی تہوں سے آپ چھنتا
اُس جسم کے زاویوں کی رَو میں
اک برگ سا روشنی کا بنتا
کشتی کی مثال موجِ خوں میں
پیراک ہوا رگِ جنوں میں

اک جرم کی آگہی سے سرشار
بے خوف تھی سایۂ شجر میں
اک جسم کی گرمیاں فسوں کار

(۱۹۸۳ء)

روحِ باراں

گریۂ ابر سے جاگ اٹھے بام و در
روئی دل میں ہوا نام لے کر کوئی
چند چھینٹوں سے مہکی گلِ رہ گزر

اوٹ میں باد و باراں کے ملنے لگے
نرم بھیگے ہوئے ہاتھ کے زاویے
دل کی دیوار پر پھول کھلنے لگے

نیند بنتی تھی ہمزادِ نسیاں گئی
نام لے کر کسی کا جگاتی ہوئی
بے نگہباں تھے در روحِ باراں گئی

(۱۹۸۰ء)

وقت کی قاش

اے وقت کی بے غبار گردش
کیوں خواب میں کر رہی ہے یورش

چہروں کے رنگ بست سے ہیں
ژولیدہ کاکلوں کے خم میں
لمحات جنوں پرست سے ہیں

کچھ نان و نمک کے سلسلے ہیں
ترتیب سے انتظام سارے
کچھ نُقل و گزک کے سلسلے ہیں

ڈھلتی ہوئی گرم ساعتوں میں
قلیہ و پلاؤ، قورمے کی
مہکیں ہیں دہن کی لذّتوں میں

کھانے کی میز پر پھلوں میں
انگور ہے، سیب اور لیچی
باتیں بھی چلی ہیں دل جلوں میں

بے وجہ ملول و بے سخن رام
لے کر اٹھا ہے سیر کی خو
کھانے کے بعد وہ دل آرام

واپس جو ہوئے تو ہے خموشی
باتیں ، بوسے ، وصال ، پیمان
اک لطفِ نظر ہے سادہ پوشی

نیندوں کی عجیب بے رِدائی
منزل سے یک دگر ہوئی ہے
اڑتی ہوئی خاکِ نارسائی

گردن میں پڑے ہوئے ہیں بازو
لمحوں سے ہیں ہم کنار لمحے
پیوست انجیر میں ہے چاقو

خوابوں کو تراش مل گئی ہے
اک وقت کی قاش مل گئی ہے

(۱۹۸۳ء)

ہیرے کا ورق

تقویم کا چاک جنتری بھی
تاریخوں کا ایک گھونسلا ہے
بستے ہیں دیو بھی پری بھی
سیّاروں کی گردشوں کے اثرات
ہر ساعتِ سعد و روحِ آفات

اے محوِ جلال نارِ مرّیخ
ہے برجِ حمل کے دائرے میں
پیدائشِ خوش خبر کی تاریخ

چالاک نظر ہے طبع درّاک
شعلے کی خار و خس ہے خوراک

کرتا ہے یہ وقت آپ تشکیل
امروز کے خانۂ اماں میں
ترتیب و دیر پائی تعجیل

نتھری ہوئی بوند کا اضافہ
ہے موجِ خوں میں مشکِ نافہ

ہے تیری جبیں پہ سایہ افگن
تاریخ و ساعتِ ولادت
اک خطِ رہ نوردیِ فن

یہ دن یہ ساعتیں مبارک
دنیا کی راحتیں مبارک

شمعوں کو بجھا کہ کیک کٹ جائے
اللہ کرے کہ وقتِ حائل
یہ تارِ عنکبوت ہٹ جائے

آئینے میں مل سکے رُخِ گل
خوابوں کے اُفق پہ آتشِ گل

یاقوت الماس اور زبرجد
اور موجۂ خوں کو تیری کردے
تریاق یہ خاتمِ زمرّد

آنکھیں ہوں تو زندگی سبق ہے
ہیرے کا کٹا ہوا ورق ہے

(۱۹۸۳ء)

عرض و جوہر

کھڑکی پہ رکا تھا چاند آ کر
دو شاخوں کے خم کے اندر اندر

مینڈھا کوئی غصہ ور تھا تانے
اک گرزِ گرانِ سیم کا سر

ٹیڑھی شاخیں مڑے ہوئے سینگ
حسّاس و حریف و حملہ آور

ہونے کو تھے پاش پاش شیشے
سینگوں پہ رکھا ہوا تھا بستر

جاگا تھا وہ سیم تن کہ پائی
اک نوکِ درشتِ سحرِ منظر

اور جسم کے مدّ و جزر میں تھا
اس چاند کی روشنی کا نشتر

خود بینی دلیل ہو گئی تھی
تکیوں کی اوٹ میں نگوں سر

اک لمحۂ صفر و مارِ دانا
اک گوش اور نطقِ خواب آور

وہ سایۂ شجر تھا آگہی کا
وہ رات ثمر تھی کشت پرور

سر بند ثمر کے ذائقے سے
گردش تھی لہو میں ناف محور

مینڈھے کا جو سر تھا گرز ساماں
پیکار طلب ، ہدف کا خوگر

پیڑو کے تھا زاویوں کی اک کاٹ
اک خطِ عمودِ جاں برابر

عصیاں بہ کنار خوئے عصمت
اک ابرِ سیاہ چتر سر پر

اک رخش کے سم کی ضرب سی تھی
بادل کے تصادموں کے اندر

اور بعد کی نیند عرض ساتھی
خود وقت کے کھل اُٹھے تھے جوہر

(۱۹۸۳ء)

دید کا آئینہ

اجنبی ملک کا ریسیپشن رُوم
صاف روشن کشادہ و شاداب
میز پر اک کلاک ، اک گل دان
سہ پہر کی وہ ساعتِ نایاب
روشنی چھن کے راز کے مانند
ہوگئی تھی سکوت کا پیوند

اک جہاں دیدہ نرم گو خاتون
ایک آرام دہ نشست پہ تھیں
پاسِ دیوار و در کچھ ایسا تھا
لاکھ آنکھیں سی سنگ و خشت میں تھیں

سلک کارِ جہاں میں جُڑتا ہوا
وقت آہستہ رَو تھا مڑتا ہوا

میں نے پوچھا کہ چند لمحوں کی
کیا ملاقات تم سے ممکن ہے
کام کا وقت تو یہ ہے بے شک
کیا کوئی بات تم سے ممکن ہے
پاس ہی مجھ کو کچھ بٹھا کے کہا
ٹیلی فون اس نے یوں اٹھا کے کہا

وہ ابھی آ کے تم سے ملتی ہیں
کیا اسی شہر سے تم آئے ہو
دور اُفتادہ ایشیا کے خواب
اپنی دریافتوں میں لائے ہو
اور تم اضطراب میں چل کر
آگئیں جیسے خواب میں چل کر

اک دُھواں یاد کا سا چہرے پر
برق کی رَو سی آشنائی کی

وقت کے زخم مندمل سے کچھ
اک پرت چھٹ رہی تھی کائی کی
ہم جو تازہ ہوا میں جا نکلے
رُخ بھی باتوں میں کیا سے کیا نکلے

نوٹ بک کھو گئی تھی کمرے میں
لیکن اُس کی تلاش تھی بے سود
شعلۂ دل تھا اور رُخِ روشن
ساری دنیا تھی ایک موجِ دُود
سر پہ لرزاں تھی وقت کی محراب
آنکھوں آنکھوں میں کتنے وصل کے خواب

سو بھی سکتے تھے ہم کہ منزلِ قرب
آدمیّت کا اک تقاضا ہے
خاکِ دل کی ہر ایک ذرّے میں
وصل و ہجراں کا اک تماشا ہے
چشمکیں صد ہزار کرتا ہوا
وقت کے ساتھ ہی گزرتا ہوا
مل کے اک کیفِ شادمانی تھا

خوش تھے آپس میں بات کرکے ہم
وہ جو اک رنگ تھا پسند تمھیں
آسمانی و خواب گوں مبہم
میں اسے ڈھونڈتا ہوا نکلا
اک جگہ رنگ آشنا نکلا

جا کے ڈوپانٹ کی دکاں میں مجھے
ایک اسکارف وہ نظر آیا
سرِ دُوری و قربِ خواب انگیز
ایک صبحِ ازل کا سا سایہ
اک گرہ بندِ زلف و رخ بے نام
ایک برگِ شجر ، رُخِ ایّام
دید کے آئنے میں گرداں سا
ایک چہرے کا عکس لرزاں سا

(۱۹۸۳ء)

گندمی

صندل کی مہک تھی تازگی تھی
اس جسم کے نیل میں دمکتی
اک رنگ کی لہر گندمی تھی
اک رمزِ سوال تھا غنودہ
آہنگِ وصال تھا غنودہ

شانوں کے اُفق دراز بازو
تھا قدِ دراز نے سنبھالا
نازک سا نہفتہ اک ترازو
آنکھوں میں تاب گفتگو کی
گرمی تھی حرفِ آرزو کی

بندش میں کھنچا ہوا کمر کی
ہرنی کی کمر کا دائرہ تھا
رقاص کبوتروں کے پر کی
جوبن میں تھی خانہ ساز محراب
اک حلقۂ آتشیں کے آداب

کولھوں کے قوس سے عیاں تھا
خوش وزن ڈھلا ہوا توازن
اک پردۂ آتشیں نہاں تھا
جاگا جو فسونِ ہم کناری
تھی تیز ہوا کی ضرب کاری

جھومر ہی جبیں کا لے گیا تھا
اک زخمِ لذتِ طرب بھی
اک تیز عقاب دے گیا تھا
اس موڑ پر جسمِ نازنیں میں
جاگی ہوئی روحِ آتشیں میں

اک خوئے ہمدمی کی رَو تھی
آشفتہ حجلۂ عروسی
آنکھوں میں جنوں کی ایک لَو تھی
کچھ تیر نظر کے آئے سے تھے
گردش میں ہزار سایے سے تھے

اب کیسی حکایتوں کی تمہید
ہے گرمیِ بطن میں فروزاں
اک سلسلہ شمع ہائے تولید
اک سایے میں خوش ہے اور آزاد
مصروف و محو اور آباد

سایہ سا پریدہ وہ ایرِ رنگ
تحفہ وہ نیو آرلینس کا
کانوں میں دمیدہ وہ ایرِ رنگ
کھلتا ہوا اضطراب میں پھول
اسپند و کبود خواب میں پھول

ہے وقت کی رہ گزر سے اب دُور
ریشم کا سیاہ نرم اسکارف
اک ردِّ بلا کہ خوف کافور
بہتی ہوئی یاد کا کنارہ
اک رمزِ جنوں کا ہے اشارہ

ہیبت کا ہے سدِّ باب کرتا
ہسپانوی کاٹ کا وہ پنکھا
عالم کو ہے ایک خواب کرتا
نم اس میں ہے ان ہتیلیوں کا
کاڑھی ہوئی سب پہیلیوں کا

ہے سلسلہ زندگی کا ادراک
اس مہ رخِ درد آشنا کا
فردا کا وعدۂ طرب ناک
دنیا تو ہمیشہ کچھ کہے گی
جو پیاس کہ قرض تھی رہے گی

(۱۹۸۴ء)

ہم سفر

انگوری آنکھوں میں رس تھا
آئندہ کی سوچ سے چہرہ
سارے بدن کی جاگ بنا تھا
لب پر جو الفاظ کی رَو تھی
اُن سے ایک حصار سا کھنچتا
خود بینی کی لاگ بنا تھا

گھر کی خیر، لگن پڑھنے کی
بیم و رِجا کی پرچھائیں تھی
علم کا شوق بھی جاگ اٹھا تھا
دُھن تھی کچھ آگے بڑھنے کی

نوخیزی تھی دلداری تھی
فکرِ معاش کی دشواری تھی

ضبط کے اندر لہک اٹھی تھی
عمرِ نو میں کشتِ وفا سی
گوش میں اک سرگوشی کرتی
گھوم رہی تھی موجِ ہوا سی

تیز ہوا الجھن کا سبب تھی
جسم کے پردۂ ساز میں پنہاں
زخمہ وری کی ایک طلب تھی
اک دن میں نے کچھ جو پوچھا
ہنس کر ایک حساب لگا کر
اس نے کہا کہ کل ہم باہر
جانے والے ہیں اور شاید
شاید دو اک ماہ میں لوٹیں
شاید کلرک بنوں میں آ کر

اس آواز نے کیسے کیسے
پیکر کاڑھے تمثیلوں کے
جیسے سارس رزق کی خاطر
چکر کاٹے کچھ جھیلوں کے
روز و شب تھے ثمر رسیدہ
زہرِ غم سے دھیرے دھیرے
زیست ہوئی تریاق چشیدہ

ہم رازوں میں نکتہ وری کا
خود کو امینِ راز بنا کر
گندم و جو کے فرق کی بحثیں
رنگ آیا اک سخن وری کا

برسوں بعد ملے ہم آکر
لاؤنج میں اک طیارگہ کے
ہم کہ مسافر تھے اک رہ کے
آخر پاس وہ آکر بیٹھی
زینتِ صد محفل کو آئی
نیند سی خوابوں کی کشتی میں

میں نے سیٹ جھکا کر اپنا
کوٹ کور کی خاطر ڈالا
اس کے سارے جسم میں ڈوبی
رمزِ وصال کی وہ تنہائی
جاگ کے اس کے چہرے پر تھا
وقتِ گزشتہ کا اک ہالا
(۱۹۸۳ء)

شاخِ مرجاں

خواب اندر خواب گردش میں رہا
تیرا چہرہ، تیرا آب اندام جسم
عقربِ ساعت سی لرزش میں رہا

ان تہوں میں بھی رہا گستاخ دست
غوطہ زن ہوکر غمِ دوراں بہت
تیرے پرتو نے نہیں کھائی شکست

ایک آبادی تھی جولاں زیرِ آب
مار و ماہی حلقہ زن ہوتے رہے
آئنہ ساماں رہے سب تیرے خواب

گردشوں میں آئے کتنے ماہ و سال
جزر و مد میں قلزمِ تاریک میں
پھول سا کھلتا ہے آئینِ وصال

شاخِ مرجاں تیرا جسمِ نازنیں
لہلہاتا ہے شبِ تاریک میں
خانۂ دل میں چراغِ آتشیں

(۱۹۸۳ء)

تغیّر

یہ جواں رات ہے سیّارہ نفس
چرخیاں گھوم رہی ہیں کیا کیا

پردۂ جاں میں ہے لرزاں آہنگ
حرف اک گردشِ چالاک میں ہے
داستاں مرگ و نمو کی کیا کیا
تازہ تر خود نفسِ خاک میں ہے

بطنِ مادر میں لہو کی گردش
لب و رخسار میں ڈھل جاتی ہے
اور اک بطنِ گراں کی زنجیر
آپ ہی آپ پگھل جاتی ہے

ماہیئت ذرّۂ بسمل کی ملی
کچھ مساواتِ نوی کی رَو میں
بال و پر تا بہ نظامِ شمسی
صفر در صفر ہیں رختِ نو میں

ہر تغیّر کے لبِ نورس کو
ساعتیں چوم رہی ہیں کیا کیا
یہ جواں رات ہے سیّارہ نفس
چرخیاں گھوم رہی ہیں کیا کیا

آخری رات

دلِ بے تاب کا عنوان بدل
آخری رات ہے اے نرم ہوا
تو مری نیند اڑاتے ہوئے چل

پوچھتی ہے یہ مری بے خوابی
وہ جو تقدیرِ سیاست تھا کبھی
کیا ہوا اب وہ غمِ بے تابی

میرے اندیشے خطائیں میری
موت کی نیند میں ڈھل جائیں گی
صبح تک ساری وفائیں میری

مژدہ اے کاتبِ تقدیرِ ازل
درِ زنداں پہ کھڑی ہے آ کر
شاخِ گل لے کے سیہ پوش اجل

سارقوں کی کشتیاں

یہ سمندر　　　یہ ہوا کا نم　　　یہ خوابیدہ فضا

روحِ قزاقانِ عالم کا ہے ساحل سے خطاب
سارقوں کی کشتیوں پہ تیرگی ہے اک نقاب

دور تک ان کے جہاز اور ان کے رُخ پر جھائیاں
جزر مد میں بیرق و قندیل کی پرچھائیاں
رہ گزارِ وقت پر ہیں حادثوں کی کھائیاں

رات کی دیوار وقتِ بے مروّت کا ہدف
دیو دیدہ چشمِ ساحل خوابِ وحشت کا ہدف

ایشیا کی سریلی تصویر

بانبیاں ہیں ناگنوں کی اس کی چشمِ نیم باز
گوش طوفانی ہواؤں کا نشیمن ایک راز

اس کے بالوں کی لٹوں میں کچھ بگولے تیز گام
بن چکے ہیں اک کھنڈر کی ناگزشتہ صبح و شام

کاسۂ دریوزہ گر اس کا لبِ غمّاز ہے
ہر سخن ٹوٹے ہوئے تاشے کی اک آواز ہے

اک طلوعِ شب اُفق پر کارگر ہوتی رہی
اور در و دیوار میں تاریکیاں بوتی رہی

اس کا بوسیدہ لبادہ اک بیاباں پُر جلال
جس کے سایوں سے نکل جاتے ہیں بچ کر ماہ و سال

اس کے زخموں کی مہک یوں رقص فرماتی رہی
صحتِ عالم کو ہر منزل پہ ٹھکراتی رہی

کش مکش

زندگی ، اقوام کی پیکار ، اک تقسیمِ زر
تاجرانہ ذوق کی زد میں ہے اک خلقِ خدا
قحط سے افلاس کا ویرانہ ہے ویرانہ تر

اک طرف ساکت کھڑی ہے آدمی کی بے پری
اک طرف ہے ظرفِ انسانی کی ایسی آبرو
منعکس ہے اک سلولائیڈ پہ رنگِ مشتری

بنجروں میں گامزن ہے اک طرف خود روحِ وصل
عہدِ نو بھی کچھ عجب بیم و رِجا کا دور ہے
اک طرف خود کیمیا ہے قاطعِ بنیادِ نسل

آدمی بربط نوازِ امنِ عالم ہے کہیں
اک پیالے میں سمو لیتا ہے یہ تریاق و زہر
غیر کیسا اپنے سایے سے بھی برہم ہے کہیں

نازکی ایسی کہ دل کا آئنہ ہے پاش پاش
خاک کے ذرّوں سے سیّاروں کی نیلی آگ تک
جستجو ایسی کہ وجہِ زندگی کی ہے تلاش

خواب ایسے بجلیاں جس طرح بادل میں کبھی
روح کے افلاس سے پامال ہو کر آدمی
گوہرِ نایاب کھو دیتا ہے دلدل میں کبھی

آئن سٹائن کی صدی ، ذرّاتِ نو ترتیب کی
مہر میں اک خوابِ گُل اک طائرِ ابرِ بہار
قہر میں خود یہ صدی ہے شعلۂ تادیب کی

(۱۹۷۹ء)

حرف و آگہی

اے برادر اے مرے قاری یہ خوابیدہ ورق
محرمِ روحِ تغیّر ، پردہ دارِ عشق ہے
خار در دل ہے سزائے آگہی کا اک سبق

جزر و مدِ شوق میں قصّے دلِ بے تاب کے
ریزۂ مینائے جاں ہیں چند ٹکڑے خواب کے

حرفِ تازہ بھی رخِ لیلیٰ کے آئینوں میں ہے
آہوؤں کا رم ، بگولوں کے وہی آداب ہیں
وحشتِ مجنوں بھی ان الفاظ کے سینوں میں ہے

رشتۂ مہر و وفا کے ٹوٹتے حلقے بھی ہیں
روحِ ہجراں بھی ہے دل کے زخم کچھ گہرے بھی ہیں

داستانِ زندگی سرنامۂ فرہاد ہے
خوابِ شیریں ہے کہ دنیا کارگاہِ شوق ہے
بے ستوں ہی پر جہانِ شوق کی بنیاد ہے

فاصلوں کے غم ، دلوں کی قربتیں خوابیدہ ہیں
شیشہ و سنگِ گراں کی نسبتیں خوابیدہ ہیں

سایۂ گرمِ رقیباں سے ہے سینہ داغ داغ☆[1]
نوکِ خنجر توڑ دیتا ہے دلِ صد چاک میں
زندگانی کے سیہ خانے میں عشقِ بے چراغ

ڈھانپتی ہے موجِ خوں اپنے ہی اک ملبوس میں
عصمتِ حرفِ وفا کو شیشۂ ناموس میں

نیک و بد کی سرحدوں میں نقدِ جاں کھوتا ہوا☆[2]
سلطنت کو کفشِ پا سمجھے ہوئے بے خوابِ عشق
بے گنہ آفیلیا کی لاش پر روتا ہوا

☆۱۔ اوتھیلو ☆۲۔ ہیملیٹ

دیکھتا ہے اک تحیّر خیز طور الفاظ کا
سلسلہ الفاظ اور الفاظ اور الفاظ کا

مدّعا پا کر بھی کھونے کی ہے تنہا آگہی
اے برادر اے مرے ہم راز قاری کچھ نہ پوچھ
حرف ہونے یا نہ ہونے کی ہے تنہا آگہی

(۱۹۸۰ء)

اے تماشائیانِ بزمِ سخن

"اے تماشائیانِ بزمِ سخن
وے مسیحا دمانِ نادرِ فن
اے گراں مائگانِ عالمِ حرف
خوش نشینانِ ایں بساطِ شگرف"
اے سخن پرورانِ خوابِ نوی
نو خرامانِ راہِ تازہ روی
اے کراچی کی بزمِ تازہ کلام
شمع ہائے بیاں کا کوئی پیام
جانِ معنی ہوائے لاہوری
اے عروسِ فضائے لاہوری
دہلوی، لکھنوی و ملتانی
اُتری، دکنی و لاثانی
بات کا رُخ ہزار داماں ہے
آدمی کس قدر ہراساں ہے

شہر ہے زیرِ دام فریادی
محوِ شیون ہے ایک آبادی
تنگنائے ورق ہے زہر آمیز
اک رقابت کی کارگاہِ ستیز
زندگی حبسِ جاں سے ہے دشوار
چہرۂ مستعار کا بازار
زیرِ دیوار گرگِ عیّاری
مخبری ، بے رُخی ، نگہ داری
گرد ہے آئنوں کی اک پیوند
ہر تبسّم صلیب کے مانند
دوستی دشمنی کا ایک معاش
آدمی اپنے ننگ و نام کی لاش
اُٹھ رہا ہے دُھواں سا رد و کبود
آگ گم ، زندگی ہے موجِ دُود
حرفِ تازہ خیال ہے مجروح
اک یہودی کی قرض خواہ ہے روح
کچھ عجب ظلمتِ بیاباں ہے
زہر آمیز آبِ حیواں ہے

۞

روحِ عصر

ڈھیر بکھری لٹوں کا شانے پر
اک کمندِ جنوں زمانے پر

پُرفسوں چشمِ نیم باز اس کی
آرزو ، پردہ دارِ راز اس کی

بھولی بسری حکایتوں کی حریف
کِرم خوردہ روایتوں کی حریف

شعلۂ مے کہ آبگینے — میں
درد اٹھتا ہوا سا سینے میں

یہ کہ محوِ سرود رقص و رم
سرکشی کا کھلا ہوا پرچم

کاوشِ بے کراں سے مست مدام
آپ اپنا یہ گوشۂ آرام

اس کو سیلی فضا میں ڈس نہ سکیں
ظلمتیں گھر میں اس کے بس نہ سکیں

اس کی آغوش میں عروج و زوال
سیکڑوں نقش ہائے بے اشکال

خوب و ناخوب و ظلمت و انوار
مرہم و زخم و ثابت و سیّار

اک کفِ پا میں سیکڑوں گرداب
اور ہمکتے سمندروں کا شباب

اس کے اٹھتے شباب کا عالم
آمدِ آفتاب، کا عالم

آنکھ میں سحرِ بے مثال لیے
ایک افسانۂ وصال لیے

اس کی آہٹ سے ہیں دلِ ذرّات
محرمِ صد رموزِ مرگ و حیات

ہجر کی رات کٹ چکی کب کی
خستگی دل کی چھٹ چکی کب کی

کب سے سفّاک گردشِ آفاق
کہہ رہی تھی حدیثِ مرگ و فراق

زندگانی تھی ایک دُکھتا گھاؤ
اور خاموش درد کا اک الاؤ

غیریت کی ہوائیں چلتی تھیں
ظلمتیں کروٹیں بدلتی تھیں

روتی آنکھیں ، تھے ڈوبتے تارے
وقت کے منتشر سے انگارے

سرد ذرّات کی تھی بیداری
مسلکِ تیرگی کی زُنّاری

یہ فضا میّتِ سوال اٹھائے
کب سے تھی گردِ ماہ و سال اٹھائے

پے بہ پے تھی ہلاکتِ آدم
ایک پت جھڑ کا چار سو موسم

ایک عالم پہ موت کا سا سکوت
علم و عرفاں کے صف بہ صف تابوت

ہڈیوں کے غبار اُڑتے تھے
کِرّہ و چوب و دار اُڑتے تھے

روز و شب کے تھے تار تار کفن
اور زمین و زماں کا سُونا پن

لاکھ زنداں ہزار دامِ حصول
خشک و تر پر اداسیوں کا نزول

کروٹیں لے رہی تھیں چیخوں میں
خندقوں میں خموش تاریخیں

شر تھا اور شرِ بے پناہ مدام
سر نگوں خیر کی سپاہ مدام

موجِ انوارِ نیم مردہ کو
روح کی آتشِ فسردہ کو

ڈس رہی تھی مہیب تنہائی
تھی دلوں میں عجیب تنہائی

روحِ عصرِ رواں ترا یہ ظہور
اک اندھیرے افق پہ صبح کا نور

تیری آمد فروغِ صبحِ حیات
حاصلِ گرمیِ دمِ آنات

دی صدا تجھ کو سرِّ عالم نے
ارتقا کی حیاتِ پُر دم نے

گر کے کچھ زندگی سنبھلتی ہوئی
ہر نفس نقشِ نو میں ڈھلتی ہوئی

آتش و آب و باد و خاک کی صف
اور یہ آبگوں فضا کا صدف

مادّے کی یہ جوت محوِ تلاش
سیکڑوں سر بہ مُہر راز ہیں فاش

ذرّے ذرّے میں کاوشِ تعمیر
اور نہفتہ جہان کی تقدیر

کب سے تجھ کو پکارتی ہی رہی
زلف اپنی سنوارتی ہی رہی

اے کہ تُو ذی نفس شعورِ حیات
تجھ سے تابندہ نزد دورِ حیات

یہ زمیں تیری بزمِ ناز ہے آج
کاوشِ غم بھی کارساز ہے آج

یہ تری مملکت ترا دربار
یہ مشینیں یہ گیس یہ اوزار

کشت و خرمن نخیل و جوئے رواں
گرمی و خونِ بازوئے دہقاں

گھومتی تکلیاں سلگتے تنور
گیت گاتے ہوئے جواں مزدور

سائنس کے خواب ناک گپت بھون
آتشِ نو کے جگمگاتے لگن

پٹریاں ریل کی، ملوں کے چاک
زر ہے جن کے قدم سے شہر کی خاک

صنعتوں سے بسے ہوئے مہ و سال
مشک سے پُر ہے جیسے نافِ غزال

کاروانِ بہار کی تیزی
ایٹمی طاقتوں کی زرخیزی

آسماں آ رہا ہے سوئے زمیں
اک نگینہ ہے آج رُوئے زمیں

کیوں اٹھے اس کی تشنگی کا سوال
آبِ حیواں ہے آدمی پہ حلال

یہ زمیں کے بدن کی جوت ، یہ آگ
سر سے پا تک رچا ہوا اک راگ

یہ صنم خانۂ مہ و پرویں!
یہ گھٹاؤں کے گیسوئے مشکیں

ساز و دف ساقی و سبو کا خیال
گنبد و طاق و کاخ و کو کا خیال

تیرے دم سے ترے قیام سے ہے
سب عبارت یہ تیرے نام سے ہے

وقت

وقت اے طائرِ بزرگ و عظیم
رُو بہ دشتِ جدید و آبِ قدیم
سب ترے بال و پر میں ہیں اشکال
دورِ مرگ و نمو و خواب و خیال
نیم پیدا سے ممکنات کی رَو
کارِ عالم تغیّرات کی رَو
منزل و رہ سپار و بانگِ رحیل
ایک گرداں مکاں کی قندیل
تجھ سے لذّت کشِ تغیّر ہے
ہر تلوّن سے زندگی پُر ہے
نبض تو کارِ باد و باراں کی
برف میں روح ہے زمستاں کی

تو ہی آغوش و دولتِ آغوش
حسن کی عشوہ گر شبِ خاموش
تجھ میں صدیوں کے اضطراب کی آگ
وحدتِ زندگی کی تجھ سے لاگ
آسمانوں کے ٹوٹتے تارے
سب ہیں تیرے پروں کے انگارے
تو ہی بیدار ساعتِ آباد
تو ہی اک مرگ و خرمنِ برباد
سایۂ اہرمن ، غمِ یزداں
خونِ آدم میں اس طرح غلطاں
کتنے اشکال تو بدلتا رہا
مےِ صافی کی طرح ڈھلتا رہا
زندگی تیری ، گردشِ پرکار
کھنچ گیا ایک حلقۂ بیدار
تجھ سے وہ حدِ زندگی آئی
جس کی روحِ زمیں تھی سودائی
کچھ عناصر میں شمع جلنے لگی
نبضِ جرثوم و آب چلنے لگی
ظلمتِ آب و گِل کے کُل راہی
تجھ میں پنہاں تھے کژدم و ماہی

کاروانِ نمود کی وہ برات
دیو قامت مہیب حیوانات
نقش ذرّاتِ نو میں ڈھلتے ہوئے
رُخ نباتات کے مچلتے ہوئے
تجھ میں پنہاں ہزار رنگ ہوئے
کانِ گوہر کا عرض سنگ ہوئے
ڈھونڈتا ارتقا کا اک پیکر
تا بہ آدم گیا ترا جوہر
روح تجھ سے ہے جسم تجھ سے ہے
زندگی کا طلسم تجھ سے ہے
تجھ سے پیدا ہر ایک چشمِ تلاش
ماہ و انجم میں تو ہی جادہ تراش

رُوپ دکھ سکھ کا اور درپن تُو
سینۂ آدمی کا روزن تُو
تجھ سے دورِ خزاں نمو تلفی
مرگِ اشجار و داغ بے کلفی
منتظر تیرے دل کے دُکھتے گھاؤ
مرہم و کیمیا ، سبھی کا بناؤ

شعلۂ آگہی درونِ خاک
ہر نفس جست و خیز میں چالاک
تو سراجِ منیر و طبعِ جہاں
کہنہ سامانیوں میں نبضِ جواں
تجھ میں فردا و دوش کے ہیں خطوط
روحِ آدم کا راز اس کا ہبوط
تو تغیّر کی موج ہے شک ہے
ذوقِ پیدائی تجھ میں اَن تھک ہے
خواب و تعبیرِ خواب سب تجھ میں
حسرت و اضطراب سب تجھ میں
آگ چقماق روشنی ، ضو ہے
ذہنِ انساں میں فکر کی رَو ہے
تُو ہی رفتارِ روشنی میں خرام
تُو ہی ساکت مثالِ سنگ تمام
روحِ دریافت بیشۂ اوصاف
نقطہ و خط و محور و اطراف
تُو فنا تُو قیام تُو تاخیر
تُو ہی لوح و قلم تُو ہی تقدیر
بے کراں تجھ سے تشنہ کامی ہے
زندگی صیدِ ناتمامی ہے

(۱۹۸۱ء)

عشق کی اک بحث ردِّ ما و تُو تک آئی ہے
ہم کناری کی شبِ نو گفتگو تک آئی ہے

تجھ سے مل کر مدّتوں کے بعد دل ہے شاد کام
دل کی تنہائی دلیلِ آرزو تک آئی ہے

نیم وا آنکھوں میں پا کر اک سوالِ زندگی
عشق کی جرأت جوابِ رُو بہ رُو تک آئی ہے

بدگماں موجِ ہوا سے ہوں جو دستک دے گئی
کیا تلاشِ شہر میرے سادہ رُو تک آئی ہے

کل جو جزر و مد میں غلطاں تھی بہ ہنگامِ وصال
اب وہ موجِ ساعتِ رفتہ لہو تک آئی ہے

نیند میں اک رو جو تھی اس کے گدازِ جسم میں
بوسۂ لب سے کسی خوابِ نمو تک آئی ہے

اس سے آگے کیا کہیں ہم رمزِ آئینِ وصال
آخرِ شب محرمانہ گفتگو تک آئی ہے

کیا تصوّر حسن کا رکھتی تھی یارب وہ دُعا
جو لباسِ خال و خطِّ مشک بُو تک آئی ہے

ہم نے بھی دیکھی ہے تازہ کاریِ افسونِ حسن
چاکِ دل سے جو گریباں کے رفو تک آئی ہے

یعنی زندانِ وطن میں حدِّ آزادی ہے کیا
پھر کوئی زنجیرِ پا اس جستجو تک آئی ہے

وہ ہوا مدّنی جسے کہتے تھے جانِ مے کدہ
کیا رقیبانہ حریفانِ سبو تک آئی ہے

(۱۹۷۷ء)

✡

آج مقابلہ ہے سخت میرِ سپاہ کے لیے
ہوگئے سر کئی قلم ایک کُلاہ کے لیے

تازہ رخیِ کائنات ڈھونڈ رہی ہے آئنہ
جستجوئے ہزار میں ایک گواہ کے لیے

کُھل ہی گیا طلسمِ دوست عینِ وصال میں کہ تھی
اک شبِ ہجر زندگی لذتِ آہ کے لیے

• صورتِ گردِ کارواں ہے غمِ منزلِ جہاں
خوابِ جنونِ تازہ کار چاہیے راہ کے لیے

آتشِ کیمیا گراں کام نہ آ سکی کوئی
سرمہ ہے خاکِ دل مری چشمِ سیاہ کے لیے

اک شبِ خود نمائی میں عصمتِ بے مقام نے
کتنے سوال کر لیے رمزِ گناہ کے لیے

تیرے وصال نے طلب، میری خود آگہی بھی کی
ہجرِ ہزار شب کے بعد ایک نگاہ کے لیے

(۱۹۷۷ء)

کچھ تو کُھلے یہ درد سا کیا ہے جگر کے پاس
مجھ کو بھی لے چلو کسی صاحب نظر کے پاس

اے روحِ دشت قرب کا اتنا بھی پاس کیا
پہنچے ہمارے ساتھ بگولے بھی گھر کے پاس

دامن جلا کے آئی ہوا ساکنانِ شہر
کیسی یہ آنچ سی ہے جہانِ خبر کے پاس

رہبر بنی تھی پیاس میں پروازِ طائراں
اُترے تلاشِ آب میں ویرانہ تر کے پاس

ساری یہ پیچ و تاب تھی آمد بہار کی
لائی ، ہوا کی موج جو زنجیرِ سر کے پاس

یہ فرق ہے سرشت کا فیاض موجِ بحر
دستِ بخیل بن کے نہ پہنچی گہر کے پاس

تدبیرِ چارہ گر سے فزوں تر ہے درد آج
اب دو قدم اجل ہے دھواں ہے نظر کے پاس

تاریخِ یادگارِ جنوں ہو کے رہ گیا
اک تیرے خال و خط کا مرقّع نظر کے پاس

مدنیؔ وصالِ دوست کی قیمت نہ ہو سکی
باقی لہو کی بوند جو تھی چشمِ تر کے پاس

(۱۹۸۰ء)

جنوں زباں ہے محبّت خطاب کس سے کرے
بیاں کرے بھی تو تعبیرِ خواب کس سے کرے

خرابِ ماہ کتاں سینہ چاکِ گُل بلبل
یہ بات جان کے انساں حساب کس سے کرے

وہ اک حدیثِ نظر جو طلسمِ صحرا تھی
بیاں کرے بھی تو موجِ سراب کس سے کرے

زمینِ گرم اِدھر ، خنجرِ کشیدہ اُدھر
نمازِ عشق میں سر اجتناب کس سے کرے

نمود یہ تھی تو کس کام کی تھی سطوتِ موج
شکایتِ رمِ دریا حباب کس سے کرے

عجیب رنگ میں تھا عشقِ بے گلو کا سپاس
وفا کی رات کا اب انتساب کس سے کرے

فقیہِ شہر کی باتوں سے چپ ہوا مدنیؔ
تمھیں بتاؤ، سوال و جواب کس سے کرے

(۱۹۸۰ء)

✡

گل کا وہ رخ بہار کے آغاز سے اٹھا
شعلہ سا عندلیب کی آواز سے اٹھا

نو دست زخمہ ور نے مٹا دی حدِ کمال
پردے جلے تمام دھواں ساز سے اٹھا

جیسے دعائے نیم شبی کا سرود ہو
اک شور مے کدے میں اس انداز سے اٹھا

محضر لیے جنوں میں سوال و جواب کا
پردہ سا ایک دیدۂ غماز سے اٹھا

باقی ابھی ہے تنگی و وسعت میں ایک فرق
اس کو بھی جنبشِ لبِ اعجاز سے اٹھا

عصیاں سرشت و پاکیِ داماں کی اک دلیل
کیا لطف حسنِ تفرقہ پرداز سے اٹھا

وہ شخص تھا مرقّعِ مانی کی ایک ضد
رنگِ ہزار حسنِ جنوں ساز سے اٹھا

کانٹے زمیں سے اور زیادہ ہوئے طلوع
اک مسئلہ بہار کے آغاز سے اٹھا

بنتی متاعِ کشف تو کیا آئنے کی چھوٹ
لذّت ہی کچھ اشارۂ ہم راز سے اٹھا

یارب تُو لاج رکھ مرے شوقِ فضول کی
دنیا ہے نیند میں — مری آواز سے اٹھا

اک منظرِ کنارۂ بام اور دے گیا
پرتو سا کوئی اس کے درِ باز سے اٹھا

میں کیا کہ میرے بعد بھی جو لوگ واں گئے
کوئی نہ اس کی انجمنِ ناز سے اٹھا

مدنیؔ قفس میں صبح ہوئی اور اس کے بعد
دل سے دھواں بھی حسرتِ پرواز سے اٹھا

(۱۹۸۰ء)

کوئی گمانِ تغیّر ضرور تھا پہلے
ہوائے تازہ میں کیا کیا سرور تھا پہلے

خزاں میں بیٹھ گئی لے کے مجھ کو وحشتِ دل
بہار تھی تو جنوں پر عبور تھا پہلے

بتا گئی یہ مجھے ایک تیری لذّتِ قرب
تمام وقفۂ جاں بے حضور تھا پہلے

ہزار ہاتھوں سے تجھ کو سنبھالتا تھا جنوں
ترا وہ حال دلِ ناصبور تھا پہلے

خبر نہیں ترا ادراکِ ہم کناری بھی
وفا تھی یا غمِ جاں کا شعور تھا پہلے

گلہ ہے ایک تلوّن مزاج انساں کا
کوئی پری نہ کوئی رشکِ حور تھا پہلے

تجھے اشارۂ غیبی ہوا ہے خوابِ وصال
یہ آئنہ تری خلوت سے دُور تھا پہلے

ملا تو محوِ ندامت تھا وہ دمِ رخصت
شبِ وفا تھی تو کیا کیا غرور تھا پہلے

ہر ایک ذرّۂ خاکی میں انتظام آثار
قدیم اک نفسِ ذی شعور تھا پہلے

ہوائے نرم یہ گوشِ وفا میں کہتی ہے
وہ کون ہے جو ترے دل سے دُور تھا پہلے

بجھا کے مشعلِ دل بیٹھ کیوں گئے یارو
یہ ترکِ عشق بھی کس کا قصور تھا پہلے

(۱۹۸۱ء)

تجھے اے دل نہ جانے کب سے سودائے تغیّر ہے
نظر مجروح ہے اور اک تماشائے تغیّر ہے

رمِ سیّارگاں سے شعلۂ خورشید کی رو تک
ہزاروں دائروں میں جنبشِ پائے تغیّر ہے

رمِ ذرّات کی جویا ہے روحِ آتشیں کوئی
کوئی ترتیبِ نو سے کار فرمائے تغیّر ہے

بدلتی جا رہی ہے رسم و راہِ دلبری کیا کیا
سرشتِ حسن کیا ہے محفل آرائے تغیّر ہے

یہ دنیا اضطرابِ عشق کو زنجیر کیا کرتی
وہ روحِ عصر خود ہے چشمِ بینائے تغیّر ہے

مجالِ نکتہ چیں تھی عشق پر یوں خندہ زن رہنا
جنوں کی چاک دامانی بھی رسوائے تغیّر ہے

تجھے بھی ساحلِ خوابیدہ کچھ اس کی خبر ہوگی
سمندر کی ہوا میں ایک غوغائے تغیّر ہے

(۱۹۸۲ء)

✲

بادہ فروش کی دُکاں نام تھا جس دیار کا
رنجِ سبو اُٹھا گئی سلسلہ وہ خمار کا

اک درِ نیم باز تک ساتھ ہوا کے ہو لیا
وحشتِ دشت کی خبر لے کے قدم غبار کا

خود تری بے رُخی کی رات توڑ گئی ہزار بار
عشق پہ جو گراں نہ تھا طوق وہ اعتبار کا

دورِ تغیّرات نے جادۂ غم ملا دیا
اک مرے ہم کنار سے اک مرے ہم کنار کا

جادہ طرازِ نوبہار آئیں گی منزلیں کڑی
دامِ رسن کی راہ بھی دشت بھی نخلِ دار کا

نرم ہوا سے جل اُٹھیں نبضِ جنوں میں شمعیں سی
اور اگر برس گیا ابر کہیں بہار کا

کوئے بیاں میں کج نہاد شہرِ جنوں میں تنگِ شوق
ذکر بھی کس زباں میں تھا عشق سے بے دیار کا

کھینچ گیا ہے خواب میں خطِّ زمرد و عقیق
خیر سے انتخابِ رنگ دلبرِ تازہ کار کا

قصۂ دشتِ بے پناہ ہم نے بھی راہ میں سنا
گردِ جنوں زباں سے کچھ مدنیؔ رہ سپار کا

(۱۹۸۳ء)

سلگ رہی ہے فضا روئے ہم کناراں سے
رگِ جنوں میں چمک سی ہے باد و باراں سے

صبا گئی تو اُدھر تھی پہ دیکھیے کیا ہو
جنوں کا نام تو زندہ تھا بزمِ یاراں سے

اک اعتبار کی دنیا مٹی کہ ہم نہ رہے
کوئی اٹھے نہ اٹھے کوئے جاں نثاراں سے

حریفِ آتش و آہن نکل ہی آتے ہیں
تمھیں یہ کھیل نہ کرنا تھا وضع داراں سے

لہو سے تر ہیں قمیصیں شبِ مصاف آخر
خراج لے کے گئی ہے جگر فگاراں سے

وہ ایک صبحِ مسافت بھی یاد کب آئی
اڑی ہے گرد سی جب خیمہ گاہِ یاراں سے

عجیب رنگ میں ٹوٹی ہے نیند کی زنجیر
الجھ کے سلسلۂ خوابِ خوش کناراں سے

بنیں گے خواب کے کچھ دائرے سے تا بہ سحر
خرامِ ماہ وشاں رقصِ شب گزاراں سے

سرودِ مطربۂ نو رسا میں جان آئی
دعائے نیم شبی لے کے بادہ خواراں سے

خدا کرے کہ وہ دشمن کا بھی نصیب نہ ہو
مرا جو حال ہوا آمدِ بہاراں سے

(۱۹۸۲ء)

✿

یہ مزاجِ یار کا حال ہے کبھی صلحِ کُل کبھی دل سے صاف
کبھی بدگماں جو ہوا کہیں تو مثالِ خنجرِ بے غلاف

کبھی غیض میں وہ شبِ بلا کہ خیال و خواب بکھر گئے
کبھی شوق میں وہ شبِ وفا جو سمٹ گئی ہے بہ یک لحاف

کبھی عجز وہ کہ گدائے عشق کے ساتھ ساتھ ہے کُو بہ کُو
کبھی وہ جلوسِ شکوہ ہے کہ دلوں کے بیچ پڑیں شگاف

کبھی مثلِ شعلہ کہ تابِ دید کا جل اٹھا ہے ورق ورق
نہ حنائے پا کی خبر ملی نہ ملا سراغِ سرِ مباف

کبھی وہ حجاب کہ جسم کا کوئی رنگ ہی نہ جھلک سکا
کبھی شمعیں آپ ہی جل اٹھیں سرِ سیمِ ساق سے تا بہ ناف

یہ اسی گلی کی ہے داستاں وہ اسی گلی کا ہے ماہ رُخ
جسے لوگ کہتے ہیں اک پری بہ طلسم بندیِ کوہ قاف

جو مرے سخن کی ہوا میں تھی جو مرے مزاج کی رَو میں تھی
اسی سان پر ہے چڑھی ہوئی تری تیغِ تیز خطا معاف

(۱۹۸۱ء)

(نذرِ غالبؔ)

خط میں لکھا ہے وہ اس نے کہ بتائے نہ بنے
جی سے گزرے نہ بنے، آپ میں آئے نہ بنے

خوفِ شیر اس میں ہے آگے ہے بیابانِ وفا
اک جنوں پیشہ گیا ہو تو بلائے نہ بنے

ہم نشینی سے تری خانۂ دل میں برسوں
اک وہ آرائشِ جاں تھی کہ بتائے نہ بنے

بن سکی مقنع و چادر سے نہ ترکیبِ حجاب
تیرا اسلوبِ بدن وہ کہ چھپائے نہ بنے

در و دیوار کا قالب تو نہ تھا کوچۂ یار
اک وہ جادوئے نظر تھا کہ جگائے نہ بنے

درد کو چاہا نہ چمکے ، تو چمکتا یوں ہے
اک چراغِ تہِ داماں جو بجھائے نہ بنے

(۱۹۷۳ء)

بیعانہ

شہر کے آسیب بھی تھے روحِ ویرانہ بھی تھی
شب کہ اک خوابِ بیاباں سے جنوں خانہ بھی تھی

وقت میں اک جست چیتے کی تھی ناخن بر شکار
برق آسا ناخنوں کی رات دستانہ بھی تھی

نقش اک ٹوٹی ہوئی دیوار کے خفّاش تھے
بے کفن لاشوں پہ روشن شمعِ کاشانہ بھی تھی

شمع برکف نردبانِ تیرہ تک آتی ہوئی
اک پری بے حد جنونی بھی تھی فرزانہ بھی تھی

شرح کی تعبیر گو نے خوابِ وحشت ناک کی
ہر تغیّر میں شکست و ریختِ بیعانہ بھی تھی

(۱۹۸۱ء)

شک

روحِ عالم پر فشاں تھی ابرِ تر نے روک کر
یہ کہا اس سے کہ اے صاحب نظرِ گردوں نشیں
میری نبضِ تر میں جو خوابیدہ ہے سورج کی آگ
وہ بھی کیا اک نوعیت کا ہے فسادِ مہر و کیں
بوند تھی پانی کی یوں تو میری اصلِ زندگی
ایک موجِ آب سے ہوں کیوں ہواؤں کا مکیں

سن کے یہ خود روحِ عالم نے دیا اس کو جواب
ہے ضدوں کا امتزاج آخر یہ ملبوسِ حسیں
تیرگی کے داغ سے جب دل پہ اک ظلمت سی چھائے
روشنی خود اس میں ہو جاتی ہے غلطیدہ نگیں

زندگی کو یوں نہیں ملتا سراغِ باطنی
اے لبِ ابرِ رواں اے تر زباں اے نکتہ چیں
رنگِ گل ہو چشمِ آہو ہو کہ فکرِ آدمی
روشنی عریاں نظر آتی ہے اور پردہ نشیں
یہ ضدیں بنیاد ہیں اس خاک دانِ تیرہ کی
کچھ سمجھ سے کام لے اک شک ہے بنیادِ یقیں

(۱۹۸۳ء)

جواب

سمندر کے کنارے تھا ہوا میں رقصِ منصوری
پگھلتی تھی غروبِ مہر سے نزدیکی و دُوری
گراں تھا روحِ عالم پر کوئی آئینِ مجبوری

دلِ وحشی سے سرگوشی میں خود موجِ ہوا کیا تھی
تغیّر کے ورق پر حرفِ تازہ کے سوا کیا تھی

وہ ماہ و سال جو تہذیب کی پیکار میں گم تھے
نوامیسِ جنونِ جبر کے آثار میں گم تھے
وہ سارے کارواں جو گرمیِ رفتار میں گم تھے

غبارِ کُو بہ کُو سے اس طرح پابندِ جادو تھے
مآلِ زندگی کی جستجو میں سر بہ زانو تھے

غمِ دانش کی ساری وسعتیں تھیں پیچ و خم رکھتیں
سبک قطروں میں ایجادیں خروشِ موجِ یم رکھتیں
سرِ میزاں ہوائیں تھیں مآلِ بیش کم رکھتیں

لباسِ نو میں تھی تاریخ خود مجروحِ بے تابی
کھلی تھی آنکھ میں خارِ مغیلاں کی سی بے خوابی

کہا میں نے کہ اے چشمِ جہاں بیں، محرمِ عالم
اشاراتِ نوی کی سلسلہ جنباں ہے تو پیہم
ہوائے دشت و در میں کس طرف ہے منزلِ آدم

تصادم زاویہ ہائے نظر کے ، وار دانش کے
نہیں کھلتے ہیں ہم ایسوں پہ کچھ اسرار دانش کے

جواب اس نے دیا اے جہلِ بے آگاہ کے حامی
مری نظروں میں ہیں ہنگامہ ہائے عارف و عامی
سوادِ ارتقا میں ہے غمِ منزل بھی اک خامی

مزاجِ آب و آتش خود رخِ فردا کا محرم ہے
بساطِ دہر میں نفسِ تغیّر روحِ عالم ہے

ابھی ہے نیم وا ادراکِ نو کا ایک دروازہ
غبارِ زحل و زہرہ ، علم کے رخ پر ہوا غازہ
ہوئی ہے روحِ انساں کی رفیق اک آگہی تازہ

رصدگاہوں کے خط ٹکرا رہے ہیں مہر کی ضو سے
یدِ بیضا ہوا ہے زرد رُو اک آتشِ نو سے

خیالوں میں ہیں رشتے وقت کی کھنچتی طنابوں کے
رمِ سیّارگاں سے آتشیں جادے ہیں خوابوں کے
سوادِ ماہ تک اعشاریے ہیں اب حسابوں کے

نظر جلتی ہے جن کے بال و پر سے ایسے سودائی
نکل آئے ہیں کیا کیا خاکِ انجم کے تماشائی

فساد اک علمِ بے آگاہ سے اٹھتا رہا کیا کیا
دھواں الفاظ کی جنگاہ سے اٹھتا رہا کیا کیا
غبارِ نطق برسوں راہ سے اٹھتا رہا کیا کیا

مزاجِ ابر و ذوقِ کشت ہو جب غم گساری میں
تغیّر فکرِ نو کے بیج بو دیتا ہے کیاری میں

مرے دامن میں ہے تشنہ لبوں کا ذوقِ سیرابی
اسی سے وقتِ تازہ کار میں ہے خوئے کم یابی
رمِ دریا کی صورت معملوں میں ان کی بے خوابی

تماشا گاہِ ساحل کو اک آئینہ دکھاتی ہے
یہیں تاریخ قندیلیں بجھاتی ہے، جلاتی ہے

(۱۹۸۰ء)

سر چارلس چیپلن

چیپلن، گرویدہ تھی روحِ کمالِ فن تری
برگ آور ہی رہی شاخِ نہالِ فن تری
کہنگی کو اک شکست آخر سرِ تکذیب دی
تُو نے بے قالب سلولائیڈ کو اک تہذیب دی
نقشِ محراب و ستوں پر طنز ہے تیرا خرام
پائے محتاجاں کی لرزش میں سوالوں کا سا دام
نیک و بد کی حد سے تھی آگاہ تیری بے کسی
دل میں کانٹے سی چبھوتی ہے تری ظالم ہنسی
ہر تصنّع تھا تمسخر کا ہدف تیرے لیے
زندگی تھی بے گہر کوئی صدف تیرے لیے
نو بہ نو تیری اداکاری رہی ہے اک سبیل
آدمی کے محورِ تہذیب ہونے کی دلیل
تیرے کرداروں نے کی ہیں فاش خود آئینہ دار
وہ ملمّع سازیاں اُترا نہیں جن کا خمار

بڑبڑاتا تھا مکلّف روحِ انسانی کا کھوٹ
اس نفاست سے ترے الفاظ کر جاتے تھے چوٹ
روح فرسا تشنہ کامی اور پُر کاری کے دام
تیرے کرداروں میں تھے عالم کی عیاری کے دام
کاسۂ خالی میں پرتو سکۂ مقلوب کا
ذائقہ فاقوں میں تھا اک لقمۂ مرغوب کا
معصیت کو مس کبھی کرتیں تری معصومیاں
اک غبی پیکر میں ذہنِ تیز کی محرومیاں
رقصِ بسمل کی طرح تیری ادا تڑپا گئی
ایک غم کی آگہی چشمِ تماشا پا گئی
نیتوں کے رُخ ہوئے ہیں تیرے فن سے آشکار
طاق و منظر کے تقاضے خبثِ باطن کا شعار
کوئلے میں جذب اک مہرِ درخشاں کی کرن
صورتِ الماس جلوہ گر تھی تجھ میں روحِ فن
فاقہ مستوں چاک دامانوں میں آکر رک گئی
آستانِ غم پہ خود روحِ ظرافت جھک گئی
تو وہ طائر تھا جو اپنی بے پری کی آگ سے
جل کے خود پیدا ہوا دانش وری کی آگ سے

(۱۹۷۹ء)

پروفیسر ٹائین بی کے لیکچر کے بعد

ٹائین بی، محرمِ رموزِ حیات
اک مؤرّخ ، حلیم ، خوش اوقات
بزمِ دانش وراں میں یکتا تھی
قد و قامت میں آپ جس کی ذات
ایک لیکچر میں کر رہا تھا عیاں
کچھ مزاجوں کا فرق ، تفصیلات
سننے آئے تھے شہر کے اشراف
ایک دانائے روزگار کی بات
وہ تو جو کچھ تھا خیر اس کے بعد
روحِ تاریخ سے کہاں ہے نجات
اس کی نظروں میں تھے عروج و زوال
اک گرہ خوردہ بندِ رمز و نکات

اس کے بچپن کی چند یادوں پر
سایہ افگن تھا ہر نفی و ثبات
وہ یہ کہتا ہے آدمی نے بہت
کھائی ہے اپنی غفلتوں سے مات
عہدِ وکٹوریہ کے یورپ میں
نرم صوفوں پہ سو رہی تھی حیات
ہر سمومِ بلا سے تھی محفوظ
نرم آسائشوں کی ایک قنات
ایک آتش فشاں کا دامن تھا
اور آرام کرسیوں کی برات
ماہرِ زلزلہ ، لگاتے کان
گر زمیں سے کبھی بہ قصدِ حیات
ایک زیرِ زمین غوغا کے
طبلِ نعرہ زناں کی سنتے بات
وقت کا رتھ پہاڑ کے مانند
جس کے پہیے تھے دیوِ مرگ صفات
ہر سپید و سیہ کے سینے پر
پاؤں رکھ کر کچل گیا دن رات

آج در پیش ایک مسئلہ ہے
ہر نفس ہے تغیّرات کی بات
ایشیا کے سواد میں ہر سو
ابرِ تیرہ ہے خوف کی برسات
اسلحہ خانۂ اروپا میں
آتشیں ترکشوں کی ہیں سوغات
آ نہ جائے شہابِ ثاقب سی
ناگہاں کوئی ساعتِ آفات
یہ بھی ہے اک دعائے خیر کا وقت
بزمِ دانش ورانِ خیر صفات
جل نہ جائے زمین کا دامن
جانِ جاناں زمین جانِ حیات

(۱۹۸۳ء)

برٹرینڈ رَسل

(کراچی ایئرپورٹ پر مختصر قیام کا ایک تأثر)

دراز ساعتِ طیّارگہ کے سائے ہوئے
چلے ہیں حلقۂ زنجیر سی بنائے ہوئے

دمک اٹھا ہے ابھی چند ساعتوں کا اُفق
ادائے چہرۂ عالم شناس پائے ہوئے

اُتر کے ساتھ ہی آئی ہے اس کے روحِ خرد
ورق کتاب کے زیرِ قبا چھپائے ہوئے

سفید مو میں لیے دانشِ قدیم کے راز
فضا کی زلفِ توہّم زدہ جلائے ہوئے

پیامِ امن کے آہستہ رَو جوابوں میں
سوالِ زاغ و زغن کا ہے بار اٹھائے ہوئے

حسابِ سود و زیاں میں وہ اک ریاضی داں
رموزِ صفر سے سرِّ حیات پائے ہوئے

وہ دشتِ فکر میں جھلسا ہوا سا اک چہرہ
ہجوم میں بھی غمِ برتری چھپائے ہوئے

ہوائے عصر کی پیکر تراش بے تابی
رُکی تھی موجِ نفس کو سخن بنائے ہوئے

عجیب رنگ میں نکھری ہوئی سی دانائی
خلش تھی سینہ شگافی کی لو بڑھائے ہوئے

بجھا کے آبِ ندامت سے التہاب کی نار
صفِ عدو کو صفِ دوستاں بنائے ہوئے

حریمِ حرف کے پردوں میں نیک و بد کی دلیل
سرِ اُفق تھی نئے آئنے اٹھائے ہوئے

ضمیرِ عصر و نمو پروری کا ابرِ مطیر
کنایہ ، موجِ نفس میں کوئی چھپائے ہوئے

وہ ہم مزاجِ ارسطو و بو علی سینا
اک اپنی خلوتِ یکتا میں سر جھکائے ہوئے

قریبِ شام تھا اک آفتابِ زندہ دلی
فریبِ حُسن کی سینے پہ چوٹ کھائے ہوئے

جلالِ بینشِ حاضر کا مدّعا بن کر
چراغِ رہ گزرِ آشتی جلائے ہوئے

(۱۹۸۳ء)

پروفیسر جولین ہکسلے اور آج کی دنیا

اے کراچی کی شامِ دل آویز
تجھ میں ہیں کتنے دشنہ ہائے تیز
سائنس کی کانفرنس میں اک دن
کیل کانٹوں سے لیس سارے مُسِن
علم و دانش کے صاحبانِ کبیر
تیز تھے جن کے ناخنِ تدبیر
چشمکوں پر ہوئے تھے آمادہ
یک دگر خاکِ منزل و جادہ
بحث تھی ہکسلے و نزدون میں
فرق معنی کی حرفِ ممکن میں
حرفِ بااختیار و قاصر کا
بحثِ دانش ورانِ حاضر کا

کھلتا جاتا تھا فرق محفل پر
سایہ افگن تھا ابر سا دل پر
نزودن تھا وکیلِ لائیسینکو
تھی زباں پر دلیلِ لائیسینکو
ہکسلے کا بھی آتشیں تھا جواب
اس پہ غالب تھے مالتھیوز کے خواب
خیر ان دائروں سے دُور خرد
لے گئی ہے حسابِ نیک و بد
ہکسلے دانشِ فرنگ کی ضو
فکر میں جس کے ہے ثبات کی رَو
عالمِ باعمل تھا خیر اندیش
ایک ترکِ رسوم جس کا کیش
کہہ رہا ہے کہ ذہنِ انسانی
منزلِ ارتقا ہے لافانی
قطرہ قطرہ مصفّٰی اعصار
عصمتِ خواب گاہِ نور و نار
کُنجِ اشیا میں ایک روحِ قیاس
ایک میزانِ ماہیت کی اساس
علم کی تشنگی میں آبِ عتیق

روحِ بینا و چشمۂ تحقیق
یہ طلسمِ کلیدِ بحر و بر
یہ موحّد تو آدمی برتر
گنجِ عصرِ رواں میں ذہنِ نوی
پھر طلب کر رہا ہے تازہ روی
علم بھی پھل ہے اک لطافت کا
آدمی کی کڑی ریاضت کا
زندگی علم کی پناہ میں ہے
آدمی اب بھی گردِ راہ میں ہے
راز یہ اس کی بود و باش میں ہے
اپنی تقدیر کی تلاش میں ہے
پیشوایانِ مذہبِ عالم
تھے اسی جستجو کے سب محرم
پختہ کارانِ فکرِ نو کی معاش
مُو پریشان ، فلسفے کی تلاش
آسماں ہفت خواں ارادوں کے
سیکڑوں بے خرام جادوں کے
مذہب و سائنس فلسفے کی حدیں
جستجو کے ہزار رخ کی مدیں

حسنِ معنی میں سب کی ایک ہے حد
زندگی اک عمل ہے بامقصد
پردہ ہے آدمی کی ذات ابھی
محورِ سِرِّ کائنات ابھی
ہیں ابھی سر بہ مہر رازِ عمیق
سببِ کائنات کی تحقیق
ابتدا کی گرہ بھی کُھلتی ہے
مُو بہ مُو زلفِ علم ڈھلتی ہے
کائناتیں و کہکشاں و غبار
صد ہزار عالموں کی ایک قطار
سب یہ ماضی و حال و مستقبل
وقت کی جستجو کا اک حاصل
آؤ آگے چلیں اندھیرے میں
یدِ بیضا جلیں اندھیرے میں
کوئی جِن لے کے اک چراغ ملے
بطنِ اسرار کا سراغ ملے
لے چلو جو بھی پاس ہے نایاب
آئنہ آگہی و اصطرلاب
برکتیں مذہبی زمانوں کی

آگہی سائنس کے خزانوں کی
بال و پر فلسفے کے آتش ناک
روحِ تشکیک و طائرِ ادراک
آتشِ مہر میں نہائے ہوئے
ناخنِ جستجو جلائے ہوئے
گامزن سب ہوں اک نظر کے لیے
خیرِ تکمیل کے گھر کے لیے

(۱۹۸۳ء)

ڈزنی لینڈ ــــ (لاس اینجلز)

ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

یہ اک طلسمِ نگہ ایک شہرِ خواب نما
خیالِ حسن کی اک موج اضطراب نما

حدیثِ صنعتِ آذر کو رائگاں کہیے
اسی حصار کو بت خانۂ جہاں کہیے

اٹھائے ہے رخِ تخلیق چٹکیوں میں نقاب
ہزار رنگ میں جادوئے سامری کا جواب

اک آشتی کے پیامی نے گرمیِ جاں سے
ملا دیں سرحدیں خلّاقِ صبحِ پنہاں سے

خبر سے دُور یہ تخلیق کا جنوں خانہ
نمو کی آئنہ گاہوں کا ایک افسانہ

کہیں ہے سایۂ فردا کا اک تصورِ خواب
کہیں ہے سلسلۂ ارتقا کی ایک کتاب

اسی فضا میں ہے عہدِ عتیق تیرہ تار
بقا کا جشن درندوں کا اک نیا تہوار

کہیں ہے حسنِ تصوّر کے آئنوں کا کھیل
قدیم وقت کے جنگل سے اک گزرتی ریل

ہوا کی رَو میں نباتاتِ تیرہ دل کا دوام
ہزار طرح کے وحش و طیور محوِ خرام

زباں ہے سبزۂ کہنہ میں اک گواہی کی
پناہ گاہیں ہیں ہر سو جو مرغ و ماہی کی

سمندروں میں نباتاتِ بے نصابی ہیں
ہزار طرح کے باشندگانِ آبی ہیں

وہ پیچ و تاب میں قلزم پہ تیرگی کا لحاف
یہ شارک ، وہیل کی اک زندہ کارگاہِ مصاف

اسی فضا میں ہے معمل کی کرسیاں گرداں
فلک کی آگ ستاروں کی بستیاں گرداں

کہیں ہے چھوٹی سی دنیا کا بولتا ہوا نقش
حجاب و دید کی منزل کو تولتا ہوا نقش

ہوا کی زد میں لرزتا چراغ ایلس کا
شبِ سیاہ میں تنہائی داغ ایلس کا

ستم گرانِ جہاں کو یہ دے رہے ہیں زک
ذرا سی جان مِکی ماؤس اور ڈونل ڈک

رقابتیں ہیں نہ بردہ فروش شہر یہاں
زباں سے خار چکیدہ نہ دل سے زہر یہاں

عجیب حسنِ جہاں تیری قربتوں کے امیں
حریفِ آتش و آہن محبتوں کے امیں

انھیں نے بوسۂ جاناں و خوابِ طفلاں کی
پرو لی سانس میں اک سلک رمزِ پنہاں کی

تری نگاہ تھی ڈزنی کمالِ حیرت کی
نزاکتیں ہیں عیاں کارگاہِ فطرت کی

نثار تیرے کہ خلّاق اک ورق میں رہی
چمک زمین پہ اُتری ہوئی شفق میں رہی

یہ سیرگاہ تو عالم کی اک نگاہ ہوئی
مثالِ بازوئے عشّاق اک پناہ ہوئی

وہ خواب جس سے کہ خوابوں کی پیاس بڑھ جائے
دلوں کا قربِ محبّت کی آس بڑھ جائے

ازل سرشت نمو وقت سے جو مر نہ سکے
یہ سحر وہ ہے پری خواں سے جو اُتر نہ سکے

(۱۹۷۹ء)

پکاسو کا کبوتر

اے پکاسو کے کبوتر ، تیرے بال و پر میں ہے
اک نشیمن ساز روحِ عافیت کی برتری

تیرا نقش اور ایک بوسیدہ پرانا پوسٹ کارڈ
گرد کی تہ میں لکیروں کی ہے اک عشوہ گری

نرمیاں تیرے پروں میں یوں پروتی ہے ہوا
نیند میں بچوں کے ہو جیسے دعائے مادری

موقلم کی نرم رَو میں ہر پگھلتے رنگ کی
موجِ جولاں ہے رقیبِ گنبدِ نیلوفری

روبرو خلّاق آئینوں کے آشفتہ رہی
شانۂ فن کی طلب میں کھل کے زلفِ عنبری

آنکھ کے تِل میں ترے لرزاں پری خوانوں کی ماش
جس سے سکتے میں ہے افسونِ شہی کی داوری

اے سپیدِ آشتی ، آرائشِ عالم ہے تُو
ورنہ دنیا تھی فقط کاجل کی کوئی کوٹھری

کعبۂ امن و اماں پر آ کھڑے ہیں فیلِ مست
تُو بھی لے منقار میں، نیزہ ادا اک کنکری

کم نہیں ہوتی ہے اے طائر کسی عنوان سے
آدمی کی خانہ ویرانی کو جنگِ زر گری

بارہا آتی تھی جو گہوارۂ اطفال تک
پر جلا کر نیند میں آتی ہے خوابوں کی پری

بے نیام آزردہ سینوں کی کدورت سے ہوئی
تیغِ سفاکانِ عالم باڑھ رکھ کر دردری

آہنی گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہیں سر کچلے ہوئے
خندقوں میں زیست کرتی ہے اجل کی ہم سری

ان ہلاکت آفریں خونی فضاؤں میں ابھی
بے سِپر ہوکر کھڑی ہے آدمی کی برتری

تازہ تر ذوقِ نمو سے ہے دلِ انساں گداز
شاخِ گل کی طرح شاخِ آشتی ہوگی ہری

اک ہوا شیرازہ بندِ ذہنِ انسانی تو ہے
دفترِ عالم ہے گو ناگفتہ بہ اک ابتری

کھولنے والا ہے دروازہ سا دل کا آدمی
بند کرتا ہے درِ گو سال ہائے سامری

وحدتِ انساں کی شاخِ آشنا مسکن ترا
مذہبِ عشّاق بسم اللہ تیری کافری

شاخ ہے زیتون کی اک آگ سی لڑتی ہوئی
جل گئی تو آدمیت کی ہے قسطِ آخری

نامہ بر تاریخِ انسانی میں تو صدیوں سے ہے
قدر گو ، عشق داند یا بہ داند جوہری

(۱۹۷۹ء)

تیرے ساحل پر رصد گاہوں کے در

(دریائے سندھ)

نور سا آبِ کہن ، عہد آفریں دریائے سندھ
چشمِ گردوں میں کھٹکتی آتشِ مینائے سندھ

اے خدائے برق و باراں کے پسر اے سیم تن
تو جبینِ برف و نافِ ریگ پر ہے بوسہ زن

تو خرامِ وقت کی کُھلتی ہوئی زنجیر ہے
بے زباں تہذیبِ پیشیں کی رواں تحریر ہے

تو سرِ کوہ اک دعائے ابر و باراں کی طرح
وادیوں میں شانہ کش زلفِ نگاراں کی طرح

تو وصال آمادہ اک جستِ فرس کرتا رہا
غول مادہ کھیتیوں کو نیم رس کرتا رہا

اے نہنگوں کے نشیمن ماہیوں کی درس گاہ
جزر و مد در آستیں ہے تیری موجوں کی سپاہ

تیرا طوفاں نوحۂ شہرِ خرابی ہوگیا
تو دراوڑ قوم کا تابوتِ آبی ہوگیا

دب گیا زیرِ زمیں اک غم زدہ حیران شہر
دیکھتا ہے خواب سے اٹھ کر تجھے ویران شہر

کوچہ و بازار کا اک عکس مانندِ سراب
آئنہ دکھلا کے سیّاحوں سے کرتا ہے خطاب

ماہنجو داڑو کی رقّاصہ ، شبِ مہتاب میں
بال کھولے رقص کرتی ہے ترے گرداب میں

تیرا آبِ صاف ہے رگ وید کے اشلوک میں
موج میں ایسی چمک جیسی سناں کی نوک میں

ایک حادث در قدم سلکِ گہر ہے تیری موج
آریوں کی داشتہ ، زرّیں کمر ہے تیری موج

رخشِ اسکندر کا سایہ تیرے آئینے میں ہے
فتح نعلِ واژگوں ہو کر ترے سینے میں ہے

کیا کہا تھا لشکروں سے تیری عریاں موج نے
تجھ میں آسیبِ فنا دیکھا تھا چشمِ اوج نے

بے نمود و نام بے زنجیریِ رنگ و نسب
تیری موجوں میں ہے لرزاں شعلۂ ریگِ عرب

رنگِ آئینِ عرب پنہاں ترے خاکوں میں ہے
ایک نو خط میرِ لشکر تیرے پیراکوں میں ہے

اے ابد پیوند دریا صورتِ موجِ خیال
تازہ دم مانندِ یار ، آسودۂ ذوقِ وصال

تیرا رم آہنگِ نوخیزاں بہ صوتِ انقلاب
پیچ و تابِ یانگ تیسی کا ہے شاید ہم رکاب

تیرے رَم میں کُھل رہا ہے اک تغیّر کا ورق
تیری رو میں ہو رہا ہے سینۂ کہسار شق

محوِ سرگوشی ہیں زیرِ آب پتھر کی سلیں
جیسے ہم آغوش پیکر قعرِ دریا میں ملیں

تیرے ساحل پر تگ و دو کے ہیں کچھ آثارِ نو
بال افشاں ہیں پرندوں کی طرح افکارِ نو

تولتا ہے وزن دیواروں کا افسونِ فرنگ
سایہ افگن تیری موجوں پر ہے قانونِ فرنگ

تیرے بازو پر ہے تربیلا کا نقشِ نو ابھی
کچھ چراغ آسا تو ہے مانا کہ ہے کم ضو ابھی

تختیاں ہیں کچھ مساواتِ نوی کی برق پاش
دفترِ معنی ہے ہندسوں میں عدد میں اک تلاش

کُھل رہے ہیں تیرے ساحل پر رصدگاہوں کے در
ظلمتوں میں برقِ آب اندام کی راہوں کے در

خواب کے سے دائرے ہیں اور پرکارِ نمو
روحِ فردا تیرے ساحل سے ہے محوِ گفتگو

آب گوں چہرے پہ بے مہری اٹک سے سندھ تک
تو نواحِ ذوقِ پیدائی ہے تو اک بطنِ شک

دستِ جادوگر سے پودے چشمِ قاتل سے صدف
تیری تہ میں ڈھونڈتے ہیں ذی نفس کوئی ہدف

قعرِ دریا میں گیاہ و مار کا اک کھیت ہے
زرد رَو پودوں میں ٹوٹے موتیوں کی ریت ہے

کھنچتا جاتا ہے تو مرگ و نمو کے دائرے
قوسِ غرقابی ، خطِ ساحل ، لہو کے دائرے

تیرا رم تاریخ اور تاریخ اک دریا کا رم
زندگی کا رمز ہجرت آشنا و تازہ دم

کہنگی ہے اک غنودہ بستری ، آئینِ خام
زندگی تہذیب کی بیدار ساعت کا ہے نام

چاہِ بابل میں مقیّد ہو وہ کیا روحِ خیال
منسلک قلزم سے ہو جانا ہے دریا کا مآل

تو بھی اے دریا تغیّر کی ہے اک موجِ رواں
کرم خوردہ کشتیاں کب تک یہ کہنہ بادباں

مفلسانِ وادیِ کہنہ سے اُترے زنگ آج
تا اُفق بہتے ہوئے دریا کوئی وہ رنگ آج

ہم سے بے تقدیر گردش آسیا کی دیکھ لیں
تیرے آئینے میں صورت ایشیا کی دیکھ لیں

حسن سا جو تازہ رُخ ہو عشق سا آزاد ہو
تیرے ساحل پر کوئی شہرِ وفا آباد ہو

(۱۹۷۷ء)

اک طلوعِ شب ہے قندیلوں سے

(اسلام آباد کا سواد)

نیلگوں پا بستہ قندیلوں کے شہرِ تازہ دم
ریت کے ٹیلوں پہ اک آہوئے یونانی کے رم☆

اک وہ رم موجِ خیال افروز سنگ و خشت میں
جس نے دھندلا کر دیا ہے فرق خوب و زشت میں

سبزہ و گل تیرے نورس رہ گزاریں بے مثال
صبح جست و خیز تیری ، شام زخم و اندمال

☆— اقبال: ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
اسلام آباد کا خاکہ ایک یونانی کمپنی نے تیار کیا تھا۔

تُو ہے اک عنواں سیاست نامۂ افرنگ میں
بابِ تازہ ہے کتابِ افسر و اورنگ میں

اک طلوعِ شب ہے قندیلوں سے جنبش ضو میں ہے
ایشیا کی کہنہ آشامی لباسِ نو میں ہے

ساز و ساماں تیرے ایوانِ نظامت کا جدید
پاسباں آب و ہوا کا قالبِ سنگ و حدید

مملکت کی دور اندیشی کی ہیں آئینہ کار
پنج سالہ خواب کے تعبیر گویوں کی قطار

دائرے ، اعشاریے ، کمپیوٹر اور ان کی زباں
کشت و خرمن کے حسابوں میں غمِ سود و زیاں

ست رگِ افلاس میں جاری ہے سرعت کا نفاذ
عالمی بینک ، ایشیائی بینک ، طاقت کا نفاذ

سرزمینِ ایشیا مردل کے اندیشوں کی رَو
بنجروں کی کہنگی میں کیمیائی خونِ نو

یہ صدی عہدِ سیاست کا ہے ایسا چیستاں
ردّ و کد کے سخت ہنگاموں سے کٹتی ہے زباں

اک طرف لینن کے خوابوں کی زمیں بیدار ہے
ایک دستاویزِ حفظِ ایشیا تیار ہے

اک طرف صاحب نظر بارود کے موجد بھی ہیں
ہند کے اجزا قدیم و نو کے محوِ ضد بھی ہیں

یہ صدی راڈار و سگنل کی فضاؤں کا ہے دور
بحرِ اوقیانوس کے تازہ خداؤں کا ہے دور

یوں تو ایوانوں میں تیرے بھی ہے اے نو پیرہن
سعیِ بیداری سے کوئی جنبشِ تزئینِ فن

تجھ سے لیکن حیرتِ سیّاح کرتی ہے سوال
تیرے بام و در ہیں کس تہذیب کی شامِ وصال

کب سے اک تاریخِ لافانی رہی شہروں کی روح
محورِ تقدیرِ انسانی رہی شہروں کی روح

عرصہ گاہِ نیک و بد میں جادۂ تہذیب میں
ہر بلند و پست کی تقدیس میں تادیب میں

ہے وجودِ شہر سے تہذیبِ عالم کا گراف
یہ رگِ تاکِ وفا ہے زلفِ دانش کا مباف

شہرِ ایتھنز وہ چراغِ مجلسِ یونانیاں
وہ سوادِ فکر ، شمعِ محفلِ روحانیاں

جس کے بام و دَر سے غم کو اک رخِ حکمت ملا
خود مثال و نقل کو اک حلقۂ فطرت ملا

جس کی دانش گاہ میں روحِ عناصر تھی خجل
اوّلیں دورِ علاماتِ جہانِ آب و گِل

مرگ نے جس دائرے میں علم کو اک رُخ دیا
صدق کو زہراب دے کر حلم کو اک رُخ دیا

رومۃ الکبریٰ وہ سرو اور ورجل کا دیار
برتری کے کرّ و فر کا جس کی آنکھوں میں خمار

سطوتِ دیریں کی اک زرّیں قبا قانونِ روم
معنیِ جرم و سزا میں لب کشا قانونِ روم

خنجرِ بروٹس بھی تھا خونیں قبا سیزر بھی تھا
آتشِ نیرو بھی تھی نغمہ بہ لب محشر بھی تھا

باعثِ تغیرِ عالم حوصلے شہروں کے تھے
نام سے اسلام کے جو سلسلے شہروں کے تھے

جب کسی جنبش سے خود ہندسوں میں ڈھل جاتی ہے فکر
شاخ سے گرتے ہوئے پھل سے ثمر پاتی ہے فکر

عہدِ نو ہے جدّتِ علم و عمل سے سرفراز
برسرِ رہ ہیں غنودہ ذہن تجھ میں محوِ ناز

علم و حکمت کی رخِ بغداد پر جب لہر تھی
ظلمتِ یورپ میں مانندِ شعاعِ مہر تھی

شمعِ کافوری سے روشن قرطبہ کی شام تھی
سرمۂ چشمِ زمیں تزئینِ سقف و بام تھی

شہر میں الجھا ہوا ہے خام اندازوں سے ذہن
لڑ رہا ہے بند آنکھوں بند دروازوں سے ذہن

داستانِ شہر ، گیلیلیو ، ردائے چاک چاک
مجرمِ تحقیق ہے آتش زدہ برونو کی خاک

یہ صدی ہے ذہنِ انسانی کی جرأت کی صدی
ذوقِ استفہام سے مجروح حیرت کی صدی

آدمی کے دل میں گرداں کہکشاں کی لہر ہے
معملوں میں اب گرہ خوردہ شعاعِ مہر ہے

خواب و بیداری میں محوِ کار چشمِ جستجو
خطِّ پیمانہ ہے اک خوں بار چشمِ جستجو

روحِ ایجادِ نوی آتش قبا ذرّات میں
شک سے اک پردہ اٹھاتی ہے اندھیری رات میں

نقد سے کرتی ہے اخذ ایسے وظائف زندگی
ایک ہی پرتو سے ہے بے خواب و خائف زندگی

زندگی اک کارِ صد شیوہ ہے اور جلوہ طراز
یہ طلب کرتی ہے کچھ آزاد ذہنوں کا گداز

ہم کہ ہیں صدیوں سے ضعفِ کہتری سے سرنگوں
چشمۂ تخلیق گم ہے ، بے پری سے سرنگوں

نیم جاں خاکستری اب تک ہیں تیرے روز و شب
مکر و حیلہ کے ہزاروں رُخ ہیں آئینہ طلب

نو قبا سجدہ گزاروں کے دیارِ تازہ دم
انقلابِ دہر کی رفتار کے کچھ ہم قدم

جاگ اٹھے تیرے پیکر میں کوئی بے تاب رُوح
تشنہ و مجروح خودداری سے اک بے خواب رُوح

نیک و بد سود و زیاں سرخ و سیہ کا ہیں حساب
ہر نفس تاریخ کی میزان کے نادیدہ باب

دوش و فردا میں تُو کس کے قرب سے بے تاب ہے
ذہنِ نو سے تجھ میں کتنے فاصلے کی تاب ہے

کوئی منزل ہو تصوّر عدل کا اک زینہ ہے
دورِ حاضر خود رُخِ جمہور کا آئینہ ہے

یک دگر ہوں جسم و جاں نیندوں میں بیداری کا حال
چاہیے تجھ میں عروسِ نو کا آئینِ وصال

پائے ساکت میں ترے تازہ روی کا رمز ہو
چشم و ابرو میں اشاراتِ نوی کا رمز ہو

تیرے چہرے پر ہوا سے کاکلوں کا مس رہے
بار آور ہو شجر ، فصلِ ثمر نورس رہے

(۱۹۷۸ء)

میرا پیالہ

میرے تغیّر پسند اک دوست کہہ رہے تھے کہ تیری باتیں
نہ جانے کس دور کی جھلک ہیں نہ جانے کس غم کی وارداتیں

کھلا ہوا اک کواڑ بے شک پرانے خوابوں کے سایے میں ہے
ہوا بجھانے کو وہ دِیا ہے جو تیری کہنہ سرائے میں ہے

تری نظر سے لپٹ رہے ہیں ابھی وہ پردے سواریوں کے
جو شام پڑتے ہی لے کے آتی تھیں رہنے والے اٹاریوں کے

جنوں کے خیموں میں کل جو پریاں اُتر رہی تھیں کدھر گئی ہیں
غبارِ عالم میں پر جلا کر، اِدھر اُدھر سب بکھر گئی ہیں

ترے خیالوں کی کیاریوں میں ہوا سے کیڑے اُتر رہے ہیں
ترے احاطے کے نرم پودے حروف و معنی کے مر رہے ہیں

تری خرابی کا راز یہ ہے شرابِ کہنہ کے گھونٹ پی کر
سمجھ رہا ہے کہ تو امر ہے اسی نشے کی گھڑی میں جی کر

خبر بھی ہے گردشِ زمانہ جنوں کے محور سے ہٹ چکی ہے
چلی ہیں وہ آریاں ہوا کی کہ دل کی دیوار کٹ چکی ہے

ہری بھری تھیں کبھی جو بیلیں تُو ان کے جوبن پہ مر رہا ہے
کوئی فرشتہ نمو کا تجھ تک پیام لے کے اُتر رہا ہے

قطارِ نو واردانِ عالم، ہزار فکرِ معاش میں ہے
مگر گھنے بن کی اوٹ میں تو شکنتلا کی تلاش میں ہے

پرانے طوفاں سمندروں سے جگانے والے جنوں سے ڈر ہے
جو چند منتر ہیں یاد تجھ کو ابھی انھیں کے فسوں سے ڈر ہے

جواب کیا نکتہ چینیوں کا کہ زندگی خود جواب دے گی
ہم ایسے دو اک بھی رہ گئے تو سخن وری خود جواب دے گی

نارسائی کی حدیں جرمِ وفا بھول گیا
وہ بھی کیا عشق ہے جو لغزشِ پا بھول گیا

تم نہ نکلو کہ ابھی شہر کی شمعیں گُل ہیں
روحِ شب کو ہے کسی گھر کا پتا بھول گیا

ناز تھا دل کو جس آئینِ ہم آغوشی پر
وہ بھی، اک حیلہ گرِ مہر و وفا بھول گیا

ربطِ ہر آئنہ و شانہ سے نکلی ہوئی زلف
ہر تغیّر تھا کہ جو اپنی ادا بھول گیا

خیر اس بات پہ لازم ہی سہی سجدۂ سہو
ہم نہ بھولے تھے مگر ہم کو خدا بھول گیا

دل وہ کافر ہے کہ خود دیکھ کے سایہ اپنا
تشنگی ساری ، سرِ آبِ بقا بھول گیا

(۱۹۸۲ء)

پہلی اشاعت: نومبر ۲۰۱۳ء

فہرست

نظمیں

غزلیں

نظمیں

غزلیں

نظمیں

غزلیں

نظمیں

غزلیں

نظمیں

غزلیں

نظمیں

غزلیں

نظمیں

غزلیں

○○○

قفلِ ابجد

اک شبِ خواب، جنوں بستہ گزاری ہم نے
آبِ گم حرف کا کرتے ہوئے جاری ہم نے
روحِ معنی تھی جو محمل سے اُتاری ہم نے

قفلِ ابجد کی طرح رات تہِ خواب آئی
کنجیاں لے کے کوئی ساعتِ نایاب آئی

مہرِ لب توڑ کے گفتار میں تھی روح الف
امتحانِ رسن و دار میں تھی روح الف
صاحبِ لوح سے پیکار میں تھی روح الف

روح ب ایک خموشی کی مہم سر کرنے
نطق کو قامتِ عالم کے برابر کرنے
بائے بسم اللہ کو آغاز کا دفتر کرنے

ج کی روح میں جنبش جو پر و بال کی تھی
دوش و فردا کا سخن روح بیاں حال کی تھی
ایک نقطے میں جھلک مجمعِ اشکال کی تھی

د کے دائرۂ خاص میں اک نکتہ رسی
روحِ اعصار نہاں رقصِ نظامِ شمسی
زلفِ جاناں تھی ادھر عنبرِ سارا میں بسی

رات گزری تو حجابِ مہ و انجم بھی کھلا
قفلِ ابجد بھی کھلا رمزِ تکلّم بھی کھلا
زلفِ جاناں بھی کھلی بابِ ترنّم بھی کھلا

اس صدی کی نبضِ جولاں

سرمۂ بینش تھا بے شک علمِ آبا کا نظام
وہ کتب خانے کہ شمعِ آگہی تھے ہر نفس
وہ رصد گاہیں کہ تھیں نباضِ رقصِ صبح و شام
نصب تھی ان پر کبھی میزانِ خوب و زِشت بھی
وقت کے ہاتھوں میں مانندِ سپر صدیوں رہے
گرمیِ عالم میں یہ بے جان سنگ و خشت بھی

گردشِ سیارگاں ذرّات میں اک موجِ نور
تا بہ گردُوں تھی قیاسوں کی کماں کھنچتی ہوئی
وہ مقام و وقت کے نقشے، خیالوں کا وفور
ان کی حدِ علم کتنی زندگی آگاہ تھی

وہ ریاضی داں وہ ہر سو ماہرانِ کیمیا
اُن کا ذوقِ آگہی اک جستجو کی راہ تھی

علمِ آبا پر زمانے کی چلیں وہ آریاں
اب یہ پتھر کی سِلیں ہیں وقت سے سیلی زدہ
پشت پر قیدی کے ہیں کوڑوں کی سی گل کاریاں
عکس سب بجھتے گئے ، بینائیاں کھوتی گئیں
رونقیں منسوب تھیں ان سے وہ خطِ دید پر
گرد کی کہنہ لحافیں اوڑھ کر سوتی گئیں

عہدِ پیشیں کی نگاہوں کا تحیّر اور ہے
جستجو ساقط ہوئی خلّاق ذہنوں کی تو کیا
زندگی میں رمزِ آئینِ تغیّر اور ہے
کہنہ دستور العمل کی محو ہوتی ہے شناخت
ہر تغیّر کی علامت کا نشاں کچھ اور ہے
تازہ تر اشکال کی کچھ اور ہی ہوتی ہے ساخت

ردّ ہوئی ہے بزمِ عالم کی نئی ترتیب میں
کج نہاد و کہنہ سامانی کی ہر پیچاں دلیل

گردشیں کچھ اور ہیں ذرّاتِ نو ترتیب میں
منزلِ دشوار تر کا مرحلہ ہے زندگی
اک سزاوارِ تغیّر ہے نظامِ کائنات
انکشافِ تازہ تر کا سلسلہ ہے زندگی

معرضِ آئینہ روئی سے پگھل جاتے ہیں سنگ
سخت پیکارِ عناصر میں بھی روحِ اعتدال
آپ کچھ اجزائے نو قالب کا پا جاتی ہے رنگ
انگلیاں جلتی رہیں تاروں کی بجھتی راکھ میں
کارگاہِ فطرتِ سفّاک کا تنہا رقیب
آدمی مجرم ہے کارِ ارتقا کی ساکھ میں

پیمائشیں

دشت و در میں مرگ آسا ایک موجِ درد ہے
اے ہوائے کوئے جاناں اب متاعِ زندگی
وقت کے کشکول میں بے نام مرگِ زرد ہے

کیا شناسائی کی قندیلوں کے سایے غم گسار
محرمِ بالین و بستر نیم شب کی ساعتیں
رہن رکھ کر بے رخی خود وقت کی ہے سود خوار

ڈھونڈنے نکلی ہے کیا اس راہ میں صاحب فراغ
راکھ سی اڑتی ہے خوابوں کے اُفق پر دُور دُور
بجھ گیا ہے اس فضا میں دل سا لعلِ شب چراغ

کاروانِ خستہ پا ہے صبح و شامِ زندگی
بحر کی مرطوب چادر کی تہوں سے خشکیاں
بو گئیں کانٹے ببولوں کے بہ نامِ زندگی
ہڈیوں میں اک اترتے درد کے ہنگام سے
گرد آلودہ فضاؤں میں ہیں نابینا مشام
کھل سکیں گے وہ دعاؤں سے نہ اب دُشنام سے
تھی جو اک نبض و نفس میں چشمکِ انجم کی رَو
جس سے تازہ تر کبھی آب و ہوائے عشق تھی
کرمِ ماہ و سال اب ان پر ہوا ہے گرم رَو

گرمیِ گفتار جن کی خواب میں دیتی تھی لَو
بیش و کم کی راہ میں جو گوہرِ یک دانہ تھے
آسیا گرداں ہوا میں پس گئے مانندِ جَو
اب دلیلیں اور کچھ ہیں چیستاں کچھ اور ہے
اب سرِ میزاں مزاجِ تازہ ساماں اور ہے
عشق کے مدِ مقابل اب دکاں کچھ اور ہے
پَر فشاں شہروں پہ ہیں کچھ اشتہاروں کے عقاب
جن کے سایوں کی خریداروں پہ ہے اک ساحری
ہیں نئی اشیا کی فہرستیں نئے ناموں کے خواب

ہر ضرورت قالبِ سود و زیاں کی اوٹ سے
مانگتی ہے اپنی اک مجروح شدت کا کفن
کچھ تہی دستوں سے اک خوابِ گراں کی اوٹ سے
ہر رسائی کی بِنا ہے اک توسّط کا طواف
وزن اب کوئی حقیقت آپ خود رکھتی نہیں
نیک و بد پر چڑھ گئے چالاک حرفوں کے غلاف
مال گوداموں کی زنجیروں میں ہے الجھا ہوا
مارکِٹ کا رنگ اشیائے طلب کا سلسلہ
زندگی کا کوئی بھی رشتہ نہیں سلجھا ہوا

خواب و بیداری میں ہے سایہ فگن اک موجِ دود
نیم دانائی سے ساقط ہو کے آخر رہ گیا
نسلِ نو میں داغِ لالہ کی طرح رنجِ وجود
مافیا کی بین قومی تاجری کے ہاتھ میں
ایشیا کی کھیتیاں اپنے لیے ہیں فاقہ ساز
ایک نادیدہ فسوں ہے زرگری کے ہاتھ میں
دائرے نشّوں کے ہیں بجھتے ہوئے آفاق میں
نرم جلدیں فلسِ ماہی سی کئی رنگوں کے چاند
نیم رخ تاریکیاں خوابوں کے جلتے طاق میں

اک طرف ہے ذہن اپنی محویت میں تازہ دم
صنعتوں کی تازہ سامانی سے کچھ ملکوں میں ہے
اک دمِ آہن میں سو گھوڑوں کا اک آشفتہ رَم
اک طرف ٹوٹی مشینوں کے ہیں کچھ مدقوق خر
چر رہے ہیں کارخانوں کے جو نخلستان میں
بے سکت ایجاد ہے ذوقِ ہنر بے بال و پر
کچھ گراف ان نفعوں کی رفتار کی پیمائشیں
صفر کے رد و بدل سے ماہرانِ مالیات
کر رہے ہیں آج پیداوار کی پیمائشیں

ہر نفس اک شہر کی دیوار ہے جنگاہ میں
جس نے تہذیبِ نوی کو رخ دیا وہ آدمی
ایک کرمِ ناتواں ہے جابروں کی راہ میں
روحِ انسانی کی ضد ہے ہر ریاست کا فروغ
لے رہے ہیں ایک دیوارِ شکستہ سے خراج
فکر کی بالیدگی ، عہدِ سیاست کا فروغ
جور میں ہیئت کے خوں آشامیوں کا دور ہے
ہجر میں قزاقیاں ، سودے ، ملمع سازیاں
مرگِ یک انبوہ ہے بے نامیوں کا دور ہے

کوچہ گردانِ جہاں

رہ گزر کے موڑ پر چہرے طلب کرتے ہوئے
ایک خوابِ ہم کناری اک فریبِ شب کا سوز
اس فضا میں اک رمق سی درد کی پیراک ہے
نیم گفتہ چارہ جوئی کی تمازت میں ہنوز
دور سے پرتو فگن اک دلبری کا زاویہ
چاہتا ہے موجِ خوں میں زخمِ رسوائی بنے
نم ہوائیں گردشِ آغوش سے ملتی ہوئی
ایسی دل جوئی کہ اک عالم کی پہنائی بنے

• فرطِ زر کی ایسی شادابی کہ جس کے سایے میں
حافظے سے مٹ گیا افلاس کا اذنِ وجود

وہ توازن جس کے نسخوں کی بہت تشہیر تھی
اک شکست آثار ذوقِ آگہی سے موجِ دُود
رُخ پہ شادابی مگر اک تشنگی سی روح میں
گرم رفتاری میں وہ الجھن کہ منزل رہ نہ جائے
ایک پُل سے دوسرے پُل تک وہ آبادی میں فرق
راہ میں دریوزہ گر سایہ بھی حائل رہ نہ جائے

کارخانوں کی فروزاں ساعتوں میں نوجواں
زخمِ بازو کے سوا ، فردا کی بے نامی لیے
صفر محنت کے حسابِ رزق میں ڈھلتے ہوئے
زندگی کا خواب، اک فردِ زیاں خامی لیے
مال کی ساری کھپت کا اک طرف چڑھتا گراف
ہر نفس کرتا ہوا سوداگری کو پختہ کار
ہر نفس بازار کی نبضِ رواں میں قیمتیں
کرچکیں ذوقِ خریداری کو فالج کا شکار
دور تک ہجرت زدہ محنت کشوں کا اک گروہ
تیر ترکش میں لیے ترکِ وطن کی چھاؤں کا
شہر و صحرا کی ہوا میں اک برہنہ پائی سے
موجِ خوں میں تیرتا پھرتا ہے کانٹا پاؤں کا

اک ترازو میں غمِ سود و زیاں تُلتا ہوا
رزق و فاقہ کی تپش سے خار سے کِھلتے ہوئے
شہر کے ویران گوشوں میں درختوں کے ہجوم
جس میں کوئے عافیت کے سائباں جلتے ہوئے

اس تغیّر میں جنوبی دائرے کی فصل پر
دور سے ہے سایہ افگن حیلہ جُو اک برتری
افریقا کے عاج و گوہر چور بازاروں کا مال
ایشیا کے مشک و عنبر پر ہے چھائی ابتری
ان کے آئل روٹ ان کی کشت ان کی روح تک
حفظِ نو ترکیب کے اک جال میں خوابیدہ ہے
ماہرانِ حال کا گرداں خطِ تقسیم کار
بے نفس خوابِ تہی دستاں میں بھی لرزیدہ ہے

فکر کے سب جادہ پیماؤں میں ہے اک نارسی
برتری کی رو میں اک موجِ فنا آثار ہے
اس تغیّر میں کہ پس جانے کو ہیں شمس و قمر
آدمی خود آدمی کے سامنے دیوار ہے

رزم گاہِ نو میں صف بستہ ہوئے سرخ و کبود
خندقوں کی ظلمتوں میں صبحِ نو کا خواب ہے
کس فضا کی کوچہ گردانِ جہاں لاتے خبر
منظرِ عالم ، غمِ تاریک کا اک باب ہے

آدمی کی نحیف ذات

آدمی کی نحیف ذات میں ہے
خود پسندی کی ایک سنگینی
یہ سمجھتی ہے اس کی خود بینی
اس کے دل کا اک آہنی استر
رزم گاہِ حیات میں ہے سپر
فردِ واحد وہ کائنات میں ہے

ناگہاں حادثات کی رَو میں
بول اٹھے جب ہوا کی گردش سے
دل کے اندر کسی ہوئی چادر
آگہی کے نشان کا پتھر

اک تصادم کی گھن گرج کے تلے
کچھ نہ باقی رہے دھویں کے سوا
ایک خوفِ دروں کی لرزش سے
زیست کے ممکنات کی رَو میں

دل کے اندر مہیب آوازیں
توڑ کر ہر حدِ سماعت کو
چند حیواں نژاد چیخوں سے
بے ثمر کرچکیں فراست کو
اس فضا میں نمود کی اک رَو
زیرِ داماں ہے کانپتی ہوئی لَو
زندگی کے لیے چُرائی ہوئی
دل میں روزِ ازل جگائی ہوئی
مثلِ سایہ قریبِ جاں آکر
اس تصادم کے درمیاں آکر
اس اندھیرے میں اک پناہ سی ہے
آدمیت کی اک گواہ سی ہے

وقت کے روئے تازہ کے مانند
اپنے حسنِ سکوت میں دہ چند
زندگی کی پری مثال لگن
اس کی بے خوابیوں پہ سایہ فگن
شمعِ بالین و شاخِ گل لے کر
عکسِ جزو اور مزاجِ کُل لے کر
سرِ مقتل محبتوں کا جنوں
جاں نثاری کی ساعتوں کا فسوں
ساعتِ وصل و جوئے عصیاں کو
روحِ عصمت فراقِ داماں کو
یک سخن ہو کے فرق تا بہ قدم
بوسۂ آخریں فراق کا غم
زخمِ بازو پہ صورتِ شبنم
آ کے سینہ فگار کرتی ہے
روح کو بے قرار کرتی ہے

۞

ہم کو تو جنوں بے در و دیوار ہوا ہے
صحرا کا سکوت اک لبِ گفتار ہوا ہے

اے شیشہ گرو نقش نما کس کا تصوّر
مینا و سبو میں لب و رخسار ہوا ہے

کل شہر کے آشفتہ بیانوں سے رخِ یار
آئینۂ فردا کا طلب گار ہوا ہے

وہ نیند سے پہلے بھی تو چونکا تھا مگر آج
اک موجِ تہِ خواب سے بیدار ہوا ہے

جی میرا تو صاحب نظراں اس میں لگا ہے
اور تم کو غمِ اندک و بسیار ہوا ہے

اک تازہ رخِ بزم کا اسلوبِ بدن بھی
کیا شاخِ گل و سلکِ گہر بار ہوا ہے

افسانۂ گل ، ذکرِ سبو ، قصۂ جاناں
ہر خلوتیِ خاص پہ دشوار ہوا ہے

کس رنگ کی یارب شبِ آسیب زدہ تھی
اک برق کا ٹکڑا جو عزادار ہوا ہے

کچھ گفتگوئے زیرِ لبی ان کے بھی آئی
نم اب کے جو کچھ دیدۂ خونبار ہوا ہے

لگتے ہیں کُلاہوں میں یہ مجنونِ ستم کے
کیوں خارِ مغیلاں کا خریدار ہوا ہے

شاید یہ خبر سچ ہے کہ جس نے تجھے دیکھا
آشفتہ ترا نرگسِ بیمار ہوا ہے

وہ ساعت صورتِ چقماق جس سے لَو نکلتی ہے
فضائے کہنہ کو تازہ رُخی سے خود بدلتی ہے

کبھی اک لَو سے ششدر ہے کبھی اک ضو سے حیراں ہے
زمیں کس انکشافِ نار سے یارب پگھلتی ہے

تغیّر کی صدی ہے آتشیں خوابوں کی پرکاریں
رصد گاہوں کے آئینوں میں اک تعبیر ڈھلتی ہے

نظر کو اک اُفق تازہ رُخی سے تیری ملتا ہے
وفا اس فاصلے کا راز پاکر خود سنبھلتی ہے

نگاہِ ناز سب رمزِ محبّت کہہ گئی آخر
خرد کی پردہ داری کیا کفِ افسوس ملتی ہے

لہو میں آپ جل اٹھتی ہے کوئی شمعِ خلوت سی
وصال انداز اُس کے خواب میں جب رات ڈھلتی ہے

روایت کی قناتیں جس ہوا میں جلنے والی ہیں
سوادِ ایشیا میں وہ ہوا اب تیز چلتی ہے

ورق اک دُھند کا تازہ تغیّر جب الٹتا ہے
تراشیدہ رخِ الماس سی اک لَو نکلتی ہے

اُفق ہے روشنیِ بے تلف کا
کوئی چہرہ جوانِ سر بکف کا

دلِ پُرخوں کی کوئی داستاں کیا
مگر ناوک فگن ایسے ہدف کا

بہت ہے ہم نشینو ساتھ ہونا
تغیّر میں کسی بینائے صف کا

جو آنسو بن کے ان آنکھوں میں ٹھہرا
کوئی موتی نہ تھا ایسے شرف کا

ہوائے وادیِ مجنوں عجب تھی
کوئی لوٹا نہ جا کے اُس طرف کا

وہ میرا ہم کنارِ ماہ رُخ بھی
بدن رکھتا تھا ماہِ بے کلف کا

اٹھا کشکولِ درویشاں سے آخر
اجالا سا چراغِ لاتخف کا

نذرِ غالبؔ

اے گردشِ جاں جب کوئی محور نہ ہوا تھا
پنہاں مرے دل میں کوئی خنجر نہ ہوا تھا

کس شام وہ کاکل سرِ عنبر نہ کھلی تھی
کس روز وہ رخ بادۂ احمر نہ ہوا تھا

پہلے تو مرے خوں سے کبھی طالبِ جوہر
اُس شوخِ دل آرام کا خنجر نہ ہوا تھا

کچھ مل تو گئے آئنہ دارانِ خط و خال
بے وجہ ترا خواب جنوں گر نہ ہوا تھا

کیوں در پئے آزار ہے یہ عالمِ ہستی
اس بات پہ برپا کوئی محشر نہ ہوا تھا

زنجیر کے حلقے سے اٹھا نغمۂ زنداں
یہ سازِ اسیری جو گراں تر نہ ہوا تھا

دنیا تھی کہ خود اپنے ہی اوصاف کی ضد تھی
کس آگ کے باطن میں سمندر نہ ہوا تھا

اک موجۂ گل موجۂ خوں تھی کہ بلا تھی
اس کا تو عنادل سا شناور نہ ہوا تھا

پہلے تو فقط عصمتِ بے نام تھی گل میں
افسانہ ترا ''بوئے گلِ تر'' نہ ہوا تھا

آئینِ ہم آغوشیِ جاناں کی نہ پوچھو
کچھ اس کا سبب بالش و بستر نہ ہوا تھا

سیّارہ نفس شب کے بکھر جانے کا عالم
آشفتگیِ دل کے برابر نہ ہوا تھا

نذرِ آتش

سر بکف چلیے اُدھر سر بہ گریباں چلیے
منتظر ہوگی کہیں مجلسِ یاراں چلیے

رقصِ مستی کا ہے عالم شبِ درویشاں میں
اک بگولے کی طرح شہر میں گرداں چلیے

بادباں چاک ، ستارہ سرِ افلاک زبوں
اب سفینے کا خدا خود ہے نگہباں چلیے

بِن بلائے تو نہ چلیے طرفِ لالہ و گل
اور بلائے جو درِ بازِ بیاباں چلیے

مہر و مہ عرصۂ شطرنج میں سرگرداں ہیں
نقشِ شاطر ہے عجب کیا کسی عنواں چلیے

اس جنوں زار ہوا میں کوئی منزل ہے نہ رخ
کیا یہاں لے کے چراغِ تہِ داماں چلیے

راس کم آتا ہے ہیرے کی طرح ان کا اثر
سانپ کا من ہے خرد بیچ کے ارزاں چلیے

تم نے دیکھا نہیں اس کو تو سمجھتے کیسے
میری باتوں میں ہے بے ربطیِ عنواں چلیے

بام و در شہر کے آسیب زدہ لگتے ہیں
دشت سے ڈھونڈ کے لاتے ہیں پری خواں چلیے

شہر میں پھر کوئی آیا ہے رسن بستۂ دار
بے کفن لاش پہ وا ہے درِ زنداں چلیے

درِ ممکنات

غروب ہو گئی دل میں وفا کی رات تو کیا
ملیں گے اور زمانے طلوع ہوتے ہوئے
ہزار عصمت و عصیاں کی چشمکیں لے کر
کسی نظر سے فسانے شروع ہوتے ہوئے

شبِ وفا میں کئی چاک دل سلیں گے ابھی
لباسِ تازہ غمِ عشق کو ملیں گے ابھی
لہو میں پھول سے خوابوں کے کچھ کھلیں گے ابھی

ابھی تو دار و رسن کی ہوائے جبر میں بھی
حریفِ تازہ نفس بے سپر چلے ہوں گے
ہزار بار ابھی جرمِ آگہی کے لیے
صلیب و دار کے بے نام سلسلے ہوں گے

بلائے دشتِ ہوا سے پکارتی ہے ابھی
سمومِ دشت طمانچے سے مارتی ہے ابھی
فسونِ عقل سروں سے اُتارتی ہے بھی

ابھی کھلے گا درِ ممکناتِ وقت کا ہاتھ
نقاب اٹھائے گا اشیا کی نیم خوابی سے
دھویں میں تھا جو غنودہ وہ سرِ ارض و سما
کسی اشارے سے پائے گا نو طراز قبا
ہزار شیوہ ہے عالم اس آئنے کو ابھی
ملے گا عکس کسی چہرۂ کتابی سے

سکوتِ حجلۂ رمزِ جہاں یہ کہتا ہے
ہزار سال ابھی ساعتِ وصال میں ہیں
ابھی تو طائرِ پر بستہ خود ہے ذوق طلب
عروسِ نو کہ نہیں آشنائے بوسۂ لب
رقیبِ بے سببی خود ہے اک کتابِ سبب
ابھی وصال میں انکار کی ہے عکس گری
ابھی جواب کے گوشے کئی خیال میں ہیں

ابھی تو جادۂ دریافت کی ہواؤں میں
تپش بڑھے گی — غمِ جستجو کی کوئی لکیر
مثالِ زخم تپکتی رہے گی خوابوں میں
نگاہِ تیز سے الجھے ہوئے حجابوں میں
ڈھلے گا اک غمِ فردا نئے حسابوں میں
ابھی یہ شک ہے کہ انساں کو راس آئے گی
یہ خاک داں کی اسیری ازل سے یہ تقدیر

طلسمِ خانۂ حاکم میں جستجو کی قبا
نظر نواز خط و خال کی تلاش میں ہے
ابھی گراں ہے غمِ آگہی کی تنہائی
نہ جانے کس کی یہ روحِ زمیں ہے سودائی
نحیف ذرّے میں مرگ و بقا کی یک جائی
کسی تلاش میں گرداں ہوئی ہے روحِ قیاس
نمود اپنے پر و بال کی تلاش میں ہے

شبیہِ تازہ کی خواہش میں جاگنے والو!
افق کی تازہ رخی مسلکِ نظر ہوگی
ابھی سے کیا قدِ بالا کی نخوتوں کا شمار

ہزار سال میں آتی ہے ساعتِ دیدار
کسی نگاہ کا طالب جمالِ روئے نگار
شعاعِ مہر کے مانند کوئی موجِ خیال
کسی لباسِ تغیّر میں نقش گر ہوگی

خوش آئیں دیدۂ آزردگاں کو اے غمِ دل
وہ ساعتیں جو کفِ جستجو میں پلتی ہیں
یہ زندگی یہ غمِ جاں یہ وحشتوں کا دھمال
دھویں کی اوٹ میں لرزاں سی کارگاہِ خیال
یہ عکس آئنہ خانوں میں جو فقط ہے مثال
کسی نگاہ پہ اُن ساعتوں کا رمز کھلے
جو خود نما سببِ زندگی میں ڈھلتی ہیں

وفا کی رات

وفا کی رات ترے بازوؤں کے حلقے میں
گزر کے ہجر کی شب بھی شبِ وصال بھی ہے
حساب ہائے جزا و سزا کی شورش میں
جواب بھی ہے محبّت کا اک سوال بھی ہے

ملا ہے ہاتھ کو ہاتھوں کی گرمیوں سے سخن
زباں پہ آئے ہوئے حرفِ تازہ تر کی طرح
ہزار رنگ میں محور ہے گردشِ جاں کا
شبِ وصال کی خود محویت میں تیرا بدن
طلسمِ آب میں مسحور ، نیلوفر کی طرح

وفا کی رات ترے بازوؤں کے حلقے میں
ہوئی ہے ختم تو تسلیمِ جاں کا راز کُھلا
کھلا کہ چہرۂ راز آشنا میں طلعتِ نار
جنوں کے سایے میں خاکستری بھی ہوتی ہے
وفا کی اک تپش آمادہ شب کی بے تابی
ہزار سلسلۂ خواب کو سموتی ہے

حدودِ بالش و بستر میں خود سنورتی ہوئی
جنوں میں روحِ محبت وہ رقص کرتی ہوئی
ردائے ہوش سے چینِ قبا سے بے پروا
خود اپنی ساعتِ عریاں کا تاج پہنے ہوئے
حصارِ شعلۂ جوّالہ سے گزرتی ہے

کُھلا کہ وقت ابد آشنا کناروں تک
دلوں میں دردِ محبت کے بیج بوتا ہے
مقام و وقت سے آزاد ایک بوسۂ لب
ٹھہر کے راکبِ دورِ جہاں بھی ہوتا ہے

اسی طرح ہے ابھی روحِ عشق تازہ نفس
محبتوں کے شجر کے تلے گلے مل کر
قدیم روحوں کے پرتو معاش کرتے ہیں
ہزار تشنہ لبی میں جلے ہوئے لمحات
سوادِ چشمۂ حیواں تلاش کرتے ہیں

لمحۂ گریز پا

بدن سفینۂ زرّیں سا فرق تا بہ قدم

قبائے اطلس و دیبا تھی بادباں انداز
ملا جلا ہوا طفلی و پختگی کا گداز
وصال و ہجر کی آب و ہوا کی محرمِ راز
اک اس طرح کی حسینہ چراغِ زندہ دلاں
دلیل و دید کی میزاں ، سراغِ زندہ دلاں
خود اپنے حسن سے کبرِ دماغِ زندہ دلاں

سفر زدہ و تلاطم نشاں سی حور لباس
خفا تو اپنی ہی کیفیتوں کی حد میں اداس
مزاج دانِ وفا ہو کے بھی زمانہ شناس
ہزار گوش زدہ حرف و صوت کی غم خوار
کبھی وصال کی سرگوشیاں کہ تازہ کار
کبھی ملامتِ تیرہ نفس کہ دل میں خار

لیے ہوئے سبدِ دل میں راکھ ہجراں کی
وہ خاک جس میں ہے تقدیس روحِ عریاں کی
لہو میں چلتی ہوئی رُو سی باد و باراں کی
وہ دُزدِ وقت سی ایک آدھ ناگہاں ساعت
کہ جس کی رو میں در آئی وہ صاحبِ خلوت
وہ ہم کنارِ وفا ، طائرِ سرِ خلوت

وہ خلوتی کہ تھی مہماں بہ طالعِ مسعود
وہ اس کا ایک فراموش کردہ گھر میں دُرود
مزاجِ عشق میں آخر کوئی زیاں ہے نہ سود

رہینِ رسم وفا ، خلوتی و ہرجائی
ہوائے عصمت و عصیاں و خیر و رسوائی
بس اک کرشمۂ دل کی ہے ساری یک جائی

گریز پا کوئی لمحہ بہ نامِ توشۂ عشق
وہی ابد وہی دورِ وصال و گوشۂ عشق

میر باقر علی داستاں گو کی مجلس

میر باقر علی داستاں گو کی مجلس تھی
دلّی کے شرفا
خواتین ذی جاہ
کشادِ سماعت کی خاطر کئی صاحبِ ذوق آئے ہوئے تھے
ادھر بزم شمعوں کی جھل مل سے اک بقعۂ نور تھی
اور ایسا اُجالا تھا اس جا کہ خود آفتابِ سحر آئنہ لے کے حاضر ہوا ہو
مجمروں میں ادھر عود و عنبر کے پیچاں دھویں نے
جاگتی آنکھ کو خواب کے بال و پر دے رکھے تھے
دو رویہ قناتیں تھیں اور چلمنوں کی سبک اوٹ سے جھانکتے تھے پری وش
وہ چہرے کہ خود جن کے پرتو کی عفت سے آنکھیں
آپ اپنے ہی ہونے کی تازہ دلیلیں بنیں

ہر نظر ایک پاسِ نظر چاہتی تھی
ہر نگہ ایک سلکِ گہر چاہتی تھی
میر صاحب نے مسند سنبھالی
اور شاہی سواری کے اک فیل کی داستاں
اپنے انداز سے کی شروع
اور فصاحت کے تازہ اُفق سے
اک شبِ ماہ سی ہوگئی تھی طلوع

صاحبو، بی بیو!
ہمارا تمھارا خدا بادشہ
داورِ لم یزل
وہ قہار و غفار و ستار
وہ رزّاق و جبّار ہے
روزگارِ جہاں گردشیں کھا کے اب کیا سے کیا ہوگیا
مگر آلِ تیمور جب اپنے جاہ و حشم میں تھی یکتا
تو دلّی کا وہ تاج دارِ فرشتہ صفت
جو سخن اور سخاوت میں یکتائے عالم تھا
اس کا اک فیل مست
شہر میں فیل خانے سے نکلا

اس کے دانتوں پہ سونے کے پتّر منڈھے تھے
جن پہ لعلِ بدخشاں کے گل باف خط کو
شجرہ ہائے نسب کے امیں
خود جلاتے تھے اپنے لہو سے
اس کے ماتھے کا جھومر رقیبانہ جھمک سی
اوجِ ثریا سے کرتا تھا
جلوس اس کا دمامہ و دف کی آواز
شہنائی قرنا کے رس میں چلا تھا
رقص و رم کا سماں تھا
جھومتی چال تھی
ایک نشّے میں اٹھتے قدم سے
بل زمانے کا نکلا تھا
پھول والوں کے میلے میں
جب بادشہ کی سواری نکلتی
تین صدیوں کی ساری روایت کا یہ جشن
اس فیل کی موجِ خوں میں
ایک طوفاں اٹھاتا تھا
وہ فاتح کے مانند
جس کے مقابل کہیں سنگ و آہن کی دیوار گرتی ہوئی ریت کا ڈھیر ہو

اپنے خوابوں میں خود ہی مگن

تیز چلتا

زر فشاں خاک ان رہ گزاروں کی وہ

منہ پہ ملتا

جانور بے خبر بھی نہ تھا

کچھ سمجھتا بھی تھا شہر کے انتظاماتِ نو کو

باغ در باغ

لال کُرتی میں گورے جوانوں کی سب بینڈ باجوں کی ساری دُھنیں

اس کے کانوں میں آتی تھیں

زہر سا کچھ پلاتی تھیں

لوگ کہتے ہیں دلّی کی جانب بڑھے جب فرنگی

اور تفنگوں کی آواز سے

گونج اُٹھی زمیں

اور ترازو تجارت کا کارِ سیاست کے حربوں کی ایک اوٹ ہونے لگا

لال قلعے کی اونچی فصیلیں

توپچیوں کا ہونے لگیں اک ہدف

سرنگوں ہوگیا پرچمِ آلِ تیمور

اور فضا میں در آئی وہ تنگی

سانس لینا بھی مشکل ہوا

شہرِ آباد

کچلا ہوا ہو گیا اک صدف

تو وہ فیل زنجیر توڑے ہوئے فیل خانے سے جنگل کی جانب گیا

شکستہ در و بام کا داغ دل میں لیے

اور برسوں انھیں جنگلوں میں وہ گھوما کیا

جہاں اس کے آبا کی ہیبت کا سکّہ جما تھا

وہ گھوما کیا

اور پھر ایک دن

شہر کی یاد نے جب ستایا

تو چنگھاڑتا ان بنوں سے نکل کر چلا

روندتا خار و خس کو

درختوں کو مسمار کرتا ہوا

بلندی و پستی کو ہموار کرتا ہوا

شہر کی سمت آیا

مسافت کا اک موڑ آیا تو دیکھا کہ چند آہنی پٹریاں سی بچھی ہیں

جو میلوں برابر چلی جا رہی تھیں

ادھر شہر پر تھا فرنگی کا قبضہ

شہر کیا ارضِ ہندوستاں ان کے قدموں سے پامال تھی

آئنہ بندیاں شہر کی سب نئی تھیں

قانون و زنداں

شکنجے و شمشیر و سنداں نئے تھے

پٹریاں ریل کی

شہر در شہر

جال سے خود بچھائیں

جنگلوں سے گزرتیں پہاڑی سرنگوں میں کھاتی ہوئی بل

ایک نبضِ تپاں کی طرح

دور میلوں کی وسعت میں پھیلی ہوئی تھیں

اس نے دیکھا کہ مدِ مقابل بھی اک آہنی فیل چنگھاڑتا آ رہا ہے

وہ کہ تھا باد و باراں کا پالا ہوا

جس کے اجداد کے استخوانوں میں تھیں جذب

جنگلوں کی سیاہی میں آتی ہوئی آندھیاں

اور سورج کی وہ آتشِ تیز جس سے زمینوں کے قلب و جگر جل گئے

ان زمینوں میں پالی ہوئی ساری نسلوں کا وہ بھی تو وارث تھا

صدائے تفنگ آشنا کان تھے

رزم آراؤں کی تربیت تھی

وہ تیروں کی بوچھاڑ میں بارہا

جا چکا تھا

نشاناتِ فتح و ظفر لے کے

آہنی فیل کو دیکھ کر اس کے غصے کی حدِ جلال آ گئی
اور گرز و تبر کی طرح
سونڈ اٹھائے ہوئے وہ
مقابل میں آیا
صف آرا قدیم و جدید ایک پٹری پہ تھے
اک طرف ایسی طاقت تھی
جو پاسِ شجاعت کی جاری رگ و پے میں جاتی ہوئی بھی
دوسری سمت
چالاک و سفّاک
ایجاد کی اک علامت تھی
اک سیہ فام انجن
کف در دہاں
عہدِ نو کے تحکّم کا اٹھتا دھواں
پہلی ٹکر سے وہ فیلِ شاہی لڑکھڑاتا ہوا نیم رخ سا ہوا
ٹوٹ کر گرنے والی چٹانوں کے مانند
لڑھکتا ہوا کروٹیں سی بدلتا
دوسری کی سکت لے کے اٹھا ہی تھا
کہ اک آن میں فیلِ شاہی
بیاباں کے دامن میں بے نام میّت ہوا

اس کے مبہوت سارے تماشائی مدّاح
اپنی بے چارگی میں فراست کی ہر تازہ کاری سے
منہ موڑ کر خود کھڑے تھے

صاحبو — بی بیو!
یہ افتاد کیا بس فنا و بقا کی یہ چوسر ہے
زمانہ ورق جب الٹتا ہے
بساطِ روایت لپٹتی ہے
ساز و ساماں نئے
حدیثیں نئی اور عنواں نئے
رد کیے اشکِ خونیں و چاکِ جگر کو
صاحبانِ زمانہ نئے اور درباں نئے
آ ہی جاتے ہیں

صاحبو — بی بیو!
ہمارا تمھارا خدا بادشہ
داورِلم یزل
وہ قہار و غفار و ستار ہے
وہ رزّاق و جبار ہے
مری داستاں ختم ہونے کو آئی

چراغ اب بڑھاؤ
سنئے داستاں گو
تازہ تر وارداتِ زمانہ کہیں گے
میں نے تاریخ کے تار و پو کو
اپنی موجِ نفس میں پرو کر
داستاں جو بُنی تھی وہ اب ختم ہے
وہ شبِ داستاں گو
جو اک جوئے حرف وسخن کی طرح
صبح تک باقی تھی تا بہ لب ختم ہے
گوشِ فردا کی خاطر
مری داستانوں کی شب ختم ہے

حذر کرو مرے دل سے

حریفِ ثابت و سیار، مشتِ خاک اے دل
ترے سواد میں تریاق و زہر کے چشمے
تجھی میں سایۂ افعی و شاخِ تاک اے دل

شبِ جنوں کا کتاں، ماہِ تاب کی گھاتیں
شگفتِ گل کی، درِ نیم وا کی سوغاتیں
سوادِ شہر و غمِ بے سوال کی راتیں
ترے خرابۂ کہنہ نفس میں آتی ہوئی
ہوا چلی بھی تو تیرا ورق جلاتی ہوئی

وہ خواب جن کے لیے تو تھا آبگینہ حصار
شکستہ پر وہ کنایے ہیں آئنے مسمار
وہ روحِ شک کہ کبھی تھی مثالِ طلعتِ نار
جلی بجھی ہوئی خاکستری قیاس میں ہے
کہ بود و باش محبت کی اس لباس میں ہے

پگھل کے کہنہ خیالوں کا جل گیا مسِ خام
فضا میں چاک تغیّر کے ہیں حریفِ دوام
ہزارہا رخِ آتش زدہ ہیں گام بہ گام
نفس کے حلقۂ زنجیر آفرینش ہے
بجھا کے شمعِ وفا محوِ داد و بینش ہے

ورق فلک کے زمیں زاد مشعلوں سے جلے
تھے معملوں کی بھی قندیلِ نیلگوں کے تلے
کھڑی ہے چہرے پہ خونابۂ حیات ملے
وہ جستجو جو خلش سینۂ وجود کی ہے
سوال بن کے طلب گار اک نمود کی ہے

مزاجِ ذرّہ و خورشید کارِ آتش و باد
ہوئے طلسمِ خلا میں سوال کی بنیاد

یہ رو ہے آپ خود آرا کہ پرتوِ ایجاد
کہاں سے یہ تپشِ مہر خاک تک آئی
نگاہ پردۂ محمل کے چاک تک آئی

گرہ کشا ہے فضاؤں میں ناخنِ تحقیق
سراغ میں ہے اک آغاز کے نگاہِ عمیق
مثالِ خلوتِ یزداں ہے جذبۂ تحقیق
یہ ارتقا جو کسی خواب کے طلسم میں ہے
اسیر اپنے ہی آداب کے طلسم میں ہے

رموزِ تازہ کے کیا سلسلے ہیں گام بہ گام
شعاعِ مہر کے ذرّاتِ بے نفس ہیں نیام
خرام اصل ہے یا عالمِ سکون و قیام
نظر میں ہر خطِ فاصل اک ارتعاش میں ہے
اک اعتدال کی روحِ نوی تلاش میں ہے

ہیں بے کنار اندھیروں کے درمیاں راہیں
زمیں تو کیا دلِ انجم میں ہیں دبی آہیں
مسافتیں ہیں نئی ، دُور آشیاں گاہیں

حصارِ نارِ بلا چیر کر نکلتی ہے
یہ زندگی ہے مزاجِ دِگر میں ڈھلتی ہے

خلا کی ظلمتِ دوشیزہ بے خط و تحریر
یہ چاہتی ہے ملے لعلِ آتشیں سی لکیر
کسی نفس کا گداز اور حلقۂ زنجیر
جو اس کو محرمِ رازِ درونِ خانہ کرے
کسی نظر کسی دریافت کا نشانہ کرے

وہ عہدِ گل وہ جنونِ وفا کی رات اے دل
ہزار خوابوں کی مشعل لیے جو نکلی تھی
بکھر گئی ہے بیاباں میں وہ برات اے دل

اب اور غم ہیں نئے مثلِ روئے دل آرام
جو چاہتے ہیں ملے آئنوں کو اذنِ کلام
غروب ہوتی ہوئی شمعِ انجمن کو سلام
شبِ وفا نہ سہی روزِ تاب ناک تو ہے
حسابِ شیشۂ ساعت میں تیری خاک تو ہے

❁

کیفیت اس کی قبا میں وہ قدِ بالا سے تھی
گفتگو ساحل کی اک ٹھہرے ہوئے دریا سے تھی

زاویے کیا کیا دیے تھے تیرے رُخ کو شوق نے
انجمن سی انجمن تھی اور دلِ تنہا سے تھی

جادۂ بے میل و منزل وقت کا اک خواب تھا
رہ گزارِ حال بھی ملتی ہوئی فردا سے تھی

وہ بھی سنگِ محتسب کی نذر آخر ہوگئی
روشنی باقی جو کل تک شعلۂ مینا سے تھی

ایک دنیا ذوقِ آرائش کا تھی ساماں جسے
گفتگو بھی تھی تو ایسے انجمن آرا سے تھی

جنبشِ دل میں کوئی صوتِ جنوں انگیز تھی
یا خرامِ یار سے یا جنبشِ صہبا سے تھی

صبح سے پہلے رخِ جاناں پہ جو رُوداد تھی
پھر نہ آئی جو شکستِ رنگ کی اِنشا سے تھی

سرمہ سا آنکھوں میں تھی جاگی ہوئی روحِ وصال
درمیاں اک ہجر کی شب رنجشِ بے جا سے تھی

عالمِ شب اس کی خوئے قرب کا کہتی رہی
وہ حکایت زلف کی جو نکہتِ رُسوا سے تھی

✿

بے تکلف مے کشوں میں تھی حریفانہ بھی تھی
چشمِ ساقی محرمِ آدابِ مے خانہ بھی تھی

کچھ تو پاسِ بام و در بھی چاہیے اہلِ فراق
اک الگ دنیا سی گویا بزمِ جانانہ بھی تھی

دستِ ساقی میں کہیں تھی ناکشیدہ سی لکیر
وہ بہ فالِ مے کشی اک خطِ پیمانہ بھی تھی

ہم تو وہ ہیں جس سے ملنا زندگی میں ایک بار
تا ابد پیماں کی شب —— تا حدِ افسانہ بھی تھی

شمع نے دیکھا لگن میں وقتِ خوش کے نام سے
ساتھ دیتی صبح دم کچھ خاکِ پروانہ بھی تھی

یہ مقامِ سجدۂ یک سہو ہے اہلِ حرم
محوِ تزئینِ حرم دیوارِ بت خانہ بھی تھی

اس سے آگے کیا کہیں ہم رمزِ آئینِ وصال
گفتگو کچھ مدّعا خواہی سے بیگانہ بھی تھی

تم تو اس کے بوسۂ لب سے بھی واقف ہو بتاؤ
کیا کوئی رَو جنبشِ لب کو رقیبانہ بھی تھی

آئنے کی بے نگاہی معتبر تھی ہم نہ تھے
بے گرہ بندِ قبا بھی ، زلفِ بے شانہ بھی تھی

زخمِ دل سے مرگ نے پائی یہ دادِ آخریں
درد میں مدّنی چمک تھی اور حریفانہ بھی تھی

کبود و سرخ کیا پرزے اڑا دے گی ہوا سب کے
نہ جانے کس قدر خوں ریز ہو دورِ بہار اب کے

نشہ داروں کی حالت مے کشوں میں بیٹھ کر دیکھو
نکل آتے ہیں مے خانے میں دو اک آدمی ڈھب کے

یہیں بیٹھے چراغِ ہفت کشور کر دیے روشن
دکھائے رُخ وہ درویشوں نے زندہ دارِیِ شب کے

اِدھر کی رَو اُدھر کرتے ہوئے کوئی زمانہ ہو
گئے خونیں کفن پیراک دریائے لبالب کے

مثالِ شبنمِ گل اُس کا ذوقِ ہم کناری تھا
ترشّح کی طرح سایے تھے اس کے بوسۂ لب کے

حدیثِ عندلیب و مار تھی اک قولِ مطرب میں
گل افشاں مرگِ ناطق ہوگئی تھی خاک میں دب کے

کچھ ایسی چرخیاں گرداں ہے جن کی آتشیں راہیں
زُحل بے رخ ہوا ٹوٹے ہوئے حلقے میں عقرب کے

وہ رنگِ حسن تھا یا بوسہ گرداں رات گزری تھی
سرِ بالش کُھلی زلفوں کے اندر قوس تھے لب کے

بگولے نام لے کر جن کا کل صحرا میں اٹھتے تھے
وہ سارے کارواں تواے جنوں رخصت ہوئے کب کے

نہ فاصلے کوئی نکلے نہ قربتیں نکلیں
وفا کے نام سے کیا کیا سیاستیں نکلیں

کھلی ہے وحشتِ عالم پہ آج کاکلِ یار
کچھ اور دورِ خرد تیری نسبتیں نکلیں

ہزار ہاتھوں کے سیلِ رواں کا مرکز تھا
ہوا کے ہاتھ میں نادیدہ طاقتیں نکلیں

فضائے تازہ نفس دلبری کی آتی رہی
نئی نئی غمِ دل کی مسافتیں نکلیں

شرارِ مہر و نمِ ابر کے تغیّر تک
وصالِ دوست میں کیا کیا نزاکتیں نکلیں

وہی کہ رنگِ رقیباں سے تیرہ تر تھی جو زلف
کل اتفاق سے اس کی حکایتیں نکلیں

کمندِ سارق و مارِ سیاہ میں آخر
یہ کس کا ہاتھ تھا یہ کس کی حکمتیں نکلیں

مزاجِ شک کو ہی اہلِ یقیں نہیں سمجھے
دماغِ کفر سے کیا کیا حقیقتیں نکلیں

نگار خانے کے نقش و نگار کچھ بھی نہ تھے
جنوں کی آنکھ میں غلطیدہ صورتیں نکلیں

سیاہ رات جہاں خندقوں میں روتی تھی
چراغ لے کے وہیں سے محبتیں نکلیں

وصال و ہجر سے کیا، عشق سے سنبھل نہ سکیں
تری نگاہ میں ایسی ندامتیں نکلیں

✡

بیتِ تازہ کی ہوا ، کوئے حریفاں کی ہوا
پیچ در پیچ چلی میرے گریباں کی ہوا

ایک دو نام تو ایسے درِ زنداں پہ ملے
سر پٹکتی ہوئی گزری ہے بیاباں کی ہوا

جب کسی تازہ تغیّر سے بدلتا ہے اُفق
تیز تر چلتی ہے کچھ جنبشِ مژگاں کی ہوا

تیری آنکھوں کے مد و جزر میں ہنگامِ وصال
قعرِ دریا کے گہر جنبشِ مژگاں کی ہوا

خاکِ دل ایسی حریفانہ کہاں ہوتی تھی
خود طوافی کو چلی قبلۂ ویراں کی ہوا

بوسۂ لب کے تلے نیند کو عریاں کرنے
خفتہ پا آئی ہے خوابِ رخِ جاناں کی ہوا

زندگی کیا ہے اسیری ہے کہ آزادی ہے
اک رخِ دام پہ رم خوردہ غزالاں کی ہوا

اُڑتی پھرتی ہے بہ، یک معرکۂ ریگِ سموم
خفّتِ چشمِ شہاں کحلِ صفاہاں کی ہوا

خلوتِ خواب کے دامن میں لیے لالہ و گل
روحِ بازار نہ بن خواب فروشاں کی ہوا

اے فروغِ زرِ موباف و ثباتِ کاکل
نام رکھتی ہے ترا زلفِ پریشاں کی ہوا

ہم کنار

وہ شب کہ خلوتِ جاناں کا اک سپاس ہوئی
گئی ہے بوسۂ لب ، حرفِ دلبری لے کر
اور ایک پیرہنِ نیم وا کی خوش بو میں
سپردگی کی ہوا ، رقصِ خود سری لے کر
ہمیشہ حسن کی اک خود پرست وحشت کا
گریز پائی میں اک رمز ہے محبّت کا

وہ تشنگی کہ جو تقدیر ہے دلوں کے لیے
مٹی کہاں ہے مگر اک فریبِ سیرابی
مثالِ طائرِ ہجرت زدہ ، کہ چشمے پر
اُتر کے پیاس بجھا لے بہ رقصِ سیمابی

اسی طرح کی تھی اک جوئے آب وصل کی رات
اک آبِ گم سرِ جاں انقطاعِ فصل کی رات

وہ شب کہ زلف سے الجھی تھیں انگلیاں کہ ملے
سراغ حسن کی رمز آشنا حقیقت کا
جو اپنے کیف کے پیچاں دھویں سے کرتی ہے
نظارہ برق صفت آپ اپنی وحشت کا
ہر ایک آنکھ سے پنہاں رسائی اس کی رہے
وہی ہو محورِ عالم — خدائی اس کی رہے

وہ شب کہ نیند کے کچھ تار و پو سے پیدا تھا
حریرِ خواب — سرا پردۂ خطا کے لیے
وہ اضطراب کہ اک آگہی تھا جسموں کی
وہ ساعتیں کہ تھیں، ملبوس مدّعا کے لیے
لیے کھڑی ہیں کسی آئنے کی حیرانی
گزشتہ وقت سے اک ہم کنار عریانی

مہمان

وہ ایک آمدِ مہماں کی ساعتِ نایاب
جو فصلِ تازہ بنی کشتِ میزبانی کی
درِ جنوں پہ ہری شاخ تھی جوانی کی
جھکی تو لکھ گئی دہلیز پر جنوں کا حساب
کھلی ہواؤں میں اک سرو قامتی کی کتاب

مکاں میں قاعدہ آیا تھا اُس کے آنے سے
جلا ورق غمِ نایافت کی سیاہی کا
مٹا فراق سا مہجور بے نگاہی کا
شکستِ دل کی بِنا تھی جو اک زمانے سے
گئی زبان کی لکنت اسی فسانے سے

وہ تازہ رخ وہ ملائم چمک ادھوری سی
جو ایک خواب کی شیشہ گری میں محو ہوئی
سپردگی میں ، کبھی خود سری میں محو ہوئی
عیاں تھی قرب کے اک زاویے سے دُوری سی
خود اپنے کیف کی جولانیوں میں پوری سی

وہ سوٹ کیس وہ اک باسکٹ پھلوں کی لیے
شگفتہ رُو — قدِ بالا پہ ایک سادہ قبا
قبا کہ جزو تھی اس کا — وہ بے ارادہ قبا
وہ سرمئی سی رِدا خاک دل جلوں کی لیے
دھواں سا ساری فضا کشتہ مشعلوں کی لیے

تھکن سفر کی تھی آرام کی ضرورت تھی
بجھا کے پیاس سی کافی کی ایک پیالی سے
در آئی نیند سی آنکھوں میں بے خیالی سے
سکوں کے وقفۂ بے نام کی ضرورت تھی
غروبِ مہر کو اک شام کی ضرورت تھی

ذرا جو جاگ کے کروٹ سی لی تو حیرانی
سوال بن کے فراغت نصیب لمحوں کی
جنونِ عشق سے اپنے قریب لمحوں کی
کھڑی تھی آئنہ لے کر دلوں کی نادانی
امانتوں پہ ہنسی وقت کی پَر افشانی

وصال و ہجر کی ، شکر و سپاس کی باتیں
کھلی گرہ جو کوئی گفتگو کی کھلتی گئی
اک آبِ صاف میں تقدیرِ وقت ڈھلتی گئی
حقیقتوں کی حکایت قیاس کی باتیں
شبِ جنوں کے رمِ بدحواس کی باتیں

پرانے قصّوں میں الجھی ہوئی سی کوئی بات
کہیں سے آئی ہوئی رَو سی بدگمانی کی
وہ فرق جس نے مزاجوں کی ترجمانی کی
گیا مزاجِ شب و روز سے قرار و ثبات
وہ فرق جس سے محبت نے کھائی اکثر مات

ضدوں کی رَو میں کوئی شک کی داستاں لے کر
لبوں میں حرف کی لرزش سی دل میں روحِ ملال
وہی فراق نما ارمغاں سا کیفِ وصال
پرانی یادوں کا بوسیدہ سائباں لے کر
چلی گئی اُسے اک گردِ کارواں لے کر

زہرِ عصیاں

سیاہ کاروں میں اک سرو قد حریفِ قرار
فراز دن کا جبیں رات زلف کی گفتار
بہ ناف و ساق کہ تھی آتشِ جنوں بہ کنار
لبوں پہ ایک سخن رس ہوا کا پیچ لیے
اک آرزو کی گرہ مدّعا کا پیچ لیے

خود اپنے رمز سے ناآشنا سی ایک نگاہ
مزاجِ سادہ تھا بیگانۂ سفید و سیاہ
کوئی نہ شوق کا محرم نہ دلبری کا گواہ
سراب سی حدِ عصمت میں ناؤ کھیتے ہوئے
سرشتِ حسن تھی خوابوں کی اوٹ لیتے ہوئے

حیاتِ نو کے بیاباں میں خواب کے ارژنگ
دمِ عقاب و کبوتر — غزال مست پلنگ
کبھی گریز کبھی ہم‌کناریوں کی اُمنگ
اک اضطراب کہ یہ سرِ دست و پا کیا ہے
یہ آرزو کی گرہ سی سرِ ہوا کیا ہے

وہ طائروں کی سی موجِ نفس میں آوازیں
رمِ ہوا ، ثمرِ نیم رس میں آوازیں
وہ تالیاں سی بجاتی جرس میں آوازیں
ہوائیں کان میں سانپوں کا رقص کرتی ہوئی
صدائیں دودھ کا پیالہ سا ایک بھرتی ہوئی

گزرتے لمحوں میں نقشے پیالۂ جم سے
قدم پہ اس کے تھے جادوگروں کے سر خم سے
ہزار رنگ کے عصیاں کے بل پہ پرچم سے
بدی کے حلقۂ ظلمت میں اک اشارہ سا
اُدھر بلاتا ہوا احمریں کنارا سا

کہیں سے عشقِ جنوں پیشہ ایسی ساعت میں
الجھ کے بستر و بالیں کی اک حکایت میں
پرو کے خارِ مغیلاں میں گل کو وحشت میں
جنوں میں زہر سا عصیاں کا نوش کرتا گیا
وصالِ دوست کو آئینِ ہوش کرتا گیا

سان فرانسسکو کی ایک شام

شناسا رُخوں میں
لکیریں سی کچھ اجنبیت کی کھنچتی رہیں
اور حفظِ مراتب کی چڑھتی ہوئی سیڑھیاں
اوٹ بنتی گئیں
کبھی بے زری جاہ و حشمت کے خانوں
کبھی سقف والوں کی آرائشوں اور کابک کے مانند محبوس کمروں میں
تاریکیوں کی

سارے پردے رُخوں سے اٹھے
شام ہونے کو تھی کہ
اک تیز و طرّار سا نوجواں
خوش مزاجی میں یکتا مرا راہ داں

اک پرانی سی بے حال موٹر میں آیا
جو اس کی منگیتر نے گرد و نواح کی مسافت کی خاطر خریدی تھی
شہر کیا
دور تک یہ بلندی و پستی کی پیچاں زمینوں کا
اک شہر ہے کوئی بستی ہے
اور چاروں طرف کی پہاڑی کے جو سلسلے ہیں
وہ پنجوں کے بل آ کے میدان میں
دوسری سمت اک جست کرتے سے لگتے ہیں
شہر کے یک فنی دستِ تعمیر میں ایک افسون ہے
مٹھیاں جس کی کھل کر مکانوں کو سارے نشیبوں میں پھینکے ہوئے ہیں
اور ذرا دیر میں پھر چھڑکنے چلی ہیں
پہاڑی کے ماتھے پہ افشاں کی صورت کہ یک بستہ ہو کر نشیب و فرازِ دل آرا
بلائیں، کہ آؤ
نوجواں گائیڈ کا یہ ارادہ تھا، یہ چاہتا تھا کہ
(وہ آیا تو یوں تھا) کہ گرد و نواح کی مسافت میں مصروف و خوش باش لوگوں کی
کچھ جھلکیاں سی دکھا دے
اک غمِ شہر میں ہیں جہاں آج پیوند
قلمیں کئی نسل کی یک زباں یک سخن
اس کی نوکِ زباں پر تھیں سب داستانیں

شہر، اکناف و اطراف کی ساری تاریخ کے رمز سے آشنا تھیں نگاہیں
زر کی کانوں، پرانی حویلی کی اک منٹ☆[۱] اور کوچ☆[۲] کی سب قطاروں کا مداح
کہنہ آثار ان بگھیوں کی جن کے گدّوں پہ صندوق سکّوں کا رکھ کر نگہباں
خزانے میں لاتے تھے

شہر کا یہ تعارف تھا
''یہ ظالم تریں شہر ہے''
اس علاقے میں جب زر کی کانیں ملیں
تو چینی یہاں اک غمِ رزق لے کر چلے آئے تھے
چین سے کھیپ کی کھیپ آئے ہوئے سارے مزدور
اک دوسرے کو حسد سے
چھری مارتے، قتل کرتے کہ اک دوسرے پر اسی بات سے کوئی سبقت ملے
مگر زر کی آنکھوں میں سبقت کہاں مل سکی ان کے بہتے لہو کو
داد و دانش سے سیراب لوگوں کی صف میں
پری پیکروں کے سبک سایے تھے
دلبری ایک ماہیِ زرّیں کے مانند پیراک تھی موجِ خوں میں
اور بالا قدانِ گل اندام کی شامِ غوّاص
تہِ آب کچھ آرزوؤں کے پودوں پہ سایہ کناں تھی
مگر اس فضا میں لکیریں سی کچھ اجنبیت کی کھنچنے لگی تھیں

☆۱- Mint
☆۲- Coach

شناسا رُخوں میں

زندگی کی تہوں میں جو شط تھے دکھوں کے — کھلے

جو سرِ آب تھے ذات کے

آبِ شفاف و شیریں کے چشمے جو پھوٹے تھے سنگِ بدخشاں سے

اور ناقص زمینوں کی ذرّات کی ناکسی میں

غنودہ جو گندھک کے سوتے تھے

آخرا بلنے کے خواہاں ہوئے

متفق ہو نہ پائی کسی رنگ میں

کیمیا (کچھ) مزاجوں کی

شناسا رخوں میں

لکیریں سی کچھ اجنبیت کی کھنچنے لگیں

ختم محفل ہوئی اور ہواؤں کے گرداب میں پرانی سی موٹر بھی گھومی

گھر پہ تھی منتظر اک حسیں، چاق چوبند لڑکی جو اس کی منگیتر تھی

اسی شہر آباد کی وسعتوں میں

(کچھ اسی شہرِ ہنگامہ پرور میں وہ ساعتیں بھی تو آئیں تھی جب دستخط سب

بڑوں کے ہوئے)

ایک اعلان نامے پہ عالم کے

شہر اٹلانٹک چارٹر کا محافظ

امنِ عالم کا اک سائباں تھا

ساعتیں گھومتی سوئیاں

فصلِ افسانۂ روز و شب بابِ عشق و ہوس

سیر گاہوں کا افسوں لپٹا رہا گفتگو میں

سارے بیدار الفاظ جاگے تو ذہن ایک تعبیر سے بن گئے

دور کی منزلوں سے پلٹتے ہوئے

شام میں فلیٹ کے سلسلوں سے گزر کے جو اک دوسرے کے تعاقب میں تھے

ایک ایواں میں ہم لوگ پہنچے

گل و یاسمن کی ہوا کے سوا

اجنبی چپکے دیوار و در کے لیے تھا

دھواں

''دل سے (اٹھتا ہے) یا جاں سے اٹھتا ہوا''

میزباں اور مادام

شائستگی تھے مجسّم

بلوریں پیالوں میں مے — لب پہ اک حرفِ تازہ لیے

کچھ ریسیپشن کا احوال کہتے ہوئے اک اداسی سی لڑکے کے چہرے پہ چھائی تو

لڑکی نے ہنس کر کہا

جانِ من ایک دن

ہم بھی اپنی نظر — اپنے خوابوں سے دیوار و در کو مزیّن کریں گے
کتابیں، متاسی☆ کے اسکیچ، یونانی پیالے
اساطیر ساماں جو ہیلن، کے اور ٹرائے کے نقش بردار ہوں، گے
وہ طاقوں پہ رکھیں گے

ہاتھ شانے پہ رکھ کر کہا

اب چلو

اس کی آواز میں ایک نرمی تھی

مرہم تھا

ایک سرِ نہاں تھا جو دل کو ملاتا ہے دل سے

میں بھی اک بوسۂ الوداعی لیے واں سے اٹھا
اسی سوچ میں گم کہ ہر خواب سے اک حقیقت کی جانب جو اک سنگ دل رہ گزر
پر کہیں ایک پُل ہے
اگر اس کی معمار عورت نہ ہوتی تو یہ زندگی اک بے نام خندق میں گر کر
غمِ مرگ ہوتی

☆۔ معروف مصوّر

تازہ تر آہنگ

ہم کناری کی ہوائے نرم میں کھوئے ہوئے
زیرِ لب اس نے کہا کچھ موجِ بے تابی نہیں
چشمۂ حیواں میں کوئی روحِ سیرابی نہیں
دشتِ غم میں کھو گئے ہیں کتنے دریائے وصال
ایک دن تو کوئی روحِ عشق سے کرتا سوال
اے ابد پیوند سفّاکی ہے تیری بے مثال
تیرے قدموں سے لرزتا ہے سوادِ آدمی
کس ہوا کا نام ہے بادِ مرادِ آدمی

دل زدوں کی خیر، تیرے تازہ ویرانوں کی خیر
شہر کی دیوار و در میں تجھ سے ویرانی کی لاگ

دشت کی موجِ سراب آسا میں جولانی کی لاگ
تو غمِ منزل کا پردہ ، خوابِ نو کا ارتعاش
کب سے اس نیرنگِ عالم میں ہے تو جادہ تراش
تیرے آئینے رخِ تازہ کی کرتے ہیں تلاش
کون سا غم ہے ، غمِ فردا ، غمِ ادراک ہے
تیرے نخچیروں سے پُر کیا کیا ترا فتراک ہے

مہر بر لب ، مجرمِ تنہا تھا عشقِ بے کتاب
دردِ مہجوری سے تھا ، سفّاک تر روئے سوال
اس نواحِ غم میں بھی جاری تھا ، کوئی رقصِ حال
بول اٹھے ، اندک و بسیار کے خوابیدہ جن
بستیوں کے نیم جاں تاریک دل دُزدیدہ جن
جابروں کے غیظ کے پالے ہوئے نادیدہ جن
رزم گاہِ دل میں نیک و بد کی اک پیکار ہے
آخری سمجھو کہ عشقِ بے سِپر پر وار ہے

یاس کی ظلمت میں ہے ، مجروح آئینِ ثبات
اک ہجومِ شہر کی ناطاقتی ہے جال میں
آگیا پایے شفا ، زنجیرِ ماہ و سال میں
سخت جاں بیماریاں گونگی ہلاکت کی سفیر

اک نہ اک سلکِ گہر پُرہول دلدل میں اسیر
آئنوں کے رخ پہ ہیں بگڑے ہوئے چہرے حقیر
راستہ روکے کھڑی ہے اک جنوں خانے کی رات
ہوش کی اک قیمتِ آخر پہ دیوانے کی رات

مے کدے کے در پہ اک بوڑھا گدھا محوِ خروش
نوجواں مالک کی بانہیں ہوگئیں گردن کا ہار
کہہ رہی ہیں تیری محنت کے ہیں ہم بھی سودخوار
کچھ قصائی ، چند مکرانی ، شرابی بے نشاں
جن کے چاقو کھل رہے ہیں قہقہوں کے درمیاں
تازہ دم طبلِ بیاباں کی طرح جن کی زباں
خار و خس کے ڈھیر میں ، چقماق کے مانند ہے
ظلمتوں میں ، شعلۂ آفاق کے مانند ہے

شہر کے تازہ دموں میں جاز کے آہنگ سے
ہمدمی کی کیاریوں میں روحِ فردا کے نہال
زہ کمانیں جسم کی ، بے خوف لمحاتِ وصال
اک تغیّر خفتہ پا ، دلاّل سے بیگانہ وار
رقص و رم میں صد شکستہ ہو کے عشقِ تازہ کار
بوسۂ لب سے بھی کرتا ہے غمِ جاں کا شمار

اک درِ بازِ تغیّر ہے — وہ حد ہے زندگی
ریزہ ریزہ ہو کے ، مینائے ابد ہے زندگی

ایشیا کی قدِ آدم گھاس میں لپٹے ہوئے
موئے آتش دیدہ بام و در ہیں خود اپنے گواہ
سارق و قزّاق ہیلی کوپٹر میں اک سیاہ
درد کے اعشاریوں میں اک حسابِ روزگار
ناکشودہ اک گرہ زلفِ اجل کی بے قرار
ناخنِ عقدہ کشا جل جائے وہ ترکیبِ نار
آتش و آہن میں ہے اک اضطرابِ زندگی
تازہ تر ہے کچھ گِلِ آدم سے تابِ زندگی
کارِ عالم ہے تغیّر کے ہزار اوراق میں
درد کی تازہ مساواتیں ہیں تحریریں ہیں اور
اور ہی کچھ ہے رمِ ذرّات زنجیریں ہیں اور
دامِ صد آہن گراں میں ہے عقابِ موجِ دُود
کیمیائے نو کا طالب خود ہے آئینِ وجود
کہنگی سے سرگراں ہے آئنہ گاہِ نمود
عشق کا چاکِ گریباں رہن رکھ کر کائنات
اک ہوا سے لے رہی ہے خود کلیدِ ممکنات

بے عناں ذرّات کی تازہ روی کا دور ہے
ماہرِ جادو نفس نے کسوتِ ایّام سے
خاکِ صد آثار پائی ، انجمِ بے نام سے
زندگانی نے تراشے نقش ہائے رنگ رنگ
جاگ اُٹھی خاکستری ذرّوں میں روحِ شعلہ رنگ
آشتی کے دامنوں میں پل رہی ہے خوئے جنگ
کون محرم ہے شعاعِ مہر کی رفتار کا
شعلۂ تادیب تک پردہ ہے اک دیوار کا

جستجو کے اک ہلاکت آفریں جنگل میں ہے
آگہی کی منزلِ نو امتحانِ بال و پر
ایک ہی ہنگامِ پیدائی میں ہیں کِرم و ثمر
خاک میں اشکالِ نو کے غم جگاتی ہے ہوا
نصب میزانوں پہ اک پردہ گراتی ہے ہوا
عشق کے کہنہ لبادوں کو جلاتی ہے ہوا
درمیاں بڑھتا ہوا بے میل و بے فرسنگ ہے
انجم و ذرّات کا اک تازہ تر آہنگ ہے

قد تھا اس کا سروِ سہی کا رخ شمعِ کافوری کا
کیا کہیے اب ذوقِ نظر کو سحر تھا اک مجبوری کا

تم تو ملے بھی ہم سے یوں تھے جیسے ہو رہ گیر کوئی
آتی جاتی پرچھائیں سے کیا قصّہ مہجوری کا

اس کافر کی چتون میں تھی ایک رمیدہ خوبی سی
آنکھوں نے اک بن دکھلایا کالے کوسوں دُوری کا

کوئی بتاؤ رمز یہ کیا ہے ہر ذرّے کی گردش میں
صید کا اک صیّاد سے رَم ہے یا رقصِ منصوری کا

پہلے اُس کی خود نگہی تھی محور ہم سے کھنچنے کی
اور اب کوئی وصل کا پیماں باب ہوا رنجوری کا

طینتِ نار تو شر میں اپنے اپنے وجود کی شاہد تھی
لذتِ چاک و رفو کو نہ پہنچا تار قبائے نوری کا

سکوتِ شب کو غزل خواں کہو کہ نیند آئے
جنوں کو سلسلہ جنباں کہو کہ نیند آئے

سرشتِ خاک ہے تخلیقِ بسترِ اضداد
بہم ہے عصمت و عصیاں کہو کہ نیند آئے

شرارِ جستۂ ساعت کی تاب ناکی کو
ستارۂ سرِ مژگاں کہو کہ نیند آئے

ضمیرِ سنگ کو شائستۂ خراد کہو
فسونِ لعلِ بدخشاں کہو کہ نیند آئے

رفوگرانِ جنوں کیا دلیلِ سوزن و تار
حدیثِ چاکِ گریباں کہو کہ نیند آئے

وفا کی قسطِ پریشاں ہے یہ اڑی ہوئی نیند
اک اور قسطِ پریشاں کہو کہ نیند آئے

کبھی کبھی یہ حریفِ زمانہ ہوتی ہے
حدیثِ جنبشِ مژگاں کہو کہ نیند آئے

رخِ نگار ہے مانندِ شیشۂ حلَبی
چراغِ مے ہے فروزاں کہو کہ نیند آئے

جنوں نواز کھلونوں کے ہر تغیّر کو
دکانِ خواب فروشاں کہو کہ نیند آئے

ہوا ہے روحِ زمستاں سے محوِ سرگوشی
اسی کو رمزِ بہاراں کہو کہ نیند آئے

خرابِ بوسۂ جاناں ہلاکِ جادوئے یار
مجھے کہا ہے کہو ہاں کہو کہ نیند آئے

✿

نشانِ جادۂ پُرخوں مرے صلے کا بھی تھا
چراغ دشتِ بلا میں وہ قافلے کا بھی تھا

اساس ضد تھی مگر تجھ سے ایک ربطِ نظر
فرازِ خود نگہی کے معاملے کا بھی تھا

سپاس پا کے جنوں سے نہ دب سکا آخر
وہ شور جو مری زنجیر میں گلے کا بھی تھا

نشاطِ وصل و ہوائے بہار کی رَو میں
حساب خارِ مغیلاں کے مرحلے کا بھی تھا

خدا شناسی میں اک رنگِ وسعتِ مضمر
رخِ صنم کے تصوّر کے مشغلے کا بھی تھا

مرا وہ شوق کسی بے طلب کو دے یا رب
جو رزم گاہ میں تنہا مقابلے کا بھی تھا

سوادِ مہر میں گرداں ہوئیں رصد گاہیں
زمیں کی روح میں اک سوز حوصلے کا بھی تھا

وہ ایک رمز جو پایا تھا خوئے آدم نے
اک ابتدائے محبّت کے سلسلے کا بھی تھا

مرے لہو میں تھا آہنگِ انجم و ذرّات
تپش تھی قرب کی اک ربط فاصلے کا بھی تھا

اُسی ہوا میں ، تغیّر کے موڑ تھے جس میں
پیام بوسۂ جاناں کے سلسلے کا بھی تھا

شکستِ دل سے کئی خواب آشکار سے ہیں
ابھی وہی غمِ فردا کے پردہ دار سے ہیں

خزاں نے بھی تو کچھ ایسے دلوں میں جا پائی
جلے ہوئے جو بہت آتشِ بہار سے ہیں

وہ ایک قرب کی لذّت جو نارسا بھی نہ تھی
اسی میں ہجر کے لمحات بے کنار سے ہیں

بلائے دشت ہی کیا کم تھی طائروں کے لیے
کئی عقاب سے سایۂ سرِ غبار سے ہیں

ابھی تو قالبِ نو ساختہ سے چہروں پر
ضدوں کا ایسا دھواں ہے کہ مستعار سے ہیں

وہ قافلے کہ جو اجراسِ نو کے محرم تھے
خود اپنے ثقلِ سماعت کے اب شکار سے ہیں

سمومِ دشت نے دامن جلا دیا ہے تو کیا
جو رہ سپار تھے صحرا میں رہ سپار سے ہیں

پریدہ رنگ رُخوں سے شکستِ مینا تک
وہ آئنے ہیں کہ لرزاں غمِ بہار سے ہیں

گھری ہوئی ہے ابھی ان میں روحِ آزادی
فریبِ جادہ و منزل کا جو حصار سے ہیں

تعبیرِ جنوں کیا تھی غمِ سرِّ نہاں کیا
سب خاک ہوئے آگ کی لَو کیا تھی دھواں کیا

مانا کہ ہے تاریخِ نمو پردۂ گل میں
اک میّتِ بے نام نہ تھا برگِ خزاں کیا

اس راہ میں ہیں خاک بسر خود مہ و خورشید
اے دل غمِ منزل ہے بہت تجھ پہ گراں کیا

کیا نرم ہوا تھی جگرِ سنگ میں اُتری
اُن نرم مزاجوں کا کریں تم سے بیاں کیا

کچھ سیکھ لیا ٹوٹے ہوئے دل سے خرد نے
اس ظرفِ شکستہ نے بھی پائی تھی زباں کیا

جاں دادۂ مقتل کو ، شہیدانِ وفا کو
اک شیشۂ ساعت کے سوا شیشۂ جاں کیا

اُس کوچے کے خوش فکر یہ کہتے ہوئے نکلے
صاحب یہ گزرگاہ ہے بیٹھے ہو یہاں کیا

یاد کی ساعتیں

یاد کی ساعتیں نیم گرداں رہیں
درد کے خط پہ رُکتی ہوئی سوئیاں
خواب کے سے دھویں میں فروزاں رہیں

تیرا پرتو لیے ان شب و روز میں
رک گئیں ساعتیں، قطعۂ ہجر میں
ڈھل گیا وقت اک آہِ دل سوز میں

نیم وا در پہ پرچھائیوں کا سراغ
زاویے وصل کے شمعِ بالیں کی رَو
اک تعاقب زدہ پیچ دودِ چراغ

خانۂ دل کی اک اپنی تقویم ہے
اس کا اپنا ہی پیمانۂ وقت ہے
کس سے کہیے کہ کیا اس کی تقسیم ہے

نیو آرلینس میں، بَردہ فروشی کا مُہر زدہ نیلام گھر

یہ بَردہ فروشی کے نیلام گھر کی جبیں
برف و باراں میں
دورِ تمازت میں
کج مج لکیروں کے بارِ گراں سے پشیماں
موسموں کے جنوں کا ہدف
خوشہ چیں
سرنگوں ہے ندامت سے
نیلام گھر جس پہ کندہ عبارت کہن سالیوں سے شکستہ
ضعیفی میں یادِ جبش سے ہراساں
سیہ فام خستہ کے مانند
پشتِ خمیدہ سی رکھتی ہے

عجب یاں کے صبح و مسا

گاہکوں کی طلب میں

منزلِ نارسیدہ سی رکھتی ہے

عمارت علامت تھی آقاؤں کی برتری کی

زرخریدوں پہ احسان کی

ایک طغرا تھی سرمایے کی شان کی

عمارت، یہ نیلام گھر آج چاروں طرف سے مقفّل ہے

خاموش ہے

دبیز ایک چادر میں گم گشتہ تاریخ کی

قصّہء دوش ہے

اس کے لکڑی کے ڈائس کٹہروں کی بے رُو فضاؤں

سے لپٹی ہوئی

اک مُعلّن کی آواز رُو پوش ہے

یہ آواز کہتی ہے:

''یہ قسطِ اوّل ہے

یہ ہے دوم

اور یہ قیمتِ آخریں پر

تراشا ہوا جسم

اک ہزار

ایک سو ڈالروں میں
خواتین اور صاحبو!
اک ہزار
ایک سو ڈالروں میں!''

یہ فضا آج خاموش ہے
کل اسی کی سحر میں خریدار تھے
جھانجھ میں وہ نشوں کے
قدم جو اٹھاتے تھے
دورِ فلک ساتھ چلتا تھا
سرخ انگارسی نسل کے سرکشوں کو
صف بہ صف نوجوانوں کا اذنِ خرام
رقص ورم میں بدلتا تھا
گھومتے چاک پر وقت کے
نیم شب کی فضا
کچھ چراغوں کی لَو اور رُخوں کا پسینا پروتی تھی
تیز ٹینگو کے گرداب میں
کشتیاں جسم کی ڈوب جاتی تھیں
ادھ کھلے بادبانوں کو پیوستہ مستول سے کاٹ کر
نیند کے ساحلوں پر کہیں صبح ہوتی تھی

اجنبی اور شہری جب اٹھتے تھے
ڈونیٹ کیک اور کافی کی پیالی سے کچھ تازہ دم ہو کے
آنکھوں سے نیندوں کے جالے اتارے ہوئے
موسم وکشت وبازار پر محوِ گفتار تھے
نرخِ اشیا کے دامِ بلا خیز میں
خود گرفتار تھے
یہیں کچھ غلاموں کنیزوں کی اک کشتِ تازہ لیے
پرورش گاہ سے دُور کی بستیوں کی
جہاں نرسری نسل در نسل اُن کے اُگانے کی تھی
ان کے آقا، نگہباں، محافظ
قافلے کچھ سلاسل زدہ طوقِ گردن سے آراستہ
لے کے آتے تھے
جسم کے ناپ اور تول کی یہ دکاں
پوستینوں میں
اعضا میں
اصیلوں کے شجرہ ہائے مُصفّا میں
خطِ استوا پر جلائے ہوئے نیلگوں چہرہ ہائے دخّانی میں
پیوند رنگوں کی میزان میں
آپ اپنا تھی روزِ حساب

ان کی جلدوں کے داغ
ان کے عُریاں بدن آزمائش کے کانٹوں پہ تُلتے تھے
اور بکارت بہ طبّی اساس — خریدی ہوئی آبرو تھی
صُلب و بطن وجنین
بار آور ہیں کتنے
صیرفیوں کے تیزاب میں
ردّ وکد کے سرِ آب میں
پُشت ہا پُشت تک آپ دُھلتے تھے
رمزِ اعضا پہ اک گفتگو تھی
پہلے یونان وروما کے صاحب نظر بھی
بِنا اپنی تہذیب کی
ساری آسائشوں کی
غلاموں پہ رکھتے تھے
فرصتِ فکر کے مدّعی تھے
اور رخسارِ حکمت کا بوسہ تو گھٹّی میں ان کی پڑا تھا
تازہ میووں کے طشت
اور بِریاں پرندوں کی قابوں سے سیراب ہو کر
حرفِ تازہ کی بنیاد

فرصت کی شاموں پہ رکھتے تھے
یہی ان کی خو تھی
عرب جن کے دورِ تسلّط نے تہذیب کو رُخ دیا
جن کے بازار میں داستانیں تھیں بردہ فروشی کی کیا کیا
قافلے تھے غلاموں کنیزوں کے ٹھہرے ہوئے کچھ
سبا و یمن اور بغداد میں خیمہ زن
لب کشا
شہرزاد
شرق کی داستاں گو
نکل آتی ہے شب کو گلیوں میں
ایک مدّت ہوئی
مسترد ہو چکی رسمِ بردہ فروشی
اور لنکن☆ نے جمہوریت کو دیا پیرہن موجِ خوں کا
اس سے چھپایا یہ داغِ سرِ رہ گزر
کام آتا رہا آدمی کے
اک حریفِ جہاں تاب نا کی کا ننھا شرر
تیرگی میں
سلسلہ بن کے سوزِ دروں کا
اب وہاں سرگراں روحِ آزاد ہے

☆۔ امریکا کا سابق صدر

رہ گزر پر سفید و سیہ ہیں خراماں
اب کمن بر کوئی قومِ برتر کا زنگی کے ہم راہ نکلے
وہ امتیازات کے خط کو روندے ہوئے آج
چلتا ہے
پھر بھی جیسے اوتھیلو کوئی اپنے انجام سے بے خبر
چل رہا ہو
رنگ کی آگ میں جل رہا ہو
جو اک مملکت اپنی حکمت کے آئینہ خانوں میں
بے عناں طاقتوں کا ہے چشمہ
(یہاں) نسلِ زنگی جو آباد ہے
آج ساری کپاس ان کے سایے میں اُگتی ہے
سقف و ایواں پہ چسپاں
سلیب☆ جو کرینیں اُٹھاتی ہیں
ڈیم کے آہنی سب ورق
کارخانوں میں جو ڈیٹرایٹ کے ڈھلتی ہیں
وہ ساری آٹو
ان کے ہاتھوں کا جادو ہیں
چند پیشوں میں ان کا کمال
آپ اپنی مثالوں سے بالا ہے

☆ - slab

ان میں وہ یک فنی مرد ہیں
باکسنگ میں چٹان
وہ معتوب اندھیرا جو ہے پشت پر کب سے سورج کے
وہاں سے نکالی ہوئی ایک سِل
یہ بدن بے زباں
عرض بازو کا ہیبت اثر
وزن مُکّے کا رستم کے گرزِ گراں کی طرح
عالم آرا ہے
ان کے مجروح ناموس نے
جنبشِ کلک سے شعر و ناول کی دنیا بھی آباد کی
روٹس☆ کا ہر صفحہ کہہ رہا ہے کہ ہم بھی یہاں ہیں
مگر کون ہیں
ہم کہ ہیں اس صدی کی وراثت کے حامی
سرخ و سیہ آریائی و زنگی
زرد مٹیالے رنگوں میں تقسیم
چینی و سامی
ہم نے دیکھا کہ اب آدمی چاند کی ریت پر ایک
نقشِ قدم چھوڑ کر آ گیا ہے
اور جغرافیہ مشتری کا بیاں کرنے والا ہے

☆۔ ایلکس ہیلے کا ناول

خود بیٹھ کر معملوں میں

ہم نے دیکھا کہ روئے زمیں پر

سوکھ کر قحط سے چھاتیاں ماں کی، کانٹوں کا

گچھا ہوئیں

شیر خواروں کی خاطر

مگر آئنے نصب ہیں کچھ ستاروں کی خاطر

کوڈ میں کہہ رہے ہیں دبیرانِ عالم

یہ لیزر کی نوکِ سناں

یہ مزائل

مبارز طلب انجم آثار سی چرخیاں

اب جلا دیں گی یہ سبزہ و گُل

فاختہ و کبوتر

خواب کے پرنیاں کو جلا دے گی اک اہرمن تیرگی

بے لباسی میں اک طلعتِ نارَسی

ساری تہذیبِ عالم کی اُڑتی ہوئی راکھ سے آئے گی

ایک ہُو کی صدا

اس رَباطِ کہن کے دھوئیں میں

کروڑوں برس میں حدِ زندگی تک یہ آئی ہوئی وقت کی رَو

اندھیرے میں کھو جائے گی

تو لکھتا ہے اک عصرِ حاضر کا دانا☆ مؤرّخ

ایسی اک ساعتِ صفر میں

افریقا کے کسی تیرہ و تار گوشے میں

معبدِ رُوحِ اسرار میں

جادو ٹونے سے کھینچے ہوئے دائروں میں

دَہکتی ہوئی آگ کے گرد کوئی قبیلہ

نشانوں کی گونگی زباں میں

کاسۂ سر میں چاول لیے

پھر سے تہذیب کی ابتدا کر سکے گا

☆۔ آرنلڈ ٹوائن بی اپنی کتاب Civlization on Trial میں

بوربن اسٹریٹ، نیو آرلینس کی ایک رات

(جاز موسیقی کا تاثّر)

میسی سی پی کی موجوں سے دامن کشاں رات
جب شہر کی سمت آتی ہے
نم کفِ پا وہ ذرّوں کی آنکھوں پہ رکھتی ہے
ان کو جگاتی ہے
سحر آسا
غنودہ سی پرچھائیاں
فرنچ کوارٹرس کی گلیوں میں بکھری ہوئیں
آتشِ مہر سے ہم بغل
کچھ سیہ فام سی وقت کی جھائیاں
کہنہ سقف و ستوں سے نکلتی ہیں

جاز کی یہ ولادت گہِ تازہ ساماں
یہی شہر ہے
ایک آہنگ کے جال میں طائرِ بال افشاں کی صورت
کتنے صوت و صدا کے بھنور سے ہواؤں میں پڑتے ہیں
چکر لگاتے ہیں
فرانس، ہسپانیہ کے گزشتہ امیروں کے ساکت محلکوں کے فانوس گردش
میں آتے ہیں
شہر کی شمعیں آنکھیں سی ملتی ہیں
کہنہ دیوار و در سے جو سرگوشیاں کر کے سوئے ہوئے تھے
وہ زنگی سیہ فام خوابیدہ سایوں میں بڑھتے ہیں
اور نغموں کی ٹوٹی ہوئی نرد بانوں کو جوڑے ہوئے
ان محلکوں پہ چڑھتے ہیں
مزامیر آشفتہ سر جاگ اٹھتے ہیں
ساز و طنبور کی اک گلوگیر رم خوردہ لے سے شرارے چٹکتے ہوئے
اوٹ سے اک دھویں کے ابلتے ہیں
اور نغمہ گروں کے افق تازہ تر جاگ اٹھتے ہیں
جوار بھاٹا کے مانند نبض و نفس میں جو خوابیدہٗ راہ جولانیاں تھیں
وہ یک لخت سی جست کرتی ہیں درّانہ دف میں
ایک نالہ بہ لب

سیکسوفون

اک فغاں کی طرح دردِ عریاں لیے زندگی کی ندامت کا
لڑکھڑاتا ہوا ایک مے کش کے مانند
گرے آ کے حدِ دُعا پر جو دشنام برلب سعادت پرستوں کی صف میں
چیر جاتا ہے ساری فضا کو
اور گمگ اک ڈرم اور بینجو کی لڑتی ہوئی
ایک گھائل درندے کی صورت
آپ اپنی سکت سے جو خائف ہو
آپ اپنی تپش سے جو خود ساختہ سرزنش بن سکے
آپ اپنی سزا ہو کے آوازۂ گوش ہوتی رہے
بُوق و قرنا کی ساری صدائیں
ایک تابوت ٹوٹے ہوئے حوصلوں کا اٹھائے ہوئے
کتنی مردانہ وار آپ چلتی ہیں
ایک شورِ فغاں کے کفن میں چھپاتے ہوئے آرزو کو
ٹین کے کین بجتے ہیں
پشت پر ایک دشمن کے ہاتھوں لگائے ہوئے زخم سے
کچھ لہو رنگ دھاروں میں حدِ سماعت میں
فریاد رُو پوش ہوتی ہے

بے کراں نالۂ ہجر سے آپ چھنتی ہوئی
زنگیوں کی رَسَن بستہ شکوہ سرائی
اپنی تقدیر کی نارسائی سے
کیا کیا بلاتی ہے صدیوں کے اس پار سے
ایک آغوشِ وا کی طرح
دُور سے ان بنوں کی کوئی ساعتِ خود نمائی
واسطہ بن کے جو کھوئے لمحات کا
آخرش ایک دامِ وصال ایک وحشت اثر ہم کناری کی زنجیر میں
کھینچ لے اک بیابانِ نادیدۂ وقت میں

گواہ

کیا یہ خاموشی مری جاں اک ہراساں سی گواہ
سر بہ سر نامستعد لگتی نہیں خود آپ ہی
ہر سوالِ وقت پر کاذب جوابوں کی پناہ
منحرف ہے اک غم و غصّے کے رخ پر روحِ حال
آدمی کی نیند میں گھلتی ہوئی تاریکیاں
خوف کا زہرِ ہلاہل دودِ پیچاں سے سوال

تیرگی کے دائرے ، اقوالِ کہنہ کے حصار
شپرّہ چشموں میں وارث وارداتِ نو کے ہیں
اک ملامت کا ہدف آئینِ آگاہی سے خوار
رخ تباہی کا لیے اک علمِ بے آگاہ ہے

تنگ بازاروں کے ہیں آتش زدہ چہروں پہ خاک
اک لغت دشنام کی دیوارِ دانش گاہ ہے

رُو بہ رُو آتش زدہ فصلیں ہیں بیماری کے سایے
ایشیا کی خاکِ پارینہ ابھی ہے سر نگوں
قحط کا گہوارۂ جنباں اجل کی اک سرایے
غیر کی تدبیر ہے ردِّ بلا ایام کی
بنجروں کا قطعۂ بے آب ذہنوں میں لیے
ڈھونڈتے ہیں ہم کٹیلی جھاڑیاں اوہام کی

کم تری کے غم سے لکنت ہے زباں کی بے نمو
مجلسوں میں یوں تو ازبر یہ حدیثِ کشف ہے
دانشِ حاضر سے عاری نطق ہے بے آبرو
طاقتوں کی دوڑ میں کیا کاغذی ہوش و حواس
حرفِ پیچیدہ کے جادو سے سیاست کا طلسم
رد کیے دیتا ہے خود اپنی ضرورت کا بھی پاس

دہخدا صنعت کے تازہ رخ کا سودائی ہوا
روز و شب نرخِ گراں میں ایک نادیدہ سا ہاتھ

کس ہنر سے کاربندِ عالم آرائی ہوا
ہم وہ اندھے ہیں کہ آئینے سے شرماتے نہیں
انجم و خورشید کی تشکیک کے شب خون میں
اپنی ڈیوڑھی پر تغیّر کی ہوا پاتے نہیں

قافلے میں جستجو کے بحر و بر کے درمیاں
دانشِ حاضر کی محرم کامگارِ روحِ عصر
تازہ نسلیں آ رہی ہیں توڑ کر حد بندیاں
یہ غمِ حرف و سخن کی سہل انگاری ہے اور
تربیت گاہوں کی ابجد اور نقشے اور ہیں
بال افشاں آگہی کی تازہ چنگاری ہے اور

نیم جاں آہستہ رَو تہذیب کے حلقے میں ہم
دورِ نو کی آگہی کو مسخ تر کرتے ہوئے
آ چکے ہیں آتشِ تادیب کے حلقے میں ہم
مغز کے کہنہ برادے سے غذا چھنتی نہیں
پارہ پارہ ذہن کی اک جاں کنی کی جست و خیز
تازہ فکری کا کوئی خطِ افق بنتی نہیں

ظرفِ آبا میں تغیّر کو سموتا ہے کمال
علمِ نو کے بطن سے تخلیق کا جھومر لیے
پاتے ہیں صُلبِ پدر سے ربطِ معنی خدوخال
منکشف ہیں تازہ ذہنوں میں حدیں ادراک کی
ایک نوپیدا فضا اک سلسلہ تاریخ کا
مانگتا ہے اب قبا اک شعلۂ چالاک کی

ہم سے ملو تو آتشِ جولاں سے خس ملے
لیکن لباسِ نو تو نفس دو نفس ملے

محرم ہزار قرب کی ، دُوری کی یادگار
یا تو ملے کہیں کہ صدائے جرس ملے

لے کر اٹھے تغیّرِ عالم کے آئنے
کیا زاویے تجھے رخِ تازہ نفس ملے

اُتری تو عندلیب کے سینے میں نوکِ خار
شاید کہ اب نوائے گلو نیم رس ملے

نکلی کسی شعاعِ گرہ خوردہ کی دلیل
اک ساعتِ جنوں میں ہزاروں برس ملے

فردا اُسی ساعتِ نو کی ہے حد جہاں
تاریخِ رفتگاں بھی مثالِ جرس ملے

پیدا رمِ غزال سے تھی عرصہ گاہِ دشت
ملتے نہ تھے جنوں کو مگر داد رس ملے

منہ چاہیے ہے خارِ مغیلاں کے وصف کا
ایسا مجھے ملا غمِ تازہ کہ بس ملے

سنبلِ پیچاں دھویں کی خواب میں اک رَو سی تھی
کیفیت اک نیم وا در کی کسی پرتو سی تھی

قوسِ لب میں تھا خطِ عمرِ رواں ٹھہرا ہوا
اور سرِ ناخن چمک مانندِ ماہِ نو سی تھی

حسن سے جس قرب کی گردش میں تھی شامِ وصال
ایک ہی کروٹ میں دُوری منزلِ یک جَو سی تھی

زیرِ ابرو تھی کئی رنگوں کی جلتی نرم آگ
اور مژگانِ سیہ داماں پہ چھنتی ضو سی تھی

محوِ سرگوشی تھا کل کافی کی اک پیالی میں عکس
اور جبیں آئنے کی چھوٹ سے اک لَو سی تھی

قد و قامت میں سناں تولے ہوئے تھی عمرِ نو
سادہ پوشی میں لپٹتی صبح کی اک پَو سی تھی

لرزشِ لب میں شمارِ بوسۂ آئندہ سے
اک خفی جنبش کی دلداری بہ برگِ نو سی تھی

کوئی مارِ خفتہ نفس لیے کوئی خارِ دشنہ ادا لیے
کوئی یہ بتاؤ کہ زندگی گلِ سر سبد میں ہے کیا لیے

کسی گردشِ غمِ عافیت سے حصارِ جاں میں سمٹ گئے
وہ فراق و وصل کے دائرے جو چلے تھے اپنی فضا لیے

کہیں بوئے گل تھی رمیدہ سی تو یہ کون اس کے سراغ میں
کئی موسموں کا جنوں لیے پسِ گل تھا دامِ بلا لیے

نہیں تار و پوئے لباس سے ہے حسابِ آب و ہوا دیا
نہ کہیں سے سازِ کفن لیا نہ کسی سے تارِ قبا لیے

کوئی ان سے جا کے یہ پوچھتا کہ جواب حسن نے کیا دیا
جو مزاج پا کے محبتوں کا گئے تھے گوشِ وفا لیے

کوئی راہ کاٹ کے آئی ہے یہ وداع و وصل کے موڑ کا
جو رم و سکون کے درمیاں ہے سفارتیں سی ہوا لیے

وہ تغیّرات کی آہٹیں جو ہوا سنا کے چلی گئی
وہ سماعتوں کی تلاش میں نہ رُکیں کسی کا پتا لیے

یہ حدیثِ ربط و گریز کیا تُو ہی آپ اپنے کو دیکھ لے
تری آنکھ صبحِ طرب لیے تری زلف شامِ بلا لیے

کسی کارگاہِ زیاں میں کیوں غمِ عشق بن کے بکھر گیا
وہ پیام بوسۂ یار کا جو گئی تھی بادِ صبا لیے

وہ خیال و فکر میں فرق تھا کہ وہ گھر پہ آ کے چلا گیا
کہیں اور رختِ سفر لیے کہیں اور سر پہ رِدا لیے

آگہی کیا کہ جنوں کی نہیں فرصت کوئی
نکتہ چیں ، کھیل ہے لڑکوں کا محبّت کوئی

یوں تو جو کچھ بھی ہو بنیادِ سرشتِ عصیاں
کس کی ترغیب پہ مائل تھی سماعت کوئی

داستاں گو! یہ حدیثِ غمِ دنیا کب تک
آج کی رات تو رودادِ محبّت کوئی

محرمانہ تھا ان آنکھوں میں کوئی عالمِ شب
سو گیا وہ تو بیاں کی نہیں صورت کوئی

جل گئے بالش و بستر ہی سرِ خوابِ وصال
خواب سے چونک کے وحشت سرِ وحشت کوئی

تنگیِ دل کے لیے قرب کے ہنگاموں سے
زندگی ڈھونڈ لیا کرتی ہے وسعت کوئی

دل کو تھی جس میں جگر داریِ صد دشتِ بلا
گھر کی دیوار کے سایے سے ہے وحشت کوئی

آئنہ ہو کہ نگہ اے قدِ بالائے نگار
سامنے لائی تعلّق کی ضرورت کوئی

✿

بیرونِ در ہواؤں میں شعلہ نفس گئے
گہوارۂ زمیں سے مثالِ جرس گئے

جادہ تراش دشتِ تغیّر ہوئی تو خاک
کیا زاویے ترے رخِ تازہ نفس گئے

ٹوٹا تو ایک حلقۂ زنجیرِ گرد و باد
کیا کیا مسافروں پہ ستارے برس گئے

رکھتی تھی خاکِ تیرہ پہ مرہم شعاعِ مہر
لیکن وہ زخم تھے کہ ہزاروں برس گئے

کتنی عجیب شعلۂ گل کی اساس تھی
دامن جلا کے پاس سے سب خار و خس گئے

کس رنگ میں ہے اب کے بتانا ملالِ خلق
کیا بستیاں اُجڑ گئیں کیا شہر بس گئے

آساں نہ کر جنونِ طلب پر نشاطِ وصل
ورنہ ترے فسوں نگہِ نیم رس گئے

عہد آفریں تھی بوسۂ جاناں سے مرگِ عشق
وہ کون تھے جو آبِ بقا کو ترس گئے

تھی ظلمتوں کی اوٹ میں آسیب گاہِ برق
نوواردوں پہ آگ کے بادل برس گئے

تاریخ میں گزرتا رہا اک جلوسِ مرگ
اور ان میں شہسوار یہ خالی فرس گئے

لندن کی ایک دوپہر

تنگ داماں چائے خانے کے غمِ آداب میں
چند چہرے ایشیائی اجنبی حیرت زدہ
وقت کے کچھ تازہ اندیشوں کے اِس گرداب میں
گفتگو آہستہ رو اک رقصِ موسم کے سوا
سعیِ لاحاصل ہر اک پیشے کی تازہ کاریاں
اک حدیثِ آگہی تھی زخم و مرہم کے سوا

دوسری میزوں پہ بوڑھی عورتیں اخبار بیں
اشتہاری کالموں میں ڈوب کر اٹھتی نگہ
کچھ لباسوں کی تراشِ نو پہ بے حد نکتہ چیں
بیکری کے تازہ تر تیار کردہ مال کی

خوش بوئیں سی کچھ بکھر کر خود کو گم کرتی ہوئیں
اک سند خود ساختہ معیار کے احوال کی

خوب صورت لڑکیاں تھیں لنچ کے اوقات میں
کچھ خریداری کے منصوبوں پہ محوِ گفتگو
قیمتوں کی جستجو کے پیچ و خم ہر بات میں
آئنے میں ایک مُہرے کی طرح بڑھتی ہوئی
اک سیہ چہرہ کہ جس کی جِلد کی وحشی چمک
کھیل میں رنگوں کے اپنی سان پر چڑھتی ہوئی

ذکر تخلیقاتِ نو کا ، بحث کچھ حالات کی
فرق دو نسلوں کی تحریروں میں ، اک پیکارِ جاں
اک گرہ نکتہ رسی کے پیچ میں جذبات کی
خطِ فاصل سا حقیقت کے الگ ادراک کا
چاہتی ہے زندگانی کے دکھوں کی آگہی
حرفِ سادہ میں تغیرّ معنیِ سفّاک کا

مٹنے والے فرقِ ہر رنگ و نسب کی اوٹ میں
زندگی کی ہم خیالی میں بھی ہے لہجوں کا فرق

زاویہ ہائے نظرِ ذوقِ طلب کی اوٹ میں
مرگِ نطق و حبسِ جاں کے سلسلوں کی خود کفیل
سایہ افگن ایک تقدیرِ سیاست چار سو
آدمی کے حق میں ہے زنجیر و زنداں کی دلیل

دھندلی عینک میں کسی بوڑھے فرنگی کا خرام
اک مرقّع خود سے بیزاری کا اک تصویرِ یاس
زندگی کی دوڑ میں ہارے ہوئے گھوڑے کی شام
اے ڈکنس کے شہرِ کہنہ روحِ سلطانی کے شہر
تو خود اپنے رمز کی محرم ہے اے لندن کی روح
شیکسپیئر اور ملٹن کی زباں دانی کے شہر

ہر ثمر کو دے گئی دریافت اک سوغات میں
اک نہفتہ سا ترازو تھی جو نیوٹن کی نگاہ
حلقۂ ثقل و کشش کا دائرہ باغات میں
تیری نم خوردہ فضا میں آتشیں اک ارتعاش
جان اسٹیورٹ مِل کی فکر کی جولانیاں
آج بھی کرتی ہیں آزادی کے معنی کی تلاش

کچھ سوادِ حبش کے کچھ ایشیا کے داد خواں
تیرے دامن کی ہوائیں تیرے کُہرے کا غلاف
کب سے ہیں ہجرت زدہ دانش وروں کی اک پناہ
ڈھونڈتے ہیں زندگی کے خواب کی کوئی اساس
آبِ تازہ کے لیے ترسے ہوئے کام و دہن
نیم رس افکار سے آخر بجھا لیتے ہیں پیاس

اضطرابِ یک رخی ہے کافر و زندیق میں
زندگی کرنے کی دُشواری ہوئی ہے درمیاں
اک خطِ فاصل تصوّر اور غمِ تخلیق میں
حیلہ جویانِ جہاں کے غم ترے خوابوں میں ہیں
اک سفارت گاہِ عالم کے اشاراتِ خفی
تہ بہ تہ کیا کیا تری بے خواب محرابوں میں ہیں

بلیک کافی

تلخیِ کام و دہن کی ہم نفس رودِ سیاہ
سبزہ رخ کافی کی رَو تیرا خرامِ خفتہ پا
دل کی جنبش میں درونِ خانہ پا جاتا ہے راہ

موجِ خوں کی ہم عناں آہستہ رَو نہرِ جحیم
تو بھی اک دریائے میزاں ہے کہ جس کے پیچ میں
ہیں سبک سارانِ ساحل کے دلِ لرزاں دو نیم

ڈھل گیا ہے تجھ سے رخسارِ فراست کا غبار
سرمگیں موجوں میں تیری اس بلا کا پیچ ہے
کشتیاں ہیں ساعتوں کی خوفِ غرقابی سے خوار

نیک و بد تیرے سواروں میں ہیں عیّار و انیس
اہلِ دل، تاجر، صحافی، کج نہاد و راست باز
صف بہ صف دانش ورانِ بزم ان کے ہم جلیس

تو نے اے موجِ سیہ اکثر دمِ رفتار میں
کتنے گردابوں میں کھینچیں خام کاروں کی صفیں
کم سواد آخر جو تھے مور و ملخ کردار میں

مال برداری کی خاطر دیو قامت وہ جہاز
جن کے مالک تیری موجوں میں ہوئے بے دست و پا
ان کی اسمگلنگ کے اب ویراں جزیروں میں ہے راز

قاتل و قزّاق و دردِ نیم شب کی کشتیاں
قصہ خواں شاموں میں تیری تلخیوں کی موج میں
تہ نشیں ہوتی رہیں نام و نسب کی کشتیاں

اہلِ شر پر ہے تری تاریک موجوں کا عتاب
پا گئے طوفاں میں وہ پیراک بھی تیری اماں
خیر و دانائی میں دریا برد تھا جن کا حساب

ٹوٹی پھوٹی ناؤ میں اُترے ہیں مفلس بے خراش
تاجروں کی غاصبانہ خُو کے پرچم جن پہ تھے
وہ سفینے تیری موجوں سے ہوئے ہیں پاش پاش

خوابِ عشق افیون آسا رنگ میں گھلتا ہوا
انتہائے یاس میں جیسے دلِ آشفتہ مُو
مرگِ بے عنواں کے آبِ تیرہ میں دُھلتا ہوا

گرم رَو گہرائیوں میں جسم کی تو بے کلف
خود فراموشی کی جیسے رَو ہو کوئی جسم میں
کیفِ تخلیقِ گہر سے جزر و مد میں اک صدف

تیری زد میں حرف گیرانِ جنوں سب بہہ گئے
کتنے چہرے خود پسندانِ جہاں کے بارہا
تیرے زنگی سیل کے دامِ بلا میں رہ گئے

لب کی آزادی پہ جب آئی کوئی مہرِ بخیل
تھی تری ٹھہری ہوئی موجوں میں گویائی کی رَو
''قہرِ دریا آتش است و روئے دریا سلسبیل☆''

☆۔ عرفی کا مصرع

ندّیاں ربطِ تعلّق کی گریزاں وقت کی
دوستوں کی تر زبانی ہجر کا روئے ملال
تجھ میں ہے موّاج رَو پیدا و پنہاں وقت کی

تو کسی ٹوٹے ہوئے تارے کی ہے شاید رقیق
اک تعجب خیز پرچھائیں ترے سینے میں ہے
تو دعائے خیر میں میری بدی کی ہے رفیق

اخبار فروش لڑکا

رات کچھ خوجی صفت دانش وروں کی بزم میں
اوڑھ کر کنٹوپ اپنی آگہی کا چند لوگ
کر رہے تھے کچھ سیاست کچھ ادب پر گفتگو
کہنہ خضری کی فضائے خام سے خورسند لوگ

پریس کے سرمایہ داروں کے جلو میں صف بہ صف
بینک کے کچھ لوگ تھے، کچھ تھے مدیرانِ کرام
نشے کی چڑھتی کمانیں خود ہیں جن کے ہاتھ میں
سطوتِ صنعت گری کے ماہرانِ تیز گام

ذی نفس جمہور کی طاقت ہے لیکن وہ جنوں
پیرہن پاتی ہے جس سے بے قبا بے چارگی

تازہ رُخ ہوکر کسی گوشے سے پھر اٹھتی ہوئی
اک ورق آخر الٹ دیتی ہے خود درماندگی

سامنے سے ایک لڑکا ہاتھ میں اخبار کی
کاپیاں لے کر گیا تیزی سے یہ کہتا ہوا
صاحبو ، تم اک غنودہ پل پہ ہو بیٹھے ہوئے
وقت کا دریا کبھی تھمتا نہیں بہتا ہوا

وداع

اب تو اکثر ہی اے جانِ جاں رات میں
خواب کے ناگہاں آب لمحات میں
عکس چہروں کے کھلتے ہوئے پھول سے
مرگ کے زیرِ آشام محلول سے
مانگ لیتے ہیں لمحوں کی تکرار سی
آئنوں کے لیے مشتِ زنگار سی

نالۂ ہجر سی ایک نَے کی صدا
اک کفِ صوت کی طرح کھلتی ہوئی
جوہرِ نَے نوازی میں ڈھلتی ہوئی
قافلوں کی وداعِ الم خیز کی

داستاں بن کے جب بھی بکھرنے لگے
وقت کی سیڑھیوں سے اترنے لگے
ڈوب جاتی ہے اک پند کے موڑ پر
فیل پا خندقوں کے نشانات میں
مزرعِ مرگ ویران باغات میں

سرکلر ریلوے کے الف گیٹ پر

سرکلر ریلوے کے الف گیٹ پر رُک گئی آ کے اک خلقتِ بے پناہ
گرد آلود الجھے ہوئے دائروں میں
سخن ساز رکشا کے غوغا بسوں کے دھویں میں جو سرگم ہے
اس عہد کے گیت کی ایک گم کردہ لَے کی طرح
آپ اپنی ہی ثقلِ سماعت کی بے ساکھیوں پر چلا ہے
مری جاں اسی کے تو سامع ہیں ہم بھی
ساتھ رکتی ہوئی موٹروں سے
شہر و بازار کی گرم کاری کی اک نبضِ وحشت لیے
رُکنے والوں کی آنکھوں میں کیا کیا شکستوں کے گرداب ہیں
کچھ چھپائی ہوئی بوتلوں میں حسد کی
کھولتے شک کے تیزاب ہیں!

اگر رُخ چپ و راست کا یہ جھلس دیں
تو آئندہ نسلوں کے چہروں پہ آدھا گہن ہو
کہیں دُور افلاس کی بے زباں رات میں جو کھڑی تھیں
وہ ہاریں پلٹ آئی ہیں ان کی آنکھوں میں خلعت لیے
ایک سودا سا کرتی سَروں سے

مری جاں! یہ سب تشنہ کاموں کی صف
ایسے چشموں کی سیرابیوں کی ہے خواہاں
جہاں سے نکلتی ہوئی آبجو تاجری کی
ایک دریائے بے تاب کا پاٹ ہے
ہزاروں کلو واٹ بجلی کی طاقت، کے گھوڑے کی دے کر
انھیں کے شوالوں کا چکر لگاتی رہے
اسی خلقتِ بے پنہ کے جنوں میں
روپ بہروپ کے کھیل
وقت کو ایک دھوکے میں رکھتے ہوئے جانور ہیں مکلّف
شغالوں کا اک غول ہے
نیل کے ڈوب سے اک نئی جِلد پاتا ہوا
دوسروں کو ڈراتا ہوا
آپ آنکھوں کا کاجل چُراتا ہوا

مگر خوفِ جاں سے یہ غاروں میں چھپنے چلا ہے
روپ بہروپ کے کھیل میں
وقت کی کارگاہِ فسوں میں
کہیں رنگ ڈھل جائے اس کا تو کون اس کو پوچھے گا

مری جاں انھی ساعتوں میں جو اس گیٹ کے بند رہنے میں گزریں
تغیّر کے سب نردبانوں سے اُتریں
انھی ساعتوں میں
خدا جانے اب ہم کناری کی اک فصل
تقدیر کس کی تھی
یہ زنداں کا کھلتا ہوا در تھا کس کے لیے اور زنجیر کس کی تھی
یہ کس آبیاری سے نوعمر پیمانۂ زندگی میں ثمر کو
جھلکتا ہوا رَس ملا
خدا جانے کس شاخِ جنباں سے اُڑتے ہوئے
طائرِ تازہ پر کو
فاصلے اور چلتے ہوئے تیر کے درمیاں
حریفانہ پرواز کا جَس ملا
اب خدا جانے کس شاخ کو آمدِ گل کی ساعت ملی
ناگہاں مرگ کی رَو میں اک حرفِ پیماں کا وقفہ ملا

اور محبت کو اک بوسۂ لب کی فرصت ملی

یہی وقتِ چوبِ عسس سایۂ جبر ہے

اور چشمِ نگہباں میں چیتے کی اک جست ہے

مجمرِ عشق میں بے زباں صبر ہے

اشتہا ایک کف جو کی فاقہ زدوں کی قطاروں میں

یہی وقت ہے جو شکم کے شکستہ حصاروں میں

خونی وباؤں کا ترسول ہے

نرم جاں پتیوں میں چھپا ایک کھلتا ہوا پھول ہے

یہ دل تنگیوں میں ہے زہرِ ہلاہل

جو ساکت کرے نبضِ عالم کو

اور انساں کی نیرنگیوں میں وہ جادو کی رَو ہے

جو دشمن بنا دے محبت کے محرم کو

ہجر میں فاصلوں کی جریبوں کا محرم

زخم بن کر، یہ مرہم نصیبوں کا محرم

یہ زنگار مجبوریوں کا کہ آئینہ گاہِ حضوری کا محرم

یہی ہجر کی شب میں محرم ترے قرب کا

اور شبِ ہم کناری میں دُوری کا محرم

یہی وقت ہے قفلِ در اور اس گیٹ کا آہنی اک ورق، موم کی سی کلید

سرکلر ریلوے کے الف گیٹ پر

نیم رُخ تیرے چہرے سے اک زاویہ سا بناتا ہوا تا اُفق ایک دید
قتل گاہِ تمنا سے گنجینۂ آرزو کے جزیرے کی حد تک
اسی بحرِ ذخار میں اک سفینے کے ہم سب مسافر ہیں!

خبر کے دور میں سرِ نہاں کی فکر میں ہوں
ہوا کہاں کی ہے اور میں کہاں کی فکر میں ہوں

مسافری کا جنوں بے چراغ صحرا میں
وہ خواب ہے کہ کسی ترجماں کی فکر میں ہوں

جہاں چراغ جلائے ہیں روحِ عصمت نے
وہیں سے جادۂ عصیاں نشاں کی فکر میں ہوں

وصال میں بھی وہ کہتا ہے قرب کی ساعت
زیاں ہے ہوش کا اس بدگماں کی فکر میں ہوں

تم اپنی اپنی زبانوں کے غم میں ہو اور میں
گدائے یارِ دلِ بے زباں کی فکر میں ہوں

بگاڑ دیں نہ اسے راویانِ تازہ نفس
حکایتِ مژۂ خوں فشاں کی فکر میں ہوں

شگفتہ تر ہے سفینے سے دل کی آس مگر
رمِ ہوا و رُخِ بادباں کی فکر میں ہوں

بگڑ کے مجھ سے کہیں خود ہی لَو نہ دے اٹھے
میں اپنی شورشِ نبضِ تپاں کی فکر میں ہوں

زنجیر کیے شہر میں لاتے ہو مجھے کیوں
اس قحطِ فراست میں بٹھاتے ہو مجھے کیوں

میں نے جو لکھی ہے وہ عبارت ہے جنوں کی
مٹتی نہیں تختی سے ، مٹاتے ہو مجھے کیوں

گرگِ دہن آلودہ و افسانۂ یوسف
آئینِ زمانہ ہے بتاتے ہو مجھے کیوں

رُسوا ہے مگر عشق کوئی جرم نہیں ہے
احوالِ دگر کہہ کے چھپاتے ہو مجھے کیوں

کچھ لوگ تھے دیوار میں چنوائے گئے تھے
تم نے انھیں دیکھا ہے جتاتے ہو مجھے کیوں

جس نیند میں اک شب ہے ابھی شہرِ وفا کی
اس نیند سے رہ رہ کے جگاتے ہو مجھے کیوں

میں صدرِ کشادہ کی طرف آپ ہوں کھنچتا
آنا تو مقدّر ہے بلاتے ہو مجھے کیوں

صاحب نظراں جی تو مرا اُس سے لگا ہے
رُوداد یہ عالم کی سناتے ہوں مجھے کیوں

چلا دانہ و دام کا ہاتھ کیسا
گیا کام سے کام کا ہاتھ کیسا

بجھاتا ہے خورشید کو اور دیے کو
جلاتا ہے یہ شام کا ہاتھ کیسا

ملے سینۂ گل کو ذرّے ہوا سے
ترے جور و اکرام کا ہاتھ کیسا

دمِ مار و تریاق میں کارگر ہے
گرہ بستہ ایّام کا ہاتھ کیسا

شناسا ہے دستِ شفق، دستِ جاناں
مگر کوئی بے نام کا ہاتھ کیسا

نہاں خانۂ خواب کے موتیوں تک
پہنچتا ہے نیلام کا ہاتھ کیسا

ثمر بیج کا ایک ذوقِ نمو ہے
نظر آئے انعام کا ہاتھ کیسا

سزا اور جزا آپ ہے خوئے آدم
کسی اور الزام کا ہاتھ کیسا

صورتِ زنجیر موجِ خوں میں اک آہنگ ہے
آگہی کی حد پہ اک خوابِ جنوں سے جنگ ہے

جانے کن چہروں کی لَو تھی جانے کس منظر کی آگ
نیند کا ریشم دھواں ہے خوابِ شعلہ رنگ ہے

اک جنوں خانے میں خود کو ڈھونڈتا ہے آدمی
خود طوافی میں بھی خود سے سیکڑوں فرسنگ ہے

طوقِ آہن سے گلوئے عشق میں تارِ حریر
شاخِ گل دستِ شقی میں ہو تو چوبِ سنگ ہے

ساکنانِ دہر ملتی ہے کہیں ایسی مثال
کیا نشہ آنکھوں میں ہے کیا قد ہے کیسا رنگ ہے

مار و کژدم سے بیاباں زاد تحریریں ہیں پُر
موجِ معنی گم ہوئی ریگِ رواں فرہنگ ہے

آگ کو گلزار کر دے اِس دُعا کا وقت ہے
ورنہ خوئے آدمیّت آدمی پر تنگ ہے

بوئے گل رخصت ہوئی شاید یہ ہو ختمِ بہار
ٹوٹتی لَے میں بکھرتی صوتِ شب آہنگ ہے

ایک مرکز پر ضدیں یک جا ہیں اور گردش میں ہیں
یہ زمانے کا تغیّر عالمِ نیرنگ ہے

پیوند رنگ☆

بطنِ مادر کے زَغال تیرہ میں اُترا ہوا
اک کران کی طرح غلطاں تھا حسینِ تازہ کار
اس اندھیرے میں بھی پالی اس نے اک رخشندگی
ایک الماسِ تراشیدہ کا روپ
دست و پا میں جو بہت نکھرا ہوا
سامنے آیا تھا خود مثلِ بہار

جسم کے سب زاویے
ایک بلّوریں قلم کی طرح لَو دیتے ہوئے
تیرگی میں رات کی رکھتے تھے خود اپنا طلوع

☆۔ Malatt Girl

رہ گزر کے موڑ پر
وہ اچانک آئی تھی
جانتی تھی وہ کہ سارے گیہواں رنگوں کے لوگ
نرم خو ہیں حسن کے دل دادہ ہیں

ایشیا کے گرم جاں سودائیوں کے خواب ہیں
جو شبوں کے طاق ہیں
ان میں سب پچھلے پہر کے چاند کے مانند ہیں بکھرے ہوئے
موتیوں کے ہار تحفے عشق کے

نقشِ شب ہائے وفا
پیش پا اُفتادہ ہیں

کچھ تعاقب میں رہے اس کے قدم
تیز و آہستہ قدم
اور لہجے کی کھنک میں
عام اک طرزِ شناسائی سے ماچس کی طلب جو اس نے کی
لائٹر کی لو میں

چہرہ شعلۂ گل کی طرح
اپنے پیوندِ نسب کا تھا حریف
میں نے اس کے حسن کی تعریف کی
اور اسی ساعت میں گھومی زندگی
اک سوادِ تیرہ میں
لے کے اک تاریخ معذوری میں گھیٹو کی ہوائے خام کار
آپ خود اس کے ہنر سے دُور
اور میرے لہو کے بیچ میں
اک خطا آمادہ رَو کو کاٹتی سی مثلِ برق
وقت کی نادیدہ رَو
دستِ قدرت کا کوئی نایاب تحفہ تھی وہ اس کی چشمِ نم
اس شرف کے موتیوں کے کس گرہ میں دام ہیں!

بارش کی ایک رات

بارش کی وہ رات کہ اک مردنگ بجاتی
ریتیلے ٹیلوں پر بجلی
آپ نرت میں
اپنے جوڑے کے بندھن میں
آگ کے چاک لیے پھرتی تھی
رزمِ آب و ہوا کی رَو میں
بھیگی ہوئی ایک آدھ سناں سی
اُچٹی نیندوں پر گرتی تھی
بالکل بھیگی بھاگی تم بھی
دو اک گلیاں کاٹ کے شب کے سنّاٹے میں نکل پڑی تھیں
جیسے جسم کے سرکش خوں نے

بے بس کر کے دیواروں سے ٹکرایا ہو

روح سے اک سرگوشی کی ہو

ضد میں آ کر سحرِ وصال کا آئینہ سا دکھلایا ہو

کالے بادل کے گھوڑوں کی

راسیں کھینچے

رتھ لے کر وایو منڈل[☆۱] سے

دروازے پر

کوئی گناہِ اوّل کا سا دُوت[☆۲] آیا ہو

شال تو سب پانی سے تر تھی

بھیگے کپڑے خود پردہ تھے ایک دھوئیں کا

گرم بدن پر بے خبری کی الگ رِدا تھی

ساری گات قبائے نم سے چشمک کرتی

رنگوں کی پیکار جدا تھی

جوت بدن کی جاگی ہوئی تھی

جیسے زر کی کان کوئی دریافت ہوئی ہو

دھندلی دھندلی سی اک سِل پر

کانکنوں کی قندیلیوں سے

کچھ پرتیں سونے کی چمکیں

☆۱۔ کرۂ ہوا

☆۲۔ سفیر

اِدھر اُدھر سے

شانے، سینہ، پیڑو، کولھے

سینے کے اک خطِ اُفق پر

اپنی لو میں ملائم ہونا

آپ اپنی ہی جگر جگر سے جاگ اٹھا تھا

خوابوں کا اک شہر ہو جیسے

جس کی جانب روزِ ازل سے قافلۂ عشّاق رواں ہے

شال جو بالکل بھیگ چکی تھی وہ تم نے کرسی پر ڈالی

اور انھیں بھیگے کپڑوں میں بے سدھ سی بستر پر آئیں

ایسی رو میں خود بہہ نکلیں

آپ جو اک دریائے ابد کی موج ہو ایسی

قعرِ دریا تک جا پہنچے

وقت کی موجِ اوّل میں جب

پانی مٹی آگ ہوا سب

نیم غشی میں یک جاں ہو کر

افسونِ تخلیق کے محرم ہو جاتے ہیں

زلف کی رات

پشتِ عریاں پہ کُھلی زلف کی اک موجِ سیاہ
رَو میں اک سرِ بیاباں سا لیے محوِ خرام
نیند کا نشّہ سی ، جنگل کی ندی سی سرِ شام
جال سا پھینک کے اک خواب کا بنتی ہوئی دام
دُور اَن دیکھے نشیبوں میں سماتی ہوئی زلف
خواب نادیدہ کناروں کا دکھاتی ہوئی زلف

زلف کے مس سے بدن اپنے فسوں میں مسحور
ہر نفس ذوقِ نمو سے وہ سلگتا ہوا جسم
پیرہن وقت کا تھا ان قد و قامت کا طلسم
خواب کی ایک مثال آپ چھپاتی ہوئی اسم
پنسے کی موجِ گہر ایک دھوئیں میں گم سی
منعکس حلقۂ ظلمت میں شبِ انجم سی

یوں تھی اک ساعتِ بے باک میں کھلتی ہوئی زلف
طائرِ حلقۂ صد شوق سے لرزاں پر و بال
گردن و شانہ پہ اک رمز کے سایے کی مثال
بوسہ گاہِ شبِ خلوت تھی بہ آئینِ وصال
زلف کے سایے میں آئی تھی پگھلتی ہوئی رات
ہم کناری کے اک آئیں میں بدلتی ہوئی رات

زلف کی رات تھی یوں سنگ فسانِ دل پر
تیز کرتی ہوئی بے باکی سے خنجر اپنا
جس طرح جائے خراجِ سرِ لشکر اپنا
دادِ تقدیسِ ہلاکت کو ستم گر اپنا
فتح کا باب کُھلے شہر کا دروازہ کُھلے
مہرِ تاریخ لگے اک ورقِ تازہ کُھلے

نیند

وقت گزرا کیا

اور شب و روز عہدِ وفا کے بھی گزرا کیے

ہر خم و پیچ سے زندگانی کے

بوجھل شکستہ

اک مسافت میں ان رہ گزاروں سے ایسے دروں سے

جو چشمِ نگہباں کے سایوں میں رہتے ہیں

آپ ہی نیم وا، نیم بستہ

وقت ہی ایک گنجِ گراں مایہ تھا

جو لٹے قافلے کی طرح اک پتا ڈھونڈتا

نیند کے نرد بانوں سے اُترا کیا

ساری گزری ہوئی ساعتیں

بوسۂ لب کی ہم رنگ خوابوں کی

بیم و رجا کے سرابوں کی

وصل و ہجراں میں خود برگِ گل کی طرح جو بکھرتی رہی ہیں

وہی نرم جاں ساعتیں تھیں جو عمرِ گریزاں کی غم خوار بن کر دلوں میں اترتی رہی ہیں

وصل کی شب میں کھڑکی پہ رکھے ہوئے چاند کی محرمانہ گھڑی

ادھ کھلے جسم کی ایک، ساعت کے مانند تھی

جو پگھلتی رہی ہے لہو میں

اب یہ ساکت گھڑی چاند کی

زخم و مرہم بنی اپنی خو میں

روز اُگتی ہے نیندوں میں

کچھ دبے پاؤں بستر تک آتی ہوئی آہیں

زاویے سر پہ تکیے کے سرگوشیاں

اور اچانک وہ ابرِ سیہ میں ستاروں کی رُوپوشیاں

ہم کناری کے لمحوں میں یورش سی کرتی ہوئی کروٹیں

تیرا آئینِ وصل

موجِ خوں میں جو حل ہوگئی بجلیوں کی وہ رَو

ناگزشتہ چمک کا سا پیوند سیتی ہے نیندوں میں

❁

اے جنوں، یوں رقص میں دیوار و در آتے رہے
بادیہ پیما بگولے سے نظر آتے رہے

کل چمک سے جن کی لرزاں تھا کفِ گوہر فروش
خاک کی تہ میں وہی لعل و گہر آتے رہے

دشت و در میں کھو گئی آشفتگانِ دل کی خاک
بے سر و ساماں محبّت کے سفر آتے رہے

پھول سے کھلتے رہے کیا کیا جنوں کی آنکھ میں
ریزہ ریزہ خواب با مژگانِ تر آتے رہے

ہم نے بھی دیکھیں حریفانہ سبو کی گردشیں
شورشیں اٹھتی رہیں دورِ قمر آتے رہے

خواب کے آئینۂ گرداں کی وہ صورت گری
تیرے رخ کے زاویے کیا کیا نظر آتے رہے

شبنم آسا خنکیوں میں سو رہی تھی روحِ شہر
کچھ گلِ دیوار میں شعلے سے در آتے رہے

وقت کی تازہ رُخی کی رَو میں آخر رُوئے یار
تیرے افسانے بہ عنوانِ دگر آتے رہے

قیدِ موسم نخلِ بار آور پہ لگ سکتی نہ تھی
سلسلے ذوقِ نمو کے کارگر آتے رہے

اپنی خاکستر سے نو قالب رہی دنیا تمام
اک نئی فرہنگ لے کر دیدہ ور آتے رہے

عالمِ فردا تری بینا رصد گاہوں کی خیر
جن کی زد پر آفتابِ تازہ تر آتے رہے

وصالِ دوست سے کوئی سکوں ملنے نہیں پاتا
وہ ملتا ہے محبّت کا جنوں ملنے نہیں پاتا

اُجالا ہے مگر دل کا اندھیرا دُور کر دے گا
چراغِ شہر سے ایسا شگوں ملنے نہیں پاتا

رگِ دل دے گئی کیا کیا لہو دامانِ صحرا میں
مگر اک خارِ صحرا لالہ گوں ملنے نہیں پاتا

دبستاں سے الگ تاریخ اک لہجہ سکھاتی ہے
ہر اک کو اعتبارِ حرف یوں ملنے نہیں پاتا

وہ زخمِ سر کہ جس کو سر کی خاطر تاجِ گُل کہیے
سوائے منزلِ یک نیزہ خوں ملنے نہیں پاتا

حدِ نغمہ بدل جاتی ہے ہر تارِ تغیّر پر
وگرنہ ساز کا ربطِ دروں ملنے نہیں پاتا

نشاطِ وصل میں کھو کر جو تُو نے خود کو پایا ہے
کہیں یہ رنگِ چشمِ پُر فسوں ملنے نہیں پاتا

ہم ایسے ایک دو کی پیاس کو جو آبِ حیواں تھا
کسی چشمے میں وہ آبِ جنوں ملنے نہیں پاتا

الگ رکھا ہے پیرِ مے کدہ نے جو کرامت سے
وہی جامِ سفالِ واژگوں ملنے نہیں پاتا

ختم ہوئی شبِ وفا خواب کے سلسلے گئے
جس درِ نیم باز کے پیش تھے مرحلے گئے

جو رگِ ابر و باد سے تا بہ رگِ جنوں رہیں
عشق کی وہ حکایتیں حسن کے وہ گلے گئے

شکر و سپاس کا مزہ دے ہی گیا سکوتِ یار
وصل و فراق سے الگ درد کے حوصلے گئے

اے بہ فسونِ دلبری ، تازہ رخ و سیاہ چشم
منزلِ قرب بھی گئی تجھ سے نہ فاصلے گئے

اے رخِ تازۂ جہاں رات تو اب بھی ہے گراں
شمعِ ہزار رنگ تک یوں ترے سلسلے گئے

نیند میں مہوشانِ شہر ، بوسۂ عاشقاں کی خیر
شب یہ ہوائے نرم سیر صبح ہوئی صلے گئے

اک مرے ہم کنار کی مجھ سے قریب آ کے رات
خیمۂ درد ہوگئی قرب کے ولولے گئے

دشت میں قحطِ آب سے ہجرتِ طائراں کے بعد
سیر پسند و تر نفس ابر کے قافلے گئے

دامنِ دل کی اوٹ سے ایک شبِ فراق کیا
دورِ تغیرِ جہاں سب ترے قافلے تھے

ذوقِ ہمرہی

آبنوسی جسم میں اک تیرہ شب بے پیرہن
ماہ و انجم میں کوئی خاکسترِ لمحات سی
رہ گئی ہے جیسے خوابِ عاشقاں پر خندہ زن
اے وفا کی رات ، اے شب گیر پیوندِ الم
کر چکی ہے تیری قاتل موج بھی دل کو دو نیم
تجھ سے بھی سفّاک تر ہیں زندگانی کے ستم

وقت آئینہ ہے اک اپنی متاعِ درد کا
رکھ رہی ہے تیرگی اک کسوتِ بے نام میں
ہر ورق اُترے ہوئے چہروں کے برگِ زرد کا
بدنما دیوار و در کی کہنگی ہے بے سپر

کچھ گلِ پژمردہ کے مانند ہیں پرچھائیاں
بے حسی سے کُل لطیف اشکال کے تابوت پر

ناکسی کے چند مہرے ہیں فضا میں راہ گیر
دستِ قزاقاں کی زد میں دولتِ قفل و کلید
درمیانِ مرگ و حفظِ جاں ہے خنجر کی لکیر
چادریں اپنی سفیدی کی اُوڑھا کر لے چلیں
موٹروں کی روشنی کچھ اپنے اسٹریچر لیے
راہ کے مجروح سایوں کو اٹھا کر لے چلیں

روحِ جمہوری ، رخِ جانان و تصویر و کتاب
زندگی آخر زبانِ عشق میں ہے جس کا نام
لگ گئی ان پر جہاں بانی کی مہرِ احتساب
رہبرانِ تیز رو ، بیرونِ در آہنگ سے
رقص میں رکھتے ہیں حرفِ مدّعا سوزِ دروں
خوش کلامی چھن رہی ہے لکنتیں فرہنگ سے

زندگانی لاکھ ہو ، کاسہ بہ دست اک احتیاج
تاجری کے ماہِ نخشب سازشوں کی اوٹ سے

اپنی تابانی کے منصوبوں کا لیتے ہیں خراج
ناخنوں سے پھاڑتا ہے خشکیوں کو قحطِ آب
قلتِ خوراک سے آشفتہ مُو ہیں بستیاں
محوِ خود آرائی ہے تقسیمِ زر کا اضطراب

خامکاری کو سکھاتی ہے ہوا چالاکیاں
چور بازاروں سے لائی منطقِ بے نام سے
جھانکتی ہیں گرگِ باراں دیدہ کی سفّاکیاں
لب پہ اک حرفِ دعا اک موجِ خوں خوابوں میں ہے
طائرِ افعی گزیدہ کی طرح خود آدمی
پر سمیٹے عافیت کی کہنہ محرابوں میں ہے

تنکیوں میں روک لی ظلمت نے پروازوں کی راہ
کتنی جست و خیز کی حیرانیوں کے درمیاں
آدمی پر وا ہوئی نادیدہ دروازوں کی راہ
نرمیِ آغوش سے ہر دامنِ زنجیر تک
ہے ضدوں کے زہر سے آبِ بقا کی اک کشید
بوسۂ لب کی فضا سے ترکشوں کے تیر تک

سر برہنہ طاقتیں جاگی ہوئی میزوں کے گرد
نصب میزائل کی چشمِ پاسباں کی ہیں امیں
رزم گاہوں کے دبیروں اور سخن ریزوں کے گرد
عرصہ گاہِ ثابت و سیّار بے تاریخ ہے
دور تک کتنی رصد گاہوں میں خطِّ آتشیں
بجھتے بجھتے بھی حریفِ زُہرہ و مرّیخ ہے

لو سی دیتی ہے مگر تیرہ شبی میں زندگی
زخمِ بازو آئنہ بندی پہ آمادہ ہوا
چشمۂ جاری ہے اس تشنہ لبی میں زندگی
راہ پا جاتے ہیں تجھ میں اے گزر گاہِ خیال
وقت کا اک تیز رو دریائے ناپیدا کنار
دشت و در کی ساعتوں میں خیر و شر کا اِتّصال

اک امانت ہے اندھیرے میں یہ ذوقِ ہمرہی
اے بہ پیچِ زلفِ جاناں ہم کناری کی ہوا
شوق کا اک زخمِ تازہ ، درد کی اک آگہی
چیخ یا نغمہ بنے آواز اس گردش میں ہے
اے کبوتر اے سپیدِ آشتی اے نامہ بر
خطِّ آتش تک پرِ پرواز اس گردش میں ہے

کس لباسِ نو میں ہوگی روحِ فردا آشکار
چھیڑتا ہے آدمی کے ذوقِ استفہام کو
آگ کا اک دائرہ جادو نفس آشفتہ کار
زندگی سرتابیِ پرواز کا اک باب ہے
ذہنِ عالم کے افق پر ارتقا کا پیچ و تاب
آدمی کی اوج گاہِ نارسا کا خواب ہے

قرب کی ایک رات

ایک دن جب ایک ہی ٹیبل پہ نمبر سے نشستیں آئی تھیں
وہ اور اس کے ساتھ ہی
اسکول میں ٹیچر کوئی ہمراز دوست
پاس ہی بیٹھیں تھیں آ کر لنچ میں
ربطِ حرف و ہم خیالی سے کوئی خوئے شناسائی سی آخر جاگ اُٹھی
ساعتوں کی آپ ہی زنجیر سی ہوتی گئی
اور لمحاتی ملاقاتوں کی اک تقدیر سی ہوتی گئی

ایک شوقِ ہمرہی کا اتفاق
جانے کس لمحے کے دامن میں تھا کہ وہ
رہ گزر پر گفتگو کرتے ہوئے

کچھ سوالوں اور جوابوں میں الجھ کر ساتھ ہی چلتی رہی
شمع سی دل میں کوئی جلتی رہی

فرقِ نسل و رنگ کے ان زاویوں کے درمیاں
کاٹ دیتی ہیں جنھیں کچھ ذہن کی پرچھائیاں
قرب کی کچھ ساعتیں خود ہی نکھر کر رہ گئیں
نیم رُخ چہرے کی اس آواز کی
اک رمق سی لے کے خوابوں میں بکھر کر رہ گئیں

گفتگو کی رات اک دن بعد پھر کمرے میں آئی
ایک کھڑکی کے قریں اک خوب صورت لیمپ تھا
پاس اک چشمِ نگہباں کی طرح
مرمریں سانچے میں ڈھالی بال افشاں اک پری کے ہاتھ میں مشعل سی تھی
بلب سے چھنتا ہوا اک روشنی کا خط تھا کوئی دائرہ کھینچے ہوئے
دور اک غم خوارِ پرساں کی طرح

فاصلے اور قرب میں
گردشِ پرکار سی تھیں ساعتیں
قرب کے شفاف لمحوں کی ہوا چھنتی گئی
گفتگو کے حلقۂ افسوں اثر سے آپ ہی
آرزو کی ایک چڑھتی بیل سی بنتی گئی
زندگی کے باب اس کی یاد میں کھلتے گئے

دور اک اسکول کے درجے، وہ موسیقی کا شوق
ایک چھوٹے شہر کے میدان میں
سائیکلوں کی دوڑ سی
دور تک نوخیز لڑکوں کے گروہ
اور دھندلی شام میں شیری کا پہلا جام سا
بوائے فرینڈز
رقص گاہوں کی شبوں کے درمیاں
زندگی کے رُخ کئی بنتے گئے جو اک سوال
رات کی دو اک ملاقاتیں تھیں اس انداز کی
جو کسی اسٹیج سے
یاد کی تختی سے دُھل سکتی نہ تھیں
ایک ایسی ہی گریزاں زندگانی کی شبوں میں
قرب کی یہ رات تھی
ہم کناری کا یہ لمحہ
اُس ہوا میں اک لرزتے گھونسلے کی طرح تھا
ہجر آئندہ کے موسم کا حریف
عمر کے پُل پر مآلِ زندگی سے دُور تر
دو پرندے
اک معلّق صفر ساعت میں کہیں ٹھہرے ہوئے

ہرغمِ سود و زیاں سے بے خبر
زوجیت قانون کی قینچی پہ بارآور کسی شاخِ ثمر آثار کے سایے سے دُور
ہر درو دیوار کے سایے دُور
قرب کی وہ رات روحِ ہمدمی کی رات تھی

جرمِ اوّل کی طرح
بے ندامت ایک غم خواری کی شب تھی، دوستی کی رات تھی
قیدِ صرف ونحو کی پابندیوں سے دُور تر
بوسہ ہائے لب کی، خوئے آدمی کی رات تھی

بوسۂ آخر و مرگِ ناگہاں

بال افشاں کسوتِ مینا میں روحِ تاک ہے
سلکِ یاقوت و زمرّد ہے سبو میں موج زن
آسماں تاروں کی آبیبی ضیا کی خاک ہے
شہر کی سودا نفس شب ہے طرب گاہِ رقیب
بے نوا بکھری ہوئی پرچھائیوں کی اوٹ میں
اک افق پر مِل رہے ہیں دوش و فردا بے نصیب

سوئیاں ساعت کی ہیں کف در دہاں کامِ نہنگ
قطعۂ افلاس کا ٹوٹا ہوا تابوت ہے
موج اندر موج روحِ خستگاں کرتی ہے جنگ
اونگھتی آہستہ پا اک ٹرام پر ہے خندہ زن

نیم جاں ٹوٹی بسوں کی بدگماں سانسوں کا شور
نرخ کے سایوں سے ہے روشن دکانوں پر گہن

اس فضا میں تیرے غم کی آگہی کیا ، خواب کیا
ہم کناری کیا کہ طاری ہے شبِ کنجشک و بُوم
جرمِ تجدیدِ وفا کیا ، عشقِ کم آداب کیا
رہن رکھ لیتی ہے عیّاری وفاؤں کا لباس
زاویے ہم ساعتی کے ، بوسۂ لب کا گداز
سکّۂ مقلوب کے مانند ہیں شکر و سپاس

تجھ سے چہرے کے لیے اک پھول بن جاتی ہے کیوں
زندگی کے قلزمِ بے تاب کی مجروح ناف
زخمِ پیدائی اٹھا کر دھول بن جاتی ہے کیوں
نیتوں کے کچھ جلے اوراق کچھ شمعوں کی خاک
تیرے رخ کے نیم روشن دائروں میں کھو گئے
موتیوں کے ہار سے الجھے ہوئے لمحوں کے چاک

وقت کو کہتی ہے دنیا اک امیرِ مہرباں
آدمی کی آدمیت کے لیے اس دور میں

روح کے بدلے ملی کہنہ لباسوں کی دُکاں
محرمانِ دل کی راتیں تھیں ، وہی جل بجھ گئیں
پردہ داری عصمت و عصیاں کی کرسکتا ہے کون
جو امانت کی قناتیں تھیں ، وہی جل بجھ گئیں

روحِ ہجراں رات کے تاریک ساحل سے اُٹھی
چاک کردیں بے قراری نے ردائیں خاک کی
صبح کی پہلی کرن خاکسترِ دل سے اٹھی
جن مشینوں کے اٹھے کچھ نلکیوں کی اوٹ سے
جاگ اٹّھے سب فلزّاتِ زمیں کے سلسلے
دن کا چہرہ جھانکتا ہے نلکیوں کی اوٹ سے

کشتِ دہقاں قحط کی گردش سے ہے گرمِ ستیز
چھا رہا ہے صنعتی آبادیوں پر دم بہ دم
ایک ابرِ رزق پیما ، فاقہ ساماں تیز تیز
دشت و در پر نام لکھتے ہیں حکیمانِ معاش
کھینچتے ہیں اک جہانِ مرغ و ماہی کا گراف
ابنِ آدم کے شکاری ذہن کے آجر تراش

قیمتیں اشیا کی گرداں ایک سیاحی میں ہیں
چور بازاروں میں بکتی ڈرگس کی سب خوبیاں
اشتہاروں کے قد و قامت کی مدّاحی میں ہیں
نکتہ ہائے تیز رَو میں ہے غمِ جاں کا حساب
تاجری کی روح کمپیوٹر سے کرتی ہے سوال
نبض اندر نبض جاگ اٹھتی ہے اک سلکِ جواب

اک فروغِ تاجری کی روح ہے اعداد میں
رزق کو تیزاب میں پگھلانے والے کشف میں
حفظِ بحر و بر کی طاقت ہے کفِ صیّاد میں
توڑ کر صلبِ پدر سے حلقۂ اطفال کو
آگہی نان و نمک کی کر رہی ہے خود سوال
دور تک اک پرتوِ آئندگاں خود حال کو

خاک برسر بنیشِ دانش وراں ہے راہ میں
غیر کے پرتو رصدگاہوں کے آئینے میں ہیں
خوابِ فردا اک متاعِ دیگراں ہے راہ میں
جی چراتا ہے غمِ جاں سے فراست کا مزاج

اک متاعِ دستِ گرداں ایشیا کے خواب میں
کوچہ گردِ غیر ٹھہرا ہے سیاست کا مزاج

خاک کے ذرّوں نے ترکیبِ اضافی کے لیے
کس غبارِ وقت میں پایا ہے اک رمزِ وجود
زندگی کی لذتِ سینہ شگافی کے لیے
یہ نظر ، یہ موجِ بے تابی کوئی رکھتا نہیں
خاکِ صد انجم پھرا کرتی ہے دشتِ وقت میں
آدمی کی سی جگرتابی کوئی رکھتا نہیں

آخری بوسہ و مرگِ ناگہاں کے درمیاں
موئے آتش دیدہ کے مانند خطِ وقت ہے
نوعِ انسانی پہ ہے بیمِ اجل سایہ کناں
اک حریفانہ اندھیرے میں ہے ''بے چادر'' حیات
محرمانِ دل کوئی پردہ کہ اس ہنگام میں
اک دعائے خیر کی طالب ہے روحِ کائنات

انکشافِ تازہ تر

سرمۂ بینش ابھی مانا کہ ہے خاکِ حرم
مسجدِ شاہی کے مینارِ ضعیف و ناتواں
روز و شب کی گردشوں میں زرد رُو ساکت قدم

رہ چکے ہو یوں تو تم میزانِ خوب و زِشت بھی
وقت کے ہاتھوں میں مانندِ سپر صدیوں رہے
گرمیِ عالم میں یہ بے جان سنگ و خشت بھی

عکس سب بجھتے گئے پہنائیاں کھوتی گئیں
رونقیں منسوب تھیں تم سے وہ خطِّ دید پر
گرد کی کہنہ لحافیں اوڑھ کر سوتی گئیں

شوکتِ پارینہ کا لیکن تحیّر اور ہے
سربلندی کے جو پیماں تھے وہ ساقط ہو چکے

زندگی میں رمزِ آئینِ تغیّر اور ہے
کہنہ دستور العمل کی محو ہوتی ہے شناخت
ہر تغیّر میں علامت کا ہے کوئی اور رنگ
تازہ تر اشکال کی کچھ اور ہی ہوتی ہے ساخت

رد ہوئی ہے بزمِ عالم کی نئی ترتیب میں
کج نہاد و کہنہ سامانی کی ہر پیچاں دلیل
گردشیں کچھ اور ہیں ذرّاتِ نو ترکیب میں

انکشافِ تازہ تر کا سلسلہ ہے زندگی
ایک ہی محور پہ صدیوں گردشیں کرتی ہوئی
منزلِ دشوار تر کا مرحلہ ہے زندگی

معرضِ آئینہ روئی سے پگھل جاتا ہے سنگ
رمزِ پیکارِ عناصر ہے کہ روحِ اعتدال
آپ کچھ اجزائے نو قالب کا پا جاتی ہے رنگ

تازہ اندیشوں سے کمپیوٹر ہوئے ہیں گرم رو
مہر و مہ تک خاکیوں کے سایے ہیں جادہ طراز
مل گئی تیرہ خلا کو آتشیں ذہنوں کی لو

طشتِ آتش ہے زمیں خود ایک صف پر رخ کیے
معملِ گرداں سے لیزر بیم کے پنہاں خطوط
ناوک افگن ہیں ہواؤں کے ہدف پر رخ کیے

انگلیاں جلتی رہیں تاروں کی بجھتی راکھ میں
کارگاہِ فطرتِ سفّاک کا تنہا رقیب
آدمی مجرم ہے کارِ ارتقا کی ساکھ میں

زخم کی رخشندگی ہے سینۂ آدم لیے
بے عناں گھوڑوں پہ نکلی فطرتِ آشفتہ کار
زلزلوں کی چابکیں طوفان کے پرچم لیے

اس فضا میں چشمِ بینا کی رسائی چاہیے
کچھ نئے مہتاب جھانکے معملوں کی رات میں
تجربہ گاہوں کی اک ایسی ترائی چاہیے

کُہنگی سے اک تپش سی گرم رو اٹھنے لگے
ہم کنار ان معملوں سے ہو کے اینٹوں کو ملے
وہ غمِ فردا کہ میناروں سے لَو اٹھنے لگے

اس غنودہ کُہنگی کو تازہ سامانی ملے
جو مقدّر تھی فضا میں شہپرِ جبریل کا
ذہن کو وہ خواب آسا بال افشانی ملے

وہ اشاراتِ نہاں آبا کی تحریروں میں تھے
جلوہ گر ہوں روحِ معنی پا کے تم پر ہر نفس
قیداب جو ذی نفس ذرّوں کی زنجیروں میں تھے

گرمیِ اخلاص بزمِ عاشقاں کی چاہیے
مسجدِ شاہی کے منارو تمھیں اس دور میں
کوئی ساعت سجدۂ آتش فشاں کی چاہیے

سوئیوں کی جنبشیں سایے تمھارے پا سکیں
ایک لمحے کے لیے ٹھہری ہوئی تاریخ کو
اس صدی کی نبضِ جولاں کے مقابل لا سکیں

✿

چراغِ آبلہ پایانِ دشت کس سے بتائیں
رگِ جنوں پہ جو نشتر تھیں، چل پڑیں وہ ہوائیں

ان ابر و باد کا ٹوٹے نہ زندگی میں طلسم
چراغِ رمز جو پردہ سرا ہے دل میں جلائیں

لبوں پہ اس کے تھی اک بوسۂ وصال کی خُو
ہم اس کے خواب و حقیقت کے درمیاں تو نہ آئیں

جو کاکلوں میں چھپیں بجلیوں کی رَو کی طرح
کُھلیں کہیں تو وہ گردن کے خم چمکنے پائیں

پیادہ پا ہوں میں اس گرد و باد میں لیکن
یہ ایک دوڑ ہے بے شک سوار باگ اٹھائیں

مرا مزاجِ محبّت بدل گیا ہے مگر
اسے بھی راس نہ آئیں وہ بے رخی کی ہوائیں

خرد کی تازہ رصد گاہِ عافیت سے مجھے
بلا گئیں ہیں جنوں خانۂ وفا کی صدائیں

جنھیں خبر نہ تھی اپنی غروبِ انجم تک
ہوا سنبھال گئی آ کے ان سروں کی رِدائیں

وداعِ شب میں تھا کیا کیا غزل سرا مدنؔی
یہ نیند آخرِ نغمہ تھی آپ اُسے نہ جگائیں

اک خوابِ آتشیں کا وہ محرم سا رہ گیا
دیوار و در میں شعلۂ برہم سا رہ گیا

شِیرِ وطن کے پیالے پہ تھیں کل ضیافتیں
آیا جو تا بہ لب تو فقط سم سا رہ گیا

مانا وفا برائے وفا اتفاق تھی
تم سا رہا کوئی نہ کوئی ہم سا رہ گیا

اک لاتعلقی کی فضا درمیاں رہی
جب دو دلوں میں فرق بہت کم سا رہ گیا

اُس سرو قد کی تاب و ملائم رُخی کا راز
عصیاں کی شب میں دیدۂ پُرنم سا رہ گیا

آخر ہوئی بہار مگر رنگِ گل کا خواب
دل میں دُعا ، نگاہ میں شبنم سا رہ گیا

اک اُس کے رنگِ رُخ کی جنوں ساز چھوٹ سے
اس زندگی میں خواب کا عالم سا رہ گیا

اس میں کچھ جنبش بھی شامل تھی لبِ اعجاز کی
ورنہ یہ صورت نہ ہوتی خود مری آواز کی

وہ بھی کچھ خاکسترِ دل کی تپش رکھتی نہ تھیں
دیکھ لیں آنکھیں تمھارے پردہ دارِ راز کی

اب کے تم آنا تو یوں آنا کہ آئینِ بہار
مرگ ساماں ہو بہار آجائے اس انداز کی

اس میں تکبیرِ اذاں آئی نہ آئینِ سجود
اک نمازِ عشق ہم نے گریہ سے آغاز کی

راہ میں آیا خطِ آتش نہ تیرِ ناگہاں
تم نہیں سمجھے ابھی لذت پرِ پرواز کی

مرے لہو میں نظامِ شمسی بھی آپ گرداں ہے رات بھی ہے
ہزارہا اجنبی شبیہیں ہیں تیرگی کی برات بھی ہے

حقیقتیں ہیں کہ ایک پرکار کی سی گردش لیے ہوئے ہیں
ہزارہا گردشوں کی زنجیر کی کڑی میری ذات بھی ہے

خود اپنے ہی عکس کے مقابل حریفِ عصمت ہے آئنہ بھی
اسی میں غلطاں نہادِ عصیاں کا پاس بھی ہے ثبات بھی ہے

نہایتِ آگہی کے منکر کی یورشوں سے رقابتیں ہیں
مگر کہ مسجودِ نوریاں تو ازل سے انساں کی ذات بھی ہے

تغیّرِ کائنات کی ضد بھی ایک محور بھی اُس کا دل ہے
انھیں ضدوں کی تو ایک گردش تغیّرِ کائنات بھی ہے

اسی کے دریائے خواب میں ہے کُھلے ہوئے بادباں کی رو میں
فضائے سیّارگاں کا منظر سفینۂ ممکنات بھی ہے

آج ہوا کی رو میں پایا ہم نے مستِ قاتل سا
دشت میں آہو گردنی سی شہر میں رقصِ لبسمل سا

روئے آزادی نے دیکھا اک ساعت کی چشمک میں
اپنے خواب نما چہرے پر گرتا پردۂ محمل سا

دشت و جبل میں افشاں ٹھہری خاکستر کچھ دل کی بھی
آگ میں آئینہ لہرایا کیا کیا خوابِ منزل سا

میرے جنوں کی بے خبری تو اک مشہورِ زمانہ تھی
تیری آنکھ سراغ میں اپنے رنگ رکھے ہے غافل سا

میرے خواب کی رَو میں کیسے حلقہ حلقہ آتے ہیں
اک شبِ طوفاں ، ایک سفینہ ، ایک چراغِ ساحل سا

عالمِ حسن سے میری نظر کا کتنا نازک رشتہ ہے
ہر چہرے کی اوٹ میں پایا کوئی نقش مماثل سا

سر رکھ کر زانو پر جس کے ہم نے نیندیں پوری کیں
قد تھا اس کا سروِ سہی سا رخ تھا شمعِ محفل سا

کوئی بِنا آہنگ کی رکھو ، مہر بہ لب ہو بیٹھے کیوں
پیچ ہوا کا یارو ایسا کیا ہے طوق و سلاسل سا

ایسی باتیں سمجھانے سے آخر ان کو سمجھا کون
شبنم تھی جب آنسو جیسی برگِ لرزاں تھا دل سا

نیلی آگ جبیں کی اس کی بجھتے بجھتے راکھ ہوئی
آئینہ سا تارا ٹوٹا تارا تھا مشتِ گِل سا

اس کے ہجر کا مدنیؔ صاحب کیا رونا لے بیٹھے ہو
تم کو کیا کیا سمجھایا تھا دیکھ کے اس پہ مائل سا

وہ ایک تسلیمِ جاں کی خُو تھی مثال سے دُور ہوگئی ہے
شبِ وفا جو گزر گئی ہے سوال سے دُور ہوگئی ہے

تری گلی تھی فریب خوردہ کسی طرف اور کیا نکلتا
لگی ہوئی حدِّ شہر لیکن خیال سے دُور ہوگئی ہے

ہمی خود اپنے سے دُور اتنے چلے گئے ہیں کہ زندگانی
یہ بات کہنے کی تھی کہ تیرے ملال سے دُور ہوگئی ہے

وہ تیرگی کیا جو آپ اپنے ہی خونِ دل سے نہ تیرہ تر ہو
وہ روشنی کیا جو آپ اپنے جمال سے دُور ہوگئی ہے

لہو جو نافہ میں مشک بنتا رہا، نہ ان گردشوں کی رَو میں
تپش جو دشتِ تتار میں تھی غزال سے دُور ہوگئی ہے

سپردگی کی وہ ایک ساعت جو اس کی آنکھوں کی نیند میں تھی
وہ جاگ اٹھا ہے تو گفتگو کی مجال سے دُور ہوگئی ہے

وہ شمعِ بالیں کے زاویوں میں جو تیرے چہرے کی ایک رَو تھی
دھواں جو دل سے اٹھا کہ خوابِ وصال سے دُور ہوگئی ہے

ہزار مسند نشینیوں میں خدا کرے صاحبی کرو تم
فلک کی گردش اگر کہیں سے زوال سے دُور ہوگئی ہے

جنوں زدہ ابر و باد میں کل جو تجھ سے پہروں ہی گفتگو تھی
وہ چھاؤں پیارے تو آپ دشت و جبال سے دُور ہوگئی ہے

بِنا محبت کی رکھنے والو! یہ رسم ہر ہاتھ کی نہیں ہے
جبھی تو یہ کج نہاد دنیا کمال سے دُور ہوگئی ہے

وہ روشنی جو فرازِ جاں پر تھی میری بیتوں کے چاند تجھ سے
یہ رہ گزر کس نشیب میں ہے کہ حال سے دُور ہوگئی ہے

نذرِ فراق

کس کو سمجھائیں کہ جی میں کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم
التفاتِ دوست کو دنیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

وقت کو اک دن طلسمِ خواب کی پہنائی میں
نیم وا در پر ترا سایہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

حسن کیفِ خود فراموشی میں تھا اور وصل کو
ذوقِ خود بینی کا اک پردہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

حسن پر اک عالمِ تنہائی کا آغاز تھا
جس کو اک تخلیق کا منشا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اک تماشا گاہِ عالم میں سرِ منصور تھا
خلق کو شائستۂ سودا سمجھ بیٹھے تھے ہم

بلبلِ خونیں کفن کا ایک پردہ تھی بہار
بوئے گل ، دستِ صبا کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اک تغیّر آشنا دنیائے خاک و باد کو
اک بنائے دیدۂ بینا سمجھ بیٹھے تھے ہم

نذرِ میر دردؔ

کل صبح تھی اُس دشت میں اب شام کہیں ہو
اِس دشت نوردی کا بھی انجام کہیں ہو

آئینِ محبّت بھی اگر عام کہیں ہو
ہم اور کہیں گردشِ ایّام کہیں ہو

نغمے پہ بِنا رکھتا ہے فریاد کی لَے کی
طائر کے لیے کش مکشِ دام کہیں ہو

عشّاق کی محفل میں ، حریفانِ جنوں میں
تسکین کی صورت ہے ترا نام کہیں ہو

اک دورِ مسافت میں کٹی عمرِ گریزاں
ایسی نہ جنوں کاریِ ایّام کہیں ہو

اب وجہِ سکوں عالمِ اسباب میں کم ہے
یہ بھی نہ کوئی عشق پہ الزام کہیں ہو

روشن ہو رخِ یار سے یا آتشِ مے سے
اک حلقۂ یاراں میں ہو وہ شام کہیں ہو

ہر رنگ میں اس جسم کا اسلوب ہے یکتا
پوشاک کوئی ہو ، وہ دل آرام کہیں ہو

ہر خوابِ نمو پرور و شاداب پہ کیا کیا
برسا ہے نمِ ابرِ سیہ فام کہیں ہو

سر رکھ کے سرِ خار مغیلاں ہی وہ مل جائے
برسوں کی گئی نیند کا آرام کہیں ہو

تم سلامت رہو ، وحشتِ جاں سے کیا کچھ ہوائے زمستاں ہی بہلائے گی
مرگِ عشاق ارزاں ہوئی بھی تو کیا ، موسمِ گل میں تازہ ہوا آئے گی

بے سبب بھی نہ تھی عرصہ گاہِ ملال ، ظلمتوں سے گزرتی ہے روحِ کمال
آتشِ نمو آخر رگِ سنگ کو نرخِ بالا کا رُخ دے کے چمکائے گی

ہم شہیدانِ زمیں کفن کے لیے چادرِ گُل کا کس نے اٹھایا سوال
منزلت دے گئی خار و خس کی ہوا کچھ نہ کچھ منزلت اور دے جائے گی

وحشت و در کی ہوا شوخ چالاک تھی اک تغیّر کا افسوں چلا کر گئی
صاحبِ سر اگر کوئی آگے بڑھے تاجِ خارِ مغیلاں اٹھا لائے گی

جس کے کوزے کے پانی سے دوزخ بجھے اور انگیٹھی کے شعلوں سے جنّت جلے
کوئی ایسا ہو گر صاحبانِ حرم ، کام اس وقت اس کی مثال آئے گی

چاک داماں سے ہے جو بہار آشکار اس پہ دورِ خزاں کا تسلّط نہیں
اک تصوّر نمو کا بھی ہے کارگر شاخِ گل آپ سینے میں لہرائے گی

تم کہو تو چلا جاؤں اس شہر سے ، اس فضا میں ہلاکت ہے جاگی ہوئی
سارے ہانکے میں بھاگے ہوئے جانور یہ ہوا یہ صدا دل کو کھا جائے گی

رات کی یہ ہوا نرم ایسی کہ بس نیند کی ایک چڑھتی ہوئی بیل میں
جاگتی آنکھ میں بھی جو کھلتے رہیں ، پھول ایسے ہزاروں کھلا جائے گی

عشق کی سادگی پر ہنسی آ گئی حسن میں اک تغیّر ہوا رُو بہ رُو
دلبری کے نئے زاویے کچھ نہ کچھ ساحری آئنوں کو دکھا جائے گی

ایک نوروزِ آغوش کی گفتگو عشوۂ نرم خُو بے سبب حیلہ جُو
عشق کی رات کے جو مراحل بھی ہوں صبح دم رُخ بدلتی چلی جائے گی

مر گیا مدنیِ خوش نوا راہ میں جانتا تھا سرِ دشت اک روشنی
اس سے پہلے کہ منزل کوئی آ سکے پاؤں سن کر کے مرگِ جنوں لائے گی

ادب وشعر میں جدید حسیّت اور عصریت کے جو نقوش ابتداً ہمیں غالب کے یہاں دکھائی دیے تھے، تاریخ و تغیر کے مختلف مراحل سے گزر کر عزیز حامد مدنی کے یہاں وہ پوری جامعیت کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ غالب کے یہاں ان عناصر کا اظہار طرزِ احساس کی سطح پر ہوا تھا۔ اب اسے مرورِ زمانہ کہیے یا کہ ذوقِ انسانی کی تقلیب، تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ حسیّت اور عصریت کے اظہار کا یہ معاملہ اب طرزِ احساس پر موقوف نہیں رہا۔ عزیز حامد مدنی تک آتے آتے اس نے ایک منضبط فکر کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ایک ایسی فکر جو فرد کے ذاتی جذبہ و احساس ہی کو نہیں، اُس کے انسانوں سے، کائنات اور خدا سے رشتے کو دیکھنے کے لیے ایک مختلف زاویہ فراہم ہی نہیں کرتی، بلکہ اس زاویے سے دیکھنے پر اصرار بھی کرتی ہے۔ اس لیے کہ دانشِ حاضر کی تجربی حقیقت، لسانی ضابطے اور حسی پیکروں کا ہم تک ابلاغ ممکن ہی اُس وقت ہے، جب ہم اس زاویے پر اُس کے رُو بہ رُو ہوتے ہیں۔

عزیز حامد مدنی کی شاعری کا سب سے اہم وصف یہ ہے کہ اس میں اُن کے عہد کی ہزار شیوہ زندگی اپنے تہذیبی، تاریخی، سیاسی، سماجی، عقلی اور سائنسی رُجحانات سے ہم آمیز نظر آتی ہے۔ اِن رُجحانات کے عقب میں تغیرات کا وہ جہانِ معانی آباد ہے جس نے عہدِ جدید اور اس کی انسانی زندگی کی صورت گری کی ہے۔ عزیز حامد مدنی کے اسلوبِ سخن کا کمال یہ ہے کہ وہ اس عہد کے تجریدی، تخریبی، لایعنی اور کھردرے انسانی تجربات کو بھی تخلیقی جمالیات سے ہم کنار کرتے ہوئے ابلاغ کی سطح پر لانے میں پوری طرح کامیاب رہتا ہے۔ اس پورے عمل میں اُن کی زبان اُسی طرح حیران کن اور فکر افروز کردار ادا کرتی ہوئی نظر آتی ہے جیسی ''ویسٹ لینڈ'' میں ایلیٹ کی یا پھر ''یولی سِسز'' میں جوئس کی۔ یہ زبان اپنی تشکیل میں قدیم کی گونج رکھتی ہے اور اپنے آہنگ میں جدید کی امیجری کو اُبھارتی چلی جاتی ہے۔ اس کے ذریعے جدید شعری لسانیات کا وہ سانچا ہمارے سامنے آتا ہے جو ایک طرف عزیز حامد مدنی کو ماقبل شعری روایت سے جوڑتے ہوئے اُن کی انفرادیت کو اُجاگر کرتا ہے اور دوسری طرف اُن کے بعد کی شاعری کو ایک ایسا لحن عطا کرتا ہے جس سے دل کشی اور عمیق معنویت کے نئے معیارات قائم ہوتے ہیں۔ یہی وہ شے ہے جو حرفِ سخن کو معجزہ بناتی ہے۔

مبین مرزا

ظفر سعید سیفی

کُلیاتِ عزیز حامد مدنی

ISBN : 978-969-540093-7